تامل ناڈو میں اردو

1824 تا 1986

علیم صبا نویدی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومت ہند
ویسٹ بلاک-I، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066
فون: 6179657, 6103381, 6103938

Tamil Nadu Men Urdu

By

Aleem Saba Navedi

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : 1998 شک 1919

پہلا ایڈیشن : 1100

قیمت : /135

سلسلہ مطبوعات : 778

ناشر : ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،

ویسٹ بلاک۔I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

طابع : جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتّب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظرِ ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

1	مقدمہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ	13
2	سخنے چند		27
3	ابتدائیہ		31
4	نئی غزل کا رجحان		33
5	نئی نظم کا سفر		35
6	جدید شاعری اور نئے تجربے		38
7	مثنوی کا فن		41
8	تنقیدی شعور کا سلسلہ		45
9	صحافتی خدمات		52
10	فن خطاطی		60
11	تصنیفات اور تالیفات کا سلسلہ		63
12	عربی مدارس میں اردو کی خدمات		68
13	افسانے کا فن		77

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر	مقام پیدائش	سن ولادت عیسوی	سن ولادت ھجری	سن وفات عیسوی	سن وفات ھجری
1	شاہ محمد صادق الحسینی چشتی القادری شریف مدراسی	86	مدرس	1824	1240	1904	1322
2	سید شاہ عبدالغفار قادری چشتی مسکین مدراسی	93	بنگلور	1833	1251	1908	1326
3	محمد عبدالرحمن صدیقی قادری مہجور مدراسی	95	مدراس	1843	1259	1913	1332
4	عاجز ترچناپلوی	97	ترچناپلی	1845	1262		
5	محمد مستعان علی بادشاہ انست مدراسی	99	مدراس	1846	1263	1929	1348
6	گنڈو شیخ عبدالقادر شاکر وانمباڑی	100	وانمباڑی	1852	1269	23·7 1923	1342
7	خطیب قادر بادشاہ، بادشاہ وانمباڑی	102	وانمباڑی	1852	1270	1923	1342
8	محمد اسمٰعیل سیٹھ مغموم	104	کچھ بمبئی	1856	1273	1929	1348
9	مولوی تجمل حسین خان ایمان گوپاموی	106	گوپامو یوپی	1860	1277	1935	1354
10	نواب عبدالرؤف خان بہادر پرتو مدراسی	109	مدراس	1865	1282	1926	1345
11	محمد عبدالقدوس ضو ویلوری	111	ویلور	1865	1282	1949	1365
12	ابو محمد فضل القیوم شریف منظور صدیقی	114	مدراس	1868	1285	1960	بمقام کراچی
13	ڈاکٹر حکیم ممتاز حسین سائل	115	مدراس	1868	1285		
13A	ڈاکٹر عبدالحق	46	کرنول	1894	1312	1958	1377

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر	مقام پیدائش	سن ولادت عیسوی	سن ولادت ھجری	سن وفات عیسوی	سن وفات ھجری
14	سید شاہ محمد صبغۃ اللہ حسینی القادری نور مدراسی	116	مدراس	1869	1286	1933	1351
15	سید سلیمان حسینی القادری اثیم ترپاتوری	118	ترپاتور	1869	1286	1949	1369
16	سید عبدالعلام علام ویلوری	120	ویلور	1870	1287		
17	فضل اللہ طاہر آمبوری	121	آمبور				
18	سعدالدین سعد مدراسی	122	مدراس	1870	1287	1949	1369
19	عبدالغفور راز ترچناپلوی	123	ترچناپلی	1870	1287	1938	1357
20	حضرت فانی ترپاتوری	124	ترپاتور	1871	1288	1959	1379
21	محمد منور حسین خان گوہر	125	مدراس	1873	1288	1942	1361
21A	مولانا سید عبدالوہاب بخاری	47	حیدرآباد	1902	1320		
22	سید شاہ محمد عبدالرحمٰن کمال آرکاٹی	127	آرکاٹ	1876	1291	1951	1370
23	نواب عبدالرحمٰن خان بہادر شاطر مدراسی	128	مدراس	1877	1294	1943	1362
24	غلام علی نائطی صاحب	131	مدراس	1878	1295	1957	1370
25	سلطان منور علی شاہ قادری منور آرکاٹی	159	آرکاٹ	1880	1281	1942	1361
26	کاکا عبدالعزیز فہیم آمبوری	132	آمبور	1881	1299	1943	1363
27	سید یعقوب صمیم آمبوری	133	آمبور				
28	محمد ابراہیم قدیر آمبوری	134	آمبور				
29	محمد عبدالمجید شرر آلندوری	135	مدراس	1884	1302	1924	1343
30	غلام عباس علی عباس مدراسی	136	مدراس	1885	1303	1968	1388

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر	مقام پیدائش	سن ولادت عیسوی	سن ولادت ھجری	سن وفات عیسوی	سن وفات ھجری
31	محمد ابوبکر نظمی	138	مدراس	1885	1303	1967	1387
32	عبدالقدوس شاداں وشارمی	139	وشارم	1886	1304	1970	1390
33	عبدالغنی شجاع مدراسی	141	مدراس	1886	1304	1961	1381
34	محمد حسین محوی صدیقی	142	لکھنؤ	1888	1306	19-11-1975	1395
35	منشی محمد فخرالدین الفت مدراسی	145	مدراس	1889	1307	1970	1390
36	محمد انصرالدین بیخود مدراسی	146	مدراس	1890	1308	1959	1379
37	مقبول آمبوری	148	آمبور	1890	1308	20-1-1958	1378
38	حکیم سید عباس آسی ترپاتوری	149	کرشنگری	1891	1309	1966	1386
39	محمد عبدالشکور بادشاہ بہادر شاکر مدراسی	154	مدراس				
40	محمد عبدالعلی آسی مدراسی	155	مدراس				
41	محمد عبدالکریم ساغر مدراسی	156	مدراس			1951	1371
42	محمد عزیزالدین روحی آمبوری	157	سانگڑہ	1892	1310	1949	1369
43	غلام حسین دلیل مدورائے	160	مدورے	1894	1312	1975	1395
44	ضیاءالدین امانی پلی گنڈوی	165	پلی گنڈہ	1895	1313	1966	1386
45	غضنفر حسین شاکر نائطی	167	مینمبور	1899	1317	1967	1387
46	ڈاکٹر محمد عبداللہ ذوقی	187	بنگلور	1899	1317	1990	1410
47	سید ابوالبرکات انور	188	مدراس	1900	1319	1976	1397
48	غلام محی الدین اختر	189	مدراس	1905	1323		
49	سید احمد گلاب مدراسی	192	ویلور	1906	1324	1980	1400
50	سید محمد قاسم ویلوری	193	ویلور				
51	عبدالسلام کمالی ویلوری	194	ویلور	1906	1324	1995	1416
52	نثار علی نثار نگری	195	نگرم A.P	1908	1326	1977	1398
52A	جناب ایس ایم فاضل صاحب	54				1960	1380

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر	مقام پیدائش	سن ولادت عیسوی	سن ولادت ہجری	سن وفات عیسوی	سن وفات ہجری
53	رحیم احمد فاروقی آزاد	196	مدراس	1908	1326	1966	1386
54	عبدالعزیز عادل مدراسی	224	مدراس	1909	1327	مدراس میں بقید حیات	
55	حیدر علی خاں حیدر	226	مدراس	1910	1328	1980	1401
56	عبدالباری جاوی	228	وانمباڑی	1910	1328	1972	1392
57	محمد ابراہیم آثم کرنولی	228	کرنول A.P	1910	1328	1974	1394
58	عبداللہ حسین عبد مدراسی	231	مدراس	1910	1328	1980	1401
59	شاہ غلام احمد حیرت القادری	232	حیدرآباد	1911	1328	1978	1399
60	حبیب خاں سروش داؤدی عمری	233	ترپاتور	1912	1331	1964	1384
61	محمد عبداللہ شرقی	236	مدراس	1912	1331	31-8 1988	1409
62	ہلال جہاں گیر	300	مدراس	1912	1331	حیدرآباد میں بقید حیات ہیں	
63	کاکا عبدالواحد عظیم آمبوری	237	آمبور	1913	1332	1968	1387
64	نواب محمد محمود	238	مدراس	1913	1332	18-1 1978	1399
65	شیخ فریدالدین فرید مدراسی	239	مدراس	1916	1335	1981	1401
66	محمد یوسف کوکن	48	مینمبور	14-11 1916	1335	1990	1411
67	سید درویش محی الدین ابوالخیر واقف القادری ہاشمی	240	ترپاتور	1916	1335		
68	سید عبدالقادر نویدی	241	کوئمبتور	1917	1336	کوئمبتور میں بقید حیات ہیں	
69	میر نذر حسن سحبان مدراسی	242	مدراس	1919	1338	1984	1404
70	محمد جلال کڑپوی	244	کڑپہ A.P	1919	1338	1989	1307
71	محمد نور اللہ اسرار	245	وانمباڑی	1333	1914	1989	1410
72	سید عظمت اللہ سرمدی	245	کوئمبتور	19-7 1919	1338	1978	1399
73	عبدالرحمن تشنہ	248	ترپاتور	1923	1342	1971	1391
74	سلطان وزیر	248	مدراس	1920	1339	1973	1393
74 A	پروفیسر اے۔ آر۔ عباس	48	کڑپہ A.P	1922	1341	1983	1403

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر	مقام پیدائش	سن ولادت عیسوی	سن ولادت ہجری	سن وفات عیسوی	سن وفات ہجری
75	بانگی عبدالقادر دانش فرازی	249	آمبور	1921	1340	1981	1402
76	عبدالرؤف رازی آمبوری	264	آمبور	1921	1340	23-5 1975	1395
77	محبوب پاشا محبوب	265	مدراس	1922	1341	مدراس میں بقید حیات ہیں	
78	ابوتراب محمد عبدالحلیم قدسی	266	پرنام بٹ	1992	1413	1982	1403
79	محمد بشیر احمد قابل	267	وانمباڑی	1917	1336		
80	محمد یوسف خان خواہاں	268	مدراس	22-12 1922	1341	مدراس میں بقید حیات ہیں	
81	حکیم مخدوم اشرف	270	مدراس	23-2 1923	1342	وانمباڑی میں بقید حیات ہیں	
82	اسداللہ بیگ ادیب بھارتی	271	مدراس	1923	1342	1971	1391
83	رفیع الدین اوج کرشنگری	274	کرشنگری	1924	1343	1975	1395
84	شیخ داؤد فانی ترچناپلوی	275	ترچناپلی			1959	1379
85	رشیدالدین امجد مدراسی	279	مدراس	15-8 1924	1344	26-5 1981	1401
86	عبدالرحمن خاں ابوالبیان حماد	280	مالور بنگلور	1924	1343	عمرآباد میں بقید حیات ہیں	
87	مولانا اسمٰعیل رفیعی خواجہ قدسی	281	پرنمبٹ	25-11 1925	1344	پرنمبٹ میں بقید حیات ہیں	
87A	ملک ضیاء	333	وانمباڑی	1928	1347	1991	1412
88	مولانا محمد اسمٰعیل نیر ربانی	303	میل وشارم	1925	1344		
89	مولانا محمد جعفر حسین فیضی صدیقی	301	مدراس	4-1 1925	1344	ویلور میں بقید حیات ہیں	
90	محمد کمال الدین اکبر کمال مدراسی	305	مدراس	1925	1344	1991	1412
91	سید سعداللہ ممتاز مدراسی	306	مدراس	1926	1345	پاکستان میں بقید حیات ہیں	
92	عبدالرؤف نیاز	307	وانمباڑی	1926	1345	مدراس میں بقید حیات ہیں	
93	عبدالحمید حامد باقوی	308	گڑیاتم	1926	1345	گڑیاتم میں بقید حیات ہیں	
94	بدرالحسن بدر جمالی	309	ویلور	12-7 1926	1345	مدراس میں بقید حیات ہیں	
95	عبدالصمد تمنا یوسفی	311	آمبور	1926	1345	آمبور میں بقید حیات ہیں	
96	عزیزالرحمن عزیز تمنائی	312	ولتور	19-1 1926	1345	مدراس میں بقید حیات ہیں	
96 A	مولانا بشیرالحق قریشی	50	ادھونی				

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر	مقام پیدائش	سن ولادت عیسوی	سن ولادت ہجری	سن وفات عیسوی	سن وفات ہجری
97	نثار بھارتی	319	وانمباڑی	1926	1345	مدراس میں بقید حیات ہیں	
98	سید عثمان فہمی عمری	321	ترپاتور	1926	1345	کرشنگری میں بقید حیات ہیں	
99	محمد محی الدین علی راجی صدیقی	322	مدراس	25-11 1927	1346	1989	1410
100	وے پا عبدالرزاق پاشا کاوش بدری	324	آمبور	1927	1346	آمبور میں بقید حیات ہیں	
101	سید محی الدین اجمل سعیدی	329	مدراس	1927	1346	1985	1406
102	مولانا نثار احمد فدوی باقوی	330	ویلور	1928	1347	1993	1414
103	عبدالغفار فوقی نائطی	334	مینمبور	1928	1347	مدراس میں بقید حیات ہیں	
104	سید قاسم نورس خیامی	335	مدراس	1929	1348	مدراس میں بقید حیات ہیں	
105	مولانا سید عبدالجبار ناصر باقوی	337	آندھرا پردیش	1-7 1929	1348	ویلور میں بقید حیات ہیں	
106	سید ظہیر قلندر حسرت سہروردی	338	ترچناپلی	1930	1349	ترچناپلی میں بقید حیات ہیں	
107	عبدالرزاق حافظ باقوی	340	رانی چونی	1930	1349	مدراس میں بقید حیات ہیں	
108	اسماعیل بیگ اصغر ویلوری	342	ویلور	1931	1350	مدراس میں بقید حیات ہیں	
109	پیر نم عبدالرشید ساحل رشید	343	وانمباڑی	1931	1350	10-9 1980	1401
110	سید منیر احمد منیر رشیدی	346	کرشنگری	1932	1351	کرشنگری میں بقید حیات ہیں	
111	سید رحمت اللہ فرحت کیفی	347	مدراس	21-11 1933	1352	1979	1400
112	محمد محی الدین عارف مدراسی	276	مدراس	15-3 1934	1353	1967	1387
113	شیخ احمد علی اعجاز شاکری	355	مدراس	1934	1353	مدراس میں بقید حیات ہیں	
114	سید مسعود الحسن ظہیر جعفری	356	مدراس	1934	1353	مدراس میں بقید حیات ہیں	
115	خطیب محمد حیدر حسین راز امتیاز	358	مدراس	4-1 1934	1353	بنگلور میں بقید حیات ہیں	
116	علی اکبر آمبوری	79	آمبور	1934	1353	مدراس میں بقید حیات ہیں	
117	محمد جلال الدین جلال مدنی	369	مدورائے	1935	1354	سیلم میں بقید حیات ہیں	
118	ظہیر حسین سالک نائطی	371	عمرآباد	1936	1355	ترپاتور میں بقید حیات	
119	محمد اقبال حسین رمز	372	مدراس	9-9 1936	1355	مدراس میں بقید حیات	
120	محمد عبداللہ حسین حیات مدراسی	373	مدراس	1937	1356	مدراس میں بقید حیات	

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر	مقام پیدائش	سنِ ولادت		سنِ وفات	
				عیسوی	ہجری	عیسوی	ہجری
121	ایم اے رشید، رشید مدراسی	79	مدراس	1937	1356	1987	1407
122	سید محمد حیات، ایس ایم حیات	80	مدراس	10-1 1937	1356	1987	1407
123	سید صفی اللہ عابد صفی	81	مدراس	11-7 1938	1357	مدراس میں بقید حیات	
124	کاظم حسین شاکر، کاظم نائطی	374	عمرآباد	14-11 1938	1357	〃 〃	〃 〃
125	ڈاکٹر نجم الہدیٰ	376	بہار	1938	1357	〃 〃	〃 〃
126	سید نعیم الرحمٰن آذر بیابانی	379	نیلور	1939	1358	1995	1416
127	مولانا اشرف سعودی	381	ویلور	1940	1359	بنگلور میں بقید حیات	
128	میر حسن علی حسن فیاض	383	مدراس	23-7 1941	1360	مدراس میں بقید حیات	
129	سید علیم الدین علیم صبا نویدی	428	امور	10-2 1942	1361	〃 〃	〃 〃
130	سید جلال عرفان	50		12-8 1946	1361	وانمباڑی میں بقید حیات	
131	محمد شبیر احمد سہیل راشد	384	وانمباڑی	15-1 1943	1362	پرنام بٹ میں بقید حیات	
132	محمد فیاض حسین	84	وانمباڑی	9-8 1943	1362	مدراس میں بقید حیات	
133	حبیب اللہ شاہ مدراسی	385	مدراس	19-11 1943	1362	〃 〃	〃 〃
134	غیاث اقبال	84/	وانمباڑی	1944	1364	1992	1413
135	صلاح الدین برق	82	مدراس	11-7 1944	1364	〃 〃	〃 〃
136	محمد فضل الدین فضل جاوید	81	مدراس	1-6 1945	1365	〃 〃	〃 〃
137	محمد یعقوب اسلم	386	الگایم	18-7 1945	1365	وانمباڑی میں بقید حیات	
138	سید پیر رضا علی ضمیر عرفان آستانوی	389	گڑیاتم	1948	1368	1989	1410
139	مولانا ظہیر احمد راہی فدائی	390	کڑپہ	1949	1369	ویلور میں بقید حیات	
140	سید اکبر پاشا اکبر زاہد	392	وانمباڑی	1952	1371	وانمباڑی میں بقید حیات	
141	مظفر علی مظفر شہہ میری	393	کڑپہ	1953	1372	〃 〃	〃 〃
142	سراج زیبائی	394	وانمباڑی	1955	1375	〃 〃	〃 〃
143	انور کمال	84	وانمباڑی	1956	1376	〃 〃	〃 〃
144	محمد جسیم الدین خالد	395	سمستی پور بہار	1967		مدراس میں بقید حیات	

پس نوشت

نمبر شمار	اسمائے گرامی	سن ولادت	سن وفات	صفحہ نمبر
145	گوہر دیلوری	1844ء	1893ء	396
146	مولوی محمد اعظم گھتالہ	1844ء		397
147	مولوی رفیع الدین عرفی	1850ء	1901ء	398
148	خطیب عبدالرحمٰن خطیب	1865ء		398
149	حکیم صفدر حسین شہباز	1871ء		399
150	عبدالرحیم مسرور	1880ء		399
151	مفتی حبیب اللہ ندوی	1886ء	1971ء	399
152	عبدالرحیم ماہر	1892ء		400
153	عبدالرحیم ظاہر	1892ء		400
154	سید ظہور اللہ شاہ نادر	1898ء		401
155	محمد عبدالرحمٰن رفیق	1898ء		402
156	محمد تاج الدین تاج	1920ء		402
157	مولوی علی فطرت	1924ء	1997ء	403
158	سید محمود عمر آمر کلیمی	1927ء		403
159	محمد فاروق فرحت	1931ء	1977ء	404
160	وحید اشرف	1935ء		405
161	تسنجر مدراسی	1920ء		407
162	عبدالرحمٰن صبا	1935ء		408
163	مظہر اقبال	1939ء	1988ء	408
164	سید شاہ پیر حسینی عارف	1940ء		409
165	لطف اللہ عدیل	1916ء		49
166	نعیم المشرقی	1920ء		419
167	نادر ظہیر	1926ء		419
168	حبیب اللہ باشاہ			49
169	ڈاکٹر ذاکرہ غوث	1921ء		49

نمبر شمار	اسمائے گرامی	سن ولادت	سن وفات	صفحہ نمبر
170	عبداللہ باشاہ راز	1942ء	1984	409
171	سید کمال باشاہ کمال راہی	1943ء		40
172	نعیمہ پرویز	1944ء		410
173	نور آفاق	1944ء		410
174	سید جمیل الدین جمیل قادری	1948ء		411
175	نواب بشیر النساء حیا		1961ء	412
176	محمد حسین جمیل	1912ء	1996ء	413
177	برکتر مدراسی	1924ء		414
178	ڈاکٹر حکیم افسر باشا	1941ء		51
179	محمد مصباح اللہ	1932ء		51
180	شریف رومانی	1932ء		
181	پی۔ نثار احمد	1950ء		51
182	خطیب نعمت اللہ نعمت			415
183	ظہیر آفاق	1939ء		416
184	محمد سعد الدین فرحت صمدانی	1944ء		416
185	اشفاق الرحمٰن مظہر	1949ء		416
186	سید سجاد حسین	1956ء		417
187	سید سجاد بخاری	1951ء		417
188	عبداللطیف نازی	1930ء		420
189	عبدالوہاب نازش	1949ء		420
190	امان اللہ امان	1949ء		421
191	ملک العزیز	1951ء		421
192	ڈاکٹر اعجاز حسین			421
193	شاہد مدراسی	1963ء		421
194	شبیب احمد کاف	1955ء	1991	424

پس نوشت

نمبر شمار	اسمائے گرامی	سن ولادت	سن وفات	صفحہ نمبر	نمبر شمار	اسمائے گرامی	سن ولادت	سن وفات	صفحہ نمبر
195	سید سلطان محی الدین یمنی			422	205	سید فضل اللہ	1935ء		425
196	وکیل محمود شریف	1928ء		422	206	سید عثمان پاشاہ قادری	1956ء		425
197	ڈاکٹر ص نذیر محمد			422	207	عبدالصمد			425
198	ریاض نلوری			423	208	حیات افتخار			425
199	شریف برکاتی	1930ء		423	209	احمد ندیم	1956ء		426
200	حاجی عبیداللہ	1929ء		423	210	رضاالحق آمری	1960ء		426
201	محمد علی حسین	1930ء		424	211	قاضی حبیب احمد	1963ء		426
202	محمد روح اللہ			424	212	علیم صبا نویدی	1942ء		426
203	لقا رضوی			424					
204	قاضی صلاح الدین ایوبی	1942ء		425					

اعتذار

پس نوشت میں سن ولادت کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا

★ ★ ★ ★

مقدمہ

ڈاکٹر نجم الہدیٰ
پروفیسر وصدر شعبہ اردو و فارسی وعربی
مدراس یونیورسٹی ۔ مدراس

ادبی دنیا میں اکثر یہ سوال موضوع بحث بنا ہے کہ آیا تخلیقی فن کار کو اپنی تخلیقی مساعی کے مختلف النوع میدانوں کے انتخاب میں یکسو ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں مختلف اور متضاد خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری اور شاعری میں بنیادی ترجیح کس کو حاصل ہے اس پر بحثیں ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے' ان کا ایک ناول "حسرت تعمیر" اور ایک ڈراما "شہنشاہ حبش" بھی زیور طبع سے آراستہ ہوئے بحیثیت شاعر بھی ان کا کلام مختلف انتخابی مجموعوں اور رسائل وجرائد میں محفوظ ہے۔ (ناقد اور محقق کی حیثیتیں یہاں زیر بحث نہیں ہیں) یہی سوال ڈاکٹر اختر اورینوی کی حیات میں بھی موضوع بحث تھا کہ شاعری، ڈراما، ناول اور افسانہ نگاری کے مختلف میدانوں میں ان کا حقیقی میدان کون سا ہے۔

برادرم علیم صبا نویدی بھی اپنے ادبی مشاغل میں کثیر الجہت واقع ہوتے ہیں۔ یہاں ان کے ادبی مشاغل کے تخلیقی اور غیر تخلیقی دونوں زمروں کو اگر شمار کیا جائے تو میدان اور وسیع ہو جاتا ہے۔ کیا علیم کی ادبی کثیر الجہتی ان کے ادبی مقام ومرتبہ کے تعین میں مانع ہے؟ کیا فن کارانہ تشخص کے لئے اختصاص لازمی ہے؟ آج بھی ایسے سوالوں کے جوابات قطعیت کے ساتھ نہیں دیئے جا سکتے لیکن علیم کے متعلق ایک

بات بہت صاف اور واضح ہے کہ وہ ادبی اصناف (نثر و شعر) میں ترک و انتخاب کے بعد ہی کسی ایک یا دو اصناف سے اپنے ہنگامی عشق کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا عشق بیک وقت غالباً دو اصناف ادب سے زیادہ کو منہ نہیں لگاتا۔ میں نے اپنی تالیف "آسمان فن کا سفیر" میں علیم صبا نویدی کے فکر و فن پر اردو کے مشاہیر اہل قلم کے اظہار خیالات کا انتخابی مجموعہ مرتب کرتے ہوئے اس پر جو طویل مقدمہ لکھا ہے اس میں کہیں اس طرح کا خیال ظاہر کیا ہے۔ (میری اپنی مطبوعہ تحریر اس وقت خود میرے پیش نظر نہیں ہے) کہ علیم شاید اردو کی مختلف اداؤں کے مشاہدے میں گم رہتے ہیں، اگر آج وہ اس کی دل کشی کے کسی ایک پہلو پر فریفتہ ہیں تو نہیں کہا جاسکتا کہ کل وہ اس کی کون سی ادا پر مرمٹیں گے۔ ان کا ذہن ہر وقت تخلیقی منصوبہ بندی کے مختلف مراحل سے معمور رہا ہے اور جب وہ اپنے عشق کے ارتکاز کا نیا نقطہ تلاش کر کے تخلیقی کاروبار شروع کر دیتے ہیں تو دنیا کو ان کے نئے عشق کا پتہ چل جاتا ہے یہ انتخاب ایک طرح کی یکسوئی ہے اور علیم کی تخلیقی سرگرمیوں کے لئے بہت نافع

علیم صبا نویدی کے متعلق میں نے "آسمان فن کا سفیر" کے مقدمے میں غالباً ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ علیم دوسرے اہل قلم سے اس جہت سے ممیز ہیں کہ وہ تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسب معاش اور گھریلو ذمہ داریوں سے بقدر کفاف عہدہ برآ ہوتے ہوئے وہ لکھنے پڑھنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام مشکل ہی سے کرتے ہیں۔ قرطاس و قلم ہی علیم کے لئے تفریح و تفننِ طبع کا ذریعہ بھی ہے اور تفکر و تفلسف کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے کا وسیلہ بھی مدراس کے سوادِ شہر سے ملحقہ بحرِ ناپیدا کنار (بصورت خلیج بنگال) کے ساحل پر جو خود قلبِ شہر میں ہے سرِ شام جب سمندر کی موجوں سے لطف اٹھانے والے وہاں نظارہ کناں ہوتے ہیں علیم اس وقت اپنے وجدان و شعور کی موجوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے پاس وقت ہی وقت ہے جبکہ مجھ جیسے شخص کو اپنے تدریسی، تحقیقی اور منصبی فرائض کی ادائیگی کے بعد اتنا وقت بھی بمشکل ملتا ہے کہ اس کتاب کا یہ مقدمہ جو پیش نظر ہے سپرد قلم کر سکے۔ مجھے ان کی فرصت کی فراوانی پر رشک آتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

علیم کی ادبی سرگرمیاں متنوع ہیں۔ وہ پہلے تخلیق کار ہیں، پھر کچھ اور لیکن غیر تخلیقی زمرے سے ان کی وابستگی بھی اب "عیاں را چہ بیاں" کے مصداق ہوگئی ہے۔ دوسروں کے مضامین کا انتخاب کسی ادبی جہت کے پیش نظر ایک علمی کام ہے، تخلیقی نہ سہی، مرتب فن کار نہیں ہوتا، لیکن اس کی خدمت علمی و ادبی نوعیت کی تو ہے۔ علیم نے یہ خدمت بھی انجام دی ہے۔ انھوں نے آزاد غزل پر منتخب مضامین کا مجموعہ مرتب کر کے "شناخت کی حدوں میں۔ آزاد غزل" کے عنوان سے 1983ء میں شائع کرایا اس سے پہلے 1982ء میں وہ آزاد غزلوں کا انتخاب "قید شکن" کے نام سے مرتب کر کے شائع کرا چکے تھے۔ اب ہائی کو کا انتخاب "نئی پہچان" کے نام سے زیر طبع ہے۔ ان سب سے پرے، ان سب میں نمایاں اور ممتاز کام علیم کا یہ تذکرہ ہے جو آپ کے پیش نظر ہے۔ اس سے علیم صبا نویدی کی "پہچان" کی نئی جہت ابھرتی ہے۔ یہ ان کے تعارف اور ان کی نہفتہ لیاقت کا ایسا گوشہ ہے جو ہنوز ہمارے سامنے نہیں آیا تھا۔

ادبی تاریخ کی تدوین خاصا دقیق کام ہے، اس میں دقت نظر کے ساتھ ساتھ مطالعے کی وسعت اور محقق کی صلاحیت مطلوب ہے۔ اس کام کے لئے شرائط کی فہرست اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ذوق سلیم اور سخن سنجی کا ملکہ بھی اس کے لوازم میں داخل ہیں۔ تاریخ نویسی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ادبی تاریخ نویسی اپنی جگہ مہتم بالشان کارنامہ ہے اردو ادب کی تاریخ اب تذکروں کے دور سے آگے بڑھ کر وقیع اور قابل قدر کتابوں کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔ لیکن ایسی مکمل اور جامع و مانع کتاب ہنوز سامنے نہیں آئی جسے اس نوع کی کوششوں میں حرف آخر کہہ سکیں۔ ادبی تاریخ کے کچھ نہ کچھ گوشے ہر تصنیف و تالیف کی روشنی سے محروم رہ جاتے ہیں، ہر جگہ تحقیق کی کمی، صحیح ماخذ تک عدم رسائی اور مخلصانہ کوششوں کے باوجود مواد کی عدم دستیابی سے نقائص کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ادبی تاریخ نویسی کی ضرورت اردو میں اب نہیں ہے۔

تاریخ چاہے پورے ملک کی ہو یا ساری دنیا کی یا کسی ایک علاقے کی، بہرطور وہ انسانی تہذیب کا عرفان حاصل کرنے کی ایک سعیٔ مستحسن ہے۔ ادبی تاریخ کو بھی ہم جتنی وسعت دینا چاہیں دے سکتے ہیں، لیکن زبان و ادب کی ہمہ گیری یا روز افزوں بین الاقوامی

مقبولیت کے باوجود اس کے ارتقا کے متعدد مراکز میں خواہ وہ بظاہر کتنے ہی غیر اہم کیوں نہ ہوں، زبان و ادب کی صورت گری کو قریب سے دیکھنے کے لئے خردبین مطالعے کی ضرورت ہے اور اسی لئے علاقائی جائزے کا جواز بہر صورت نکل آتا ہے۔

تذکرہ تاریخ نویسی کے کام آتا ہے۔ یہ مواد کی فراہمی کا مرحلہ ہے اور اس راہ کی منزلوں میں منزل اولین ہے۔ تاریخ لکھنا اس سے آگے کا کام ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو ادب و شعر کی دنیا میں تذکرے تاریخوں کے پیش رو نکلے۔ لیکن یہ تذکرے بھی ارتقائی مراحل سے گزرے ہیں۔ شاعروں کے مجمل حالات کی کھتونی اور شعروں کے انتخاب سے آگے بڑھ کر شعری دنیا کے متعلقہ واقعات پر روشنی اور حالات و اسباب کا تجزیہ بھی ملنے لگا "نکات الشعرا" سے "آب حیات" اور "خم خانۂ جاوید" اور "شعر الہند" تک تذکرہ نویسی کے مختلف النوع نمونے ملتے ہیں۔ زبان کے آغاز و ارتقا کو سمجھنے کی جو کوشش "آب حیات" میں ملتی ہے وہ لسانیات کی موجودہ معلومات کی روشنی میں لاطائل سہی لیکن اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہمارے تذکرہ نگار اعداد و شمار کی فراہمی کو کافی نہیں سمجھتے اب افہام و تفہیم کا شعور پہلے سے زیادہ پختہ ہے، حالات و واقعات کو سمجھنے کے لئے تنقیدی بصیرت کی اہمیت اب واضح ہو چکی ہے، یہ بصیرت ابھی صحیح معنوں میں بصیرت نہیں بن سکی ہے، لیکن آرزوئے دید سے چشم فطرت کے وا ہونے کے امکانات ہویدا ہیں۔ تاریخی شعور، ادوار کا تعین ارتقائی صورت حال کا احساس اور نقد و نظر — یہ سب تذکروں میں راہ پانے لگے۔ تذکرے تاریخ کے دور میں داخل ہوئے۔ پھر تاریخ ادب اردو پر کتابیں وجود میں آئیں رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب (اور اس کے اردو ترجمے) سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی ہنوز تشنۂ تکمیل تاریخ تک اردو ادب کی تاریخ جزوی یا مکمل صورت میں کئی بار لکھی جا چکی ہے اور ہنوز "نقش دگر طراز دہ" اور "صورت پختہ تر بیا" کی آواز گونجتی سنائی دیتی ہے۔ ایسی صورت میں ملک کے انتہائی جنوبی (جنوب جنوب مشرق کے) علاقے کی ادبی تاریخ کے لئے خامہ فرسائی اپنی جگہ انتہائی اہم کام ہے اور پورے ملک کی ادبی تاریخ کے جو گوشے خالی رہ گئے ہیں ان کی خانہ پری کی ایک مستحسن کوشش ہے۔

علیم صبا نویدی نے تمل ناڈو کے شعرا کا یہ تذکرہ لکھ کر بڑا اہم کام کیا ہے،

اس میں شک نہیں۔ یہ تذکرہ زمانی اعتبار سے 1824ء تا 1986ء پر مشتمل ہے۔ ہر چند اس کتاب کا نام "تذکرہ شعرائے تمل ناڈو" ہے اور یہ صحیح ہے کہ شعرا کا ہی تذکرہ اس کتاب کے جزو اعظم کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن یہ اردو نثر کی تاریخ سے خالی نہیں ہے اور خاص طور پر اس کے جو ابواب محاکمے کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں ادبی ارتقا کی وسعت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ تمہیدی باب "سخنے چند" کے علاوہ "تنقیدی شعور کا سلسلہ"، "صحافتی خدمات"، "فن خطاطی"، "تصنیفات اور تالیفات کا سلسلہ" اور "افسانے کا فن" وہ ابواب ہیں جو بظاہر کتاب کے نام کے دائرے سے باہر ہیں، لیکن ان کی شمولیت سے تمل ناڈو کی وسیع تر ادبی تاریخ کے لئے خام مواد فراہم ہو جاتا ہے اور ان ابواب سے تذکرہ نگار کی ناقدانہ کوششوں کا علم بھی ہوتا ہے جو تذکرہ و تاریخ کے لئے فی زمانہ ناگزیر ہے۔ آج ادب کی کوئی بھی تاریخ ناقدانہ شعور کے بغیر معتبر نہیں سمجھی جائے گی۔ ہر چند علیم نے اپنی اس کتاب کو تذکرہ ہی رہنے دیا ہے تاریخ بنا کر پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کیا، لیکن یہ تذکرہ ترقی یافتہ عہد کا تذکرہ کہا جائے گا جس میں اسباب و علل کا تجزیہ اپنے طور پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ کوشش ایک ایسے فرد کی انفرادی کوشش ہے جو تخلیقی فن کار تو ہے، مگر ابھی نقد و نظر کی دنیا سے دور دور کا تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے ان تنقیدی کاوشوں میں پختگی کی جستجو نہیں کی جانی چاہیئے۔ اس کے علاوہ کسی فرد کا انفرادی نقطۂ نظر ضروری نہیں کہ صحیح واقعات کے تناظر میں اصابت فکر پر مبنی ہو۔

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ملک کی جو ریاست آج تمل ناڈو کے نام سے موسوم ہے، اس علاقے میں اردو شعر و ادب کا ارتقا اپنی جداگانہ شان اور تاریخ رکھتا ہے۔ اس کا رقبہ کبھی وسیع تر تھا اور صوبہ مدراس کے نام سے اس کی حدوں میں وہ مقامات بھی شامل تھے جو اب اس سے علاحدہ ہو گئے ہیں اور جب اس کا نام صوبہ کرناٹک تھا (اور یہ کرناٹک موجودہ ریاست کرناٹکا سے مختلف تھا) تو اس کی حدیں اور زیادہ وسیع تھیں۔ لیکن مرور ایام نے اس کی جغرافیائی حدوں میں تخفیف کر دی (وہ علاقے اب آندھرا میں شامل ہیں) اور اب جو کچھ بھی تمل ناڈو میں شامل ہے وہ بھی اردو ادب کی تاریخ پڑھنے اور لکھنے والوں کی توجہ چاہتا ہے۔ اس کا یہ مطلب

نہیں کہ اس علاقے کی ادبی تاریخ پر کبھی کچھ لکھا ہی نہیں گیا خود علیم کے اس تذکرے کی کتابیات میں بہت سی ایسی تاریخوں اور تذکروں کے نام ہیں جن میں تمل ناڈو کے شاعروں کے حالات پائے جاتے ہیں۔ عبدالجبار ملکاپوری کا تذکرہ شعرائے دکن اور منور خاں گوہر کے تذکرے، سخنوران بلند فکر کے حوالے تو خود ان متعدد دیگر حوالوں کے ساتھ پیش نظر تذکرے کی کتابیات میں موجود ہیں اس کے مولف علیم صبا نویدی نے فارسی میں لکھے ہوئے اور اس علاقے کے بیشتر فارسی شاعروں کے حالات پر مشتمل تذکروں "اشارات بینش"، "گلزار اعظم" اور "صبح وطن" کو داخل کتابیات کیا ہے تو تذکرہ گلدستہ کرناٹک" کا اضافہ بھی اس فہرست میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سارے ماخذ اسی علاقے کی شعری تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ ان سب کے مصنفین یہیں کے لوگ ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے علیم کو شکایت ہے کہ شمال کے لوگوں نے اس علاقے کی ادبی تاریخ کو اپنی تصانیف میں وہ اہمیت نہیں دی جس کی یہ مستحق ہے۔

علاقائی عصبیت کی شکایت ہماری قدیم روایت بن چکی ہے ہر علاقے کو دوسرے علاقے سے شکایت ہے کہ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو دوسری جگہ اعتبار نظر حاصل نہیں ہو سکا۔ بات صرف جنوب کے لوگوں کو نظر انداز کرنے کی ہوتی تو معاملہ کچھ اور ہوتا۔ ملک کے طول وعرض کی واحد ادبی اور تہذیبی زبان اردو ہے اور یہ حقیقت ہندی کے چالیس سالہ اقتدار کے باوجود تبدیل نہیں ہو سکی، اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کے اس پھیلے ہوتے ملک گیر دائرہ اثر ورسوخ میں کہیں یہ مادری زبان کے طور پر ہے اور کہیں صرف ادبی اور تہذیبی زبان کے طور پر اور کہیں کہیں یہ مادری زبان کے طور پر بھی علاقائی زبانوں کے حصار میں رہ کر ان کے زیر اثر ڈھانچے میں قدرے تبدیلی کے ساتھ اور معیار اور روزمرہ ومحاورہ میں بھی تبدیلیوں کے ساتھ رائج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ارباب قلم جن کی مادری زبان معیاری اردو ہے، ان علاقوں کی تصانیف پر توجہ نہیں دیتے جہاں بول چال کی اردو ان کے نزدیک غیر معیاری ہے، حالانکہ وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ آخر ان تصانیف میں تو زبان کا وہ معیار موجود ہے جو ان کا بھی مطمح نظر ہے یہ صورت حال چند مرکزی جگہوں کو چھوڑ کر ملک بھر میں پائی جاتی ہے

علیم صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جنوب ہی پر موقوف نہیں ملک کے مشرقی حصے کو بھی یہی شکایت ہے اور انتہائی شمالی اور مغربی حصۂ ملک میں بھی یہی احساس پایا جاتا ہے کہ ان کی دیرینہ اور قدیم اردو خدمات پر تاریخ ادب اور تنقید لکھنے والوں کی نظر نہیں جاتی۔ بات صرف معاصر ادب کی ہو تو غالباً کسی کو کسی سے شکایت نہیں ہوگی آخر علیم بھی تو جنوبی ہند کے شاعر ہیں پھر ان سے بے اعتنائی کوئی کہاں برتتا ہے۔ شمالی ہند کے لوگوں نے جتنا ان پر لکھا ہے، شاید جنوب کے کسی شخص نے ہنوز نہیں لکھا۔ میری تالیف "آسمان فن کا سفیر" میرے اس دعوے پر شاہد ہے جس میں علیم کے فن پر مشاہیر اردو کے خیالات کا تحریری اظہار جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں پاکستان کے بھی بعض اہل قلم نظر آتے ہیں اور ہندستان کے شمال و جنوب سے تعلق رکھنے والے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ آپ انگلیوں پر شمار کر کے دیکھ لیجئے شمال سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد زیادہ نکلے گی۔

علیم صاحب نے "تصنیفات اور تالیفات کا سلسلہ" کے عنوان سے جو باب قلمبند کیا ہے، اس میں شمال و جنوب کی فرضی تقسیم کو ملحوظ رکھ کر بڑے درد و کرب کے ساتھ تلخ نوائی سے کام لیا ہے۔ مجھے ان کے درد و کرب کا احساس ہے اور میں ان کا ہم نوا اسی حد تک ہوں کہ بلاشبہ ادبی دنیا اور بالخصوص اردو کی ادبی دنیا میں تعصب، تنگ نظری اور جانبداری پائی جاتی ہے اور کبھی کبھی اس جانبداری میں علاقائی گروہ بندی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ یہاں تو عام طور پر ہر شخص دوسرے کو نظر انداز کرنے اور چھوٹا اور کم تر سمجھنے کی قسم کھائے بیٹھا ہے۔ مگر خاص خاص لوگ مستثنیٰ بھی تو ہیں۔ علیم صاحب نے شمال کے لوگوں کو برا کہتے ہوئے ان مستثنیات کو فراموش کر دیا ہے۔ خود جنوب میں علیم کے فن سے حسد رکھنے والے اور ان کے ادبی قد و قامت کو گھٹانے والے 'زبان ہی سے سہی' اتنے ہیں کہ ہم انگلیوں پر شمار نہیں کر سکتے۔ شاید اس اعتبار سے شمال علیم صبا نویدی کے لئے اتنا متعصب نہیں ہے۔ رہی بات مطلق تعصب کی تو اس میں علاقائی تخصیص نہیں ہے۔ ہاں البتہ جیسا میں نے پہلے عرض کیا ہے قدیم ادب کی حد تک لاعلمی اور لاعلمی کی بنا پر لاپروائی ضرور ملتی ہے۔ اس میں علاقائی عصبیت بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے، مثلاً یہ کہ فلاں علاقے میں اردو ادب کی تاریخ کا

سراغ کہاں ملے گا اور اگر کچھ کہنے اور لکھنے کے شواہد ملتے بھی ہیں تو اس علاقے کے لوگوں کی بول چال کی زبان کیسی ہے، بس اسی کو بہانہ بنا کر چشم پوشی کا جواز فراہم کر لیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک میں نے صورت حال کا تجزیہ کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس میں مطالعے کی کمی اور لاعلمی زیادہ اور عصبیت اور نفرت کم۔ مثال کے طور پر اگر محمد حسین آزاد کے "آبِ حیات" میں ولی دکنی اردو شاعری کا باوا آدم کہہ کر کئی سو سال کی قدیم تر اردو شاعری کو جو دلی سے پہلے دکن میں ہوتی رہی نظر انداز کر دیا ہے تو یہ ان کی لاعلمی تھی، عصبیت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب کی کوئی بھی تاریخ خواہ وہ کتنی ہی جامع کیوں نہ ہو، ایسی نہیں ہو سکتی جس میں ہر حصۂ ملک کی ادبی خدمات کی ساری جزئیات سما جائیں۔ کوئی ادبی انسائکلوپیڈیا بھی اس خوبی کا حامل نہیں ہو سکتا، یہی سبب ہے کہ بنگال میں اردو، بہار میں اردو، راجستھان میں اردو، مہاراشٹر میں اردو، کشمیر میں اردو، دکن میں اردو، میسور میں اردو، مدراس میں اردو، تامل ناڈو میں اردو جیسی تصانیف وجود میں آئی ہیں، آرہی ہیں اور اب بھی ان کی ضرورت ہے تاکہ اردو ادب کے وسیع تر کینوس پر بنے ہوئے نقشے میں صحیح تناسب کے ساتھ رنگ بھرا جا سکے۔ ان علاقائی نوعیت کی خدمات اور کوششوں کا اعتراف ہونا چاہیئے۔ ان کی بھی اہمیت ہے اور اگر کچھ حضرات ان کوششوں کا مذاق اڑاتے ہیں تو وہ واقعی بڑے متعصب اور تنگ نظر ہیں۔

علیم نے تامل ناڈ کے شعرا کا تذکرہ لکھ کر بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس تذکرے کی بدولت یہاں کے مشہور، کم معروف اور بعض گم نام شعرا بھی اردو کی وسیع تر دنیا میں متعارف ہوں گے۔ ان میں بعض واقعی بڑے پائے کے اور جید شعرا بھی ہیں۔ قدیم شعرا میں بھی ایسے ایسے استادِ فن اور قادر الکلام گزرے ہیں جن کو اردو شاعروں کی صف اول میں جگہ دیتے ہوئے بے تعصب ناقدین کو ذرا بھی تامل نہیں ہوگا جہاں تک اس ریاست کی ادبی تاریخ اور اس پر توجہ کا تعلق ہے، مدراس یونیورسٹی کا شعبہ اردو یہاں میری آمد (جولائی 1977ء) کے بعد سے پوری طرح اس کا حق ادا کر رہا ہے۔

غالباً علیم صاحب مدراس یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے تحقیقی کاموں سے پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔ اسی لئے انھوں نے "تصنیفات وتالیفات کا سلسلہ" کے زیرِ عنوان بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو محلِ نظر ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ آزاد غزل پر ایم۔ فل۔ کا جو مقالہ میرے شعبے میں لکھا گیا ہے، اس میں علیم صاحب کے دو مجموعوں کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے، ایک تو خود ان کی آزاد غزلوں کا مجموعہ "رد کفر" ہے اور دوسرا ان کا مرتب کیا ہوا مجموعہ "قید شکن" جس میں آزاد غزلوں کا پہلی بار انتخاب شائع ہوا ہے۔ 'اردو مثنوی میں اخلاقی عنصر' کے عنوان سے جو مقالہ میرے شعبے میں پی ایچ ڈی کے لئے لکھا گیا ہے اس میں کاوش بدری کی مثنوی "قبلہ نما" کا تفصیلی جائزہ شامل ہے۔ یہ تو خیر حق شناسی کے طور پر مختلف عمومی موضوعات میں مقامی، مگر مشہور فن کاروں کا جائزہ ہے جو مدراس یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں 1977ء کے بعد سے مسلسل لیا جا رہا ہے مگر خاص طور پر علاقائی موضوعات کو جس قدر توجہ کے ساتھ شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی نے میری نگرانی میں تحقیق کے لئے منتخب کیا ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہر چند علیم صاحب نے اس ریاست میں اردو کی پیش رفت کا تذکرہ کرتے ہوئے بزرگوں اور ہم عصروں کو خوب خوب خراج عقیدت پیش کیا ہے (زیرِ عنوان "سخنے چند") لیکن وہ کسی ایک فرد کا نام نہیں لے سکے جس نے اس سرزمین کا حق اس طرح ادا کیا ہو۔ آپ بھی ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کامیاب مقالوں میں سے چند عنوانات ملاحظہ فرمائیے:۔

1 ڈاکٹر عبد الحق، افضل العلماء۔ حیات اور خدمات

2 قاضی بدر الدولہ۔ حیات اور کارنامے

3 قاضی عبید اللہ ۔ حیات اور کارنامے

4 عہد والاجاہی کے تین شعرا، شاطر، پرتو اور ایمان کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ

5 تامل ناڈ میں اردو ادب۔ 1900ء تا 1950ء

6 تامل ناڈ میں اردو نثر کا ارتقاء۔ از ابتدا تا حال

7 تامل ناڈ میں اردو نعتیہ شاعری، ابتدا سے 1980ء تک

8 تامل ناڈ میں اردو مثنوی نگاری، ابتدا سے 1980ء تک

نواب غوث خاں اعظم کے عہد میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء

یہ سارے مقالے اسی خاکسار بے مقدار کی نگرانی میں لکھے گئے ہیں ہنوز جن عنوانات

پر تحقیقی کام پی ایچ ڈی اور ایم فل کے لئے ہو رہا ہے، ملاحظہ کیجئے :

1۔ تامل ناڈ کے صوفی اردو شعرا
2۔ خانوادہ قربی کی اردو خدمات
3۔ تامل ناڈ میں اردو شاعری 1850ء کے بعد تا حال
4۔ شہر مدراس کے کچھ اردو کتب خانوں کے مخطوطات کی توضیحی فہرست

مندرجہ بالا مقالوں کے علاوہ جن کا نگراں میں ہوں، دوسرے حضرات کی نگرانی میں بھی بعض مقالے لکھے گئے ہیں جو مقامی نوعیت کے ہیں۔ یہاں مدراس یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا کوئی اشتہار منظور نہیں "سخن گسترانہ بات" مقطع میں آپڑی تھی اس لئے اتنا کچھ لکھنا پڑا۔ ورنہ "قطع محبت" بھی مطلوب نہیں۔ ارے معاذ اللہ۔ محبت نہ ہو تو زندگی دشوار ہو جائے۔ ہاں تو دوسرے حضرات کی نگرانی میں جو مقالے مقامی نوعیت کے لکھے گئے ان میں سے بعض یہ ہیں۔

1۔ تامل ناڈ میں اردو صحافت
2۔ تامل ناڈ میں اردو افسانہ نگاری

جب میں نے مقدمہ لکھنے سے پہلے اور تذکرہ پڑھنے کے بعد علیم صاحب سے دریافت کیا کہ وہ کون سے غلط سلط موضوعات ہیں جن پر تیسرے درجے کی چیزیں پیش کر کے ڈگریاں دی جا رہی ہیں تو وہ صرف ان کے نام لے سکے جن کے کام میری نگرانی میں نہیں ہوئے۔ مزید یہ کہ انھوں نے بعض مقالہ نگاروں کے ذاتی تعصبات کا تذکرہ بھی کیا۔ یہ ذاتی تعصبات تو ہر جگہ ملیں گے، ذاتی بھی اور علاقائی بھی۔ ایک بار ڈاکٹر احمد جمال پاشا مدراس آئے۔ انھوں نے ایک مقالے میں جو میری ہی نگرانی میں لکھا گیا تھا مقالہ نگار کے اس سہو پر ٹوکا کہ اس میں میرا (انجم الہدیٰ کا) نام بحیثیت نثر نگار نہیں ہے، حالانکہ اب میں تامل ناڈ میں ہی رہتا ہوں اور گزشتہ (تقریباً) گیارہ سال سے یہیں کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں نے یہاں کے لوگوں کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے کہا میرا شمار یہاں کے لوگوں میں کس طرح ہو سکتا ہے جب میرے آبا و اجداد یہاں کبھی نہیں آئے اور جب میں یہاں پیدا نہیں ہوا، یہ ممکن ہے میں یہیں پیوند خاک ہو جاؤں، مگر اہل تامل ناڈ مجھے کبھی یہاں کا تسلیم نہیں کریں گے اور اسی طرح میرا تذکرہ

بہار کے مصنفین کے یہاں بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا ہے، اس لئے کہ میں وہاں نظروں سے اوجھل ہوں اور شہرت میں میرے حریف وہاں ہر جگہ میرا نام مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ ہے تعصب کی انتہا۔ ایک ہی شخص کے خلاف تعصب کبھی وطنی نسبت کے نام پر اور کبھی ترک وطن کے نام پر اسے محروم اعتراف رکھنا چاہتا ہے ہاں تو علیم صاحب نے اپنے تذکرے میں ایک اور جگہ انھیں مقالہ نگار کے ان ذاتی تعصبات کا تذکرہ کیا ہے جن سے کام لے کر انھوں نے قابل ذکر لوگوں کے نام عمداً چھوڑے ہیں، یہ علیم صاحب کے نزدیک گروہ بندی ہے۔ مگر موضوعات کا "غلط سلط ہونا" کیسے ثابت ہوا۔ رہا تیسرے درجے کی چیز پر ڈگریوں کا ملنا تو اس کا فیصلہ علیم صبا نویدی صاحب نہیں کر سکتے ہر یونیورسٹی کا اپنا ضابطہ ہوتا ہے۔ اس کے مقرر کئے ہوئے ممتحن ہوتے ہیں اور علیم صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ میری نگرانی میں لکھے ہوئے مقالوں کے ممتحن ہندوستان کے بڑے جید پروفیسر حضرات رہے ہیں جو ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ علیم صاحب نے ایک بار ذاتی گفتگو میں بتایا کہ شاطر، پرتو اور ایمان والے مقالے میں تینوں شعرا مساوی نہیں ہیں، خاص طور پر وہ جتنے شاطر کے عقیدت مند ہیں، اتنی ہی خراب رائے ایمان کے متعلق رکھتے ہیں یہ ان کی ذاتی رائے ہے، ہو سکتا ہے کہ صحیح ہو، مگر تحقیق میں 'ہیرو پرستی' تو نہیں ہوتی، حقائق کو از سر نو دریافت کرنا اور روشناس کرانا تحقیق ہے۔ مرتبے کا تعین کرتے ہوئے مقالہ نگار لکھے گا کہ غواصی کے نتیجے میں جو کچھ ہاتھ آیا ہے وہ موتی نہیں، کنکر پتھر ہے۔ بہر طور، تحقیق پہلے تو غواصی ہے اور پھر ہاتھ آئے ہوئے نتائج کی جانچ پرکھ۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ عظیم موضوعات کا لازماً انتخاب کر کے انھیں لازماً عظیم ثابت کیا جائے۔ انتخاب موضوعات کے پہلے ان کی اہمیت کا اندازہ البتہ کیا جاتا ہے تاکہ اہم موضوعات پر ہی کام ہو سکے۔ یہاں یہ بھی واضح کر دوں کہ جن مقالوں پر مدراس یونیورسٹی میں میری نگرانی میں کام ہوئے اور جن پر ڈگریاں ملی ہیں، ان کے ممتحن اس قسم کے پروفیسر نہیں ہیں جن کو علیم صاحب نے "شہر مدراس کے پروفیسروں" سے شکایت کرتے ہوئے "پروفیسر" شمار کیا ہے۔ یہاں اردو کا کوئی یونیورسٹی پروفیسر اس سے پہلے نہیں ہوا جس سے علیم صاحب کو شکایت ہے اور ظاہر ہے کہ مجھ سے انھیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرا تو تذکرہ کم از کم بحیثیت شاعر انھوں نے

تامل ناڈ کے شعرا میں کیا ہے ۔ یہ ان کی دوستداری کی دلیل ہے، معلوم نہیں اہل تامل ناڈ اسے مانیں گے یا نہیں۔

علیم صبا نویدی صاحب میرے بہت اچھے دوست ہیں میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب میرے قدم مدراس پہنچے بھی نہیں تھے یہاں آنے کے بعد ذاتی ملاقات کی کثرت دوستی میں بدل گئی میں نے ان پر لکھے جانے والے مضامین کا انتخاب کر کے اس پر طویل مقدمہ لکھا اور وہ مجموعہ مع مقدمہ "آسمان فن کا سفیر" کے نام سے 1985 میں شائع ہوا میں نے اس مقدمے میں علیم صاحب کا تعارف بھرپور تعارف کرایا ہے ۔ علیم میرے نزدیک بڑے جیالے، منفرد اور طرح دار شاعر ہیں۔ ان کے ادبی قدو قامت کا صحیح اندازہ مستقبل کا مورخ کرے گا، لیکن آج وہ اردو کی جدید شاعری کی معتبر آواز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو شاعروں کا تذکرہ لکھ کر انھوں نے اپنے میدان سے باہر قدم نکالا ہے ۔ اور یہ بہت ضروری تھا۔ اس علاقے کی ادبی تاریخ ہر طرح کی مثبت اور مذکورۂ پیشیں کوششوں کے باوجود اور توجہ چاہتی ہے ، اس تذکرے کے علاوہ بھی علیم نے شاعری کے میدان سے باہر قدم نکالا ہے وہ افسانہ نگار اور انشائیہ نگار بھی ہیں انھوں نے شاعری کے انتخابی مجموعے بھی مرتب کئے ہیں وہ شاعر پہلے ہیں یا افسانہ نگار، اس کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے ۔ میرے نزدیک وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں ۔ مرحوم دانش فرازی نے انھیں بنیادی طور پر افسانہ نگار تسلیم کیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ طرح نو سے 'شعاعِ شرق' تک علیم میں چھپے ہوئے فن کار نے جو ارتقائی سفر کیا ہے وہ ان کے افسانوی مجموعوں 'روشنی کے بھنور' اور 'شگاف در شگاف' میں اتنے واضح خطوط پر نہیں ملتا۔

علیم کا نام شاعری میں جدت کے لئے مشہور ہے ۔ آزاد غزل کے موید و حامی وہ ہیں ۔ نثری غزل تک انھوں نے لکھ ڈالی ہے ۔ میں نہیں جانتا کہ نثری غزل کو کسی صنف کا درجہ حاصل ہے یا نہیں ۔ ابھی تو آزاد غزل ہی پر جہان نقد و نظر میں ہنگامے ہیں لیکن علیم تجربے کرتے جا رہے ہیں ۔ اب انھوں نے 'ہائی کو' کا انتخاب کیا ہے ۔ 'ترسیلے' اور 'شعاعِ شرق' دو 'ہائی کو' کے مجموعے شائع کرانے کے بعد وہ تیسرا مجموعہ تیار کر رہے ہیں اور ہائی کو کا انتخابی مجموعہ 'نئی پہچان' کے نام سے زیر طبع ہے ۔ یہ تو میں شروع ہی میں لکھ

چکا ہوں۔ 'بھارت جوتی' علیم کی قومی نظموں کا مجموعہ ہے ۔ 'لمس اول' میں ان کی پابند نظمیں ہیں علیم کے جوہران کے آخری دو مجموعوں 'فکر بز' اور 'نقش گیر' میں کھلے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو شاعری کی دنیا میں علیم کو حیات دوام انھیں مجموعوں سے حاصل ہوگی۔ خاص طور پر 'نقش گیر' کو بحیثیت مجموعہ میں ان کا شاہکار مانتا ہوں لیکن علیم کے فن کی یہ آخری منزل نہیں ہے ۔ ان کا طائرفن اور بلندی کی جانب مائل پرواز ہے۔ اب جو دو آخری مجموعے ہائی کو کے آئے ہیں، ان کے ذریعہ علیم کے ذہن و فکر کے نئے آفاق سے روشناس ہونے کا موقع ملا ہے ۔

شاعری اور نثر میں علیم کے علیحدہ علیحدہ کارنامے ہیں، لیکن ان کی باطنی شخصیت کی دل کشی ان کی شاعری میں زیادہ اجاگر ہوتی ہے۔ اصناف کے تنوع میں علیم کی طبیعت کی رنگارنگی کا جلوہ دیکھا جاسکتا ہے ان کے موضوعات فکر میں بھی تنوع ہے۔ جنس کی جبلت سے شروع کر کے جب اس کا ارتفاع Sublimatism ان کے یہاں جلوہ گر ہوتا ہے تو ان کے افکار کی تطہیر ہو جاتی ہے ۔ عصری حسیت اور عصری مسائل کی ترجمانی علیم کو مرغوب خاطر ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر ان کے حالیہ شائع شدہ ہائی کو میں ان کی ترجمانی دیکھی جاسکتی ہے جو فن کے ساتھ مملو اور ممزوج ہو کر دوآتشہ ہوگئی۔ علیم جدید موضوعات کو جدید انداز سے پیش کرتے ہیں۔ شعری اظہار کی پیرایہ تراشی ان کی اپنی ہے۔ وہ معاشرے کے جنگل میں فرد کی تنہائی کے المیے پر بھی لکھتے ہیں تو علامتیں اور پیکر نئے نئے وضع کرتے ہیں۔ جدیدیت کی کورانہ تقلید نہیں کرتے ۔ ایک دو ہائی کو اس مقدمے میں بے موقع سہی، ملاحظہ کیجئے۔

1 ـــ کون کس کا ہے ساتھی
اس غرض کی دنیا میں سب کے سب
چڑیا گھر کے ہیں ہاتھی

2 ـــ کیا عجیب بستی ہے
بے لباس پھرتی ہے زندگی
اوج ہے، نہ پستی ہے

غرض و ہوس کی دنیا میں فرد کا المیہ ہمارے جدید شاعروں کو اسی طرح متاثر

کرتا ہے جس طرح قدیم شاعروں کو متاثر کرتا تھا۔ فرق صرف اظہار کے اسلوب کا ہے۔ یہاں اسلوب کے اس فرق پر لکھنے کا موقع نہیں۔

آخر میں علیم کے نعتیہ مجموعہ 'مراۃ النور' پر چند سطریں لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ مجموعہ ابھی زیرِ طبع ہے۔ شاید مجھی کو اس پر مقدمہ لکھنا ہوگا۔ میں اس پر مقدمہ لکھ کر اپنے لئے کسب سعادت کا سامان فراہم کروں گا۔ میں نے اس کا مسودہ بالاستیعاب دیکھا ہے۔ ذوقِ تصوف اور نعت گوئی سے شغف علیم کے مزاج کے نئے خواص ہیں۔ 'مراۃ النور' واقعی مراۃ النور ہے۔ نعت گوئی میں علیم کو بھی اب مقام حاصل ہوتا جا رہا ہے۔ اگر وہ اس طرف توجہ کریں تو بہت جلد اعلیٰ پائے کے نعت گویوں میں ممتاز ہوں گے۔

نجم الہدیٰ
28.3.1988

سخنے چند

تلاش و جستجو ہر اچھے اور بڑے فن کار کا فطری عمل ہوتا ہے یہی عمل ہے جو فن کار کو آفاقی وسعتوں تک لے جاتا ہے اور یہاں فن آفاقی وسعتوں میں پھیل کر آہستہ آہستہ ایک نقطے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس نقطے سے جو نوری شعاعیں پھوٹتی ہیں وہ ادب کی فکری کائنات کو ہمیشہ منور کرتی رہتی ہیں۔

اسی تلاش و جستجو کے فطری عمل نے مجھے کسی بھی لمحے ذہنی اور جسمانی طور پر خاموش "ہاتھ پہ ہاتھ دھرے" بیٹھنے نہیں دیا۔ ہمیشہ میری تلاش و جستجو کی موجیں شعوری انگلیوں کی پوروں سے اٹھ کر آسمانی سرحدوں کو چھونے کے لئے بے تاب رہی ہیں معلوم نہیں وہ حسین لمحہ کب اور کس شان سے آئے گا جس لمحے میری تلاش و جستجو نوری کرنوں کی ہم سفر ہو کر تا قیامت فکر و احساس کی دھرتی پر محیط ہو جائیں گی۔

زیر نظر تذکرہ اردو ادب میں میرا تیسرا قدم ہے۔ میرا پہلا قدم آزاد غزل کا مجموعہ "ردکفر" تھا تو دوسرا قدم ہائی کو نظموں کا مجموعہ "تریسیلے" تھا۔ یہاں پہلے اور دوسرے قدم کی تفصیلی وضاحت غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا تیسرا قدم حقیقتاً پہلا قدم ہے جس کو اپنی منزل تک رسائی حاصل کرنے میں تقریباً 22 سال کا طویل سفر طے کرنا پڑا۔

1980ء میں اس تذکرے کی کڑیاں "یادرفتگان" اور "نشان ہم عصراں" کے عنوانات سے "اتحاد" مدراس کے ادبی ایڈیشن میں بالالتزام شائع ہوتی رہیں۔

مدراس کے اردو ادب کا مختصر تاریخی جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا

ہوں کہ بیسویں صدی میں پرتو مدراسی، شاطر مدراسی، منور حسین خاں گوہر مدراسی کے بعد علامہ شاکر نائطی، مولانا محوی صدیقی، مولانا یوسف کوکن، مولانا سروش داودی دانش فرازی، فدوی باقوی نے اردو ادب کی جو ٹھوس خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی پرنور کرنیں ہمیشہ بارگاہ ادب میں سجدہ ریز رہیں گی۔

ان حضرات کے بعد کاوش بدری، حسرت سہروردی، عارف مدراسی، راز امتیاز، علیم صبا نویدی، وغیرہ کے نام بھی اردو ادب کی بقا و ترقی کے لئے جان توڑ اور پیہم کوششوں کے تعلق سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

آج تک مدراس کے شعراء و ادباء کے تعلق سے اردو اور فارسی میں جو تذکرے منصۂ شہود پر آئے ہیں ان میں بعض اہم قدآور شعراء کو (جنھوں نے مدراس کے شعری ادب کو آسمانی وسعتوں تک اونچا اٹھانے کی مسلسل کوشش کی تھی) دانستہ یا نادانستہ طور پر نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان تذکروں سے ہٹ کر ہمیں چیدہ چیدہ مدراس کے کچھ شعراء کے تذکرے "خمخانۂ جاوید" لالہ سری رام "تذکرۂ شعراء دکن" اور محبوب الزمن (عبدالجبار ملکہ پوری) "دکن میں اردو" (مولوی نصیر الدین ہاشمی) "تاریخ زبان اردو" (ڈاکٹر شمس اللہ قادری) "مدراس میں اردو" (ڈاکٹر افضل اقبال) اور "تاریخ زبان اردو" (ڈاکٹر جمیل جالبی) میں مل جاتے ہیں۔ ان تذکروں میں بھی مدراس کے شعراء کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق ہیں۔ بہرکیف یہ تذکرے بھی ہمارے آنے والے مورخ اور محقق کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادب میں آج بھی پاس داری اور جانب داری کی رسم سکۂ رائج الوقت کی طرح چل رہی ہے۔ جاگیرداری تو دم توڑ چکی ہے مگر رسی کا بل رسی کے جل جانے کے بعد بھی ہنوز باقی ہے پتہ نہیں ادب میں یہ غلط رویہ کب تک جاری رہے گا۔ اس تذکرے میں میں نے ان تمام شعراء کا اجمالی جائزہ لیا ہے جو بڑے شاعر نہ سہی اچھے اور خوشگو شاعر ضرور تھے۔ جن کو ہم شمالی ہند کے شعراء کے پہلو بہ پہلو فخر کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں۔ اردو ادب میں جو محقق اور نقاد صوبہ جاتی عصبیت کا شکار ہوتے ہیں وہ اچھے اور بڑے فن کار کے مقام کا صحیح تعین کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ادب کا یہ بہت

بڑا المیہ ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر علاقے میں اس طرح کے متعصب اکابرین بآسانی مل جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس قسم کے غلط رویئے اور عصبیت کی بنیاد اردو ادب میں سب سے پہلے محمد حسین آزاد (مولف آب حیات) نے رکھی تھی۔ آزاد نے آب حیات میں مرزا غالب پر شیخ محمد ابراہیم ذوق کو فوقیت دی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ چند برسوں میں مرزا غالب کو نئی زندگی دینے والوں کی ایک بہت بڑی فوج تیار ہو گئی۔ مگر ذوق کو تلاش کرنے کا نام ونشان دور دور تک کہیں نظر نہیں آتا۔ حال ہی میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ایک مبسوط مقالہ لکھ کر ذوق کو از سر نو دریافت کرنے اور زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

(علیم صبا نویدی)

ابتدائیہ

تامل ناڈو کی تین سو سالہ اردو ادب کی تاریخ کا جائزہ لینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اب سے تین سو برس پہلے ہی تامل ناڈو میں اردو غزل نے ایک فضا پیدا کرلی تھی نواب غلام غوث خان بہادر اعظم (جو نوابان آرکاٹ میں بڑے ادب نواز، نکتہ شناس دیدہ ور اور خود شاعر و ادیب تھے) کے یہاں فارسی کے شعراء کا خاصہ جمگھٹا رہتا تھا جس کی وجہ سے خصوصاً مدراس میں ایک شستہ مذاق فارسی کا پیدا ہو گیا تھا۔ نواب غلام غوث خان اعظم نے یہاں ایک ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس کی مثال سارے ہندوستان میں تو کیا بلکہ ایران میں بھی نہیں ملتی، مشاعرے کی نوعیت یہ تھی کہ ہر شاعر کے کلام پر برسر محفل باقاعدہ تنقید ہوتی تھی۔ الفاظ کی تحقیق، زبان اور اسلوب کے متعلق مناسب مدلل اور موثر خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ نواب غلام غوث خان اعظم بہ نفس نفیس خود ان مشاعروں کی صدارت کرتے تھے۔ تنقید کے سلسلے میں آپ کا فیصلہ اٹل سمجھا جاتا تھا سب سے اہم بات یہ ہے کہ تنقید اور جواب تنقید، پھر فیصلہ، یہ سب کچھ نہایت خوشگوار ماحول میں ہوتا تھا اور کوئی کشیدگی یا رنجش کی بات پیدا نہیں ہوتی تھی نواب غلام غوث خان اعظم کی تالیف "گلزار اعظم" اس کا زندہ ثبوت ہے جس کے نسخے آج بھی مدراس یونیورسٹی، انڈیا آفیس لائبریری، لندن اور دوسرے کتب خانوں میں محفوظ ہیں اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے دور کے شعراء شمال ہی کی طرح اعظم کے دور کے شعراء اردو میں شعر کہنا کسر شان سمجھتے تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ

اکثر شمال کے اکابرین ادب نے اپنی عدیم الفرصتی یا کم علمی کی وجہ سے تامل ناڈ کی ادبی تاریخ کی طرف اپنی توجہ کبھی مبذول نہیں کی یا وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ شمال کے سوا ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں اردو ادب کا وجود ہی نہیں ہے۔ نواب غلام غوث خان بہادر اعظم نے اردو میں بھی شعر کہے ہیں۔ جن کا مختصر سا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ اعظم کے بعد انہی کے خاندان میں نواب عبدالروٴف خاں پرتو نے اردو کو اپنایا اور اردو میں شعر کہے۔ شریف مدراسی جنھوں نے دیوان غالب کا جواب لکھا، غالب ہی کی زمینوں میں غالب کے انداز نظر، زاویۂ فکر اور اسلوب کی روشنی میں غزلیں کہیں۔ ان کی تقلید کرتے ہوئے پرتو نے بھی جو شریف ہی کے حلقۂ تلمذ میں شامل تھے، دیوان غالب کا جواب لکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک صدی گزرنے کے بعد بھی غالب کی شخصیت اور اس کے فن کی انفرادیت مسلّم ہے خصوصاً زبان، فکر اور اسلوب کے تعلق سے غالب کا مقابلہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن شریف مدراسی نے گو غالب کی ہمسری نہ کی ہو لیکن ان کی تخلیقات کا مختصر سرمایہ بھی اتنا گراں اور وقیع ہے کہ انصاف پسند مورّخ اور نکتہ رس نقاد اسے کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ شریف کے بعد کاروان غزل باقاعدہ مراحل طے کرتا رہا۔ نواب عبدالرحمٰن خاں شاطر مدراسی، عبدالقدوس صفو، نواب روٴف احمد خاں پرتو، اسمٰعیل سیٹھ مغموم مدراسی، سید صبغت اللہ نور مدراسی، ایماں گوپاموی، عباس علی عباس، عبدالعزیز عادل، مولانا شاکر نائطی، آسی ترپاتوری، دانش فرازی، کماؔی ویلوری، راجی صدیقی، آثم کرنولی، قدوسی باقوی، کاوش بدری، راز امتیاز، گلاب مدراسی، حیدر علی خاں حیدر اور فرحت کیفی وغیرہ نے غزل کے ناز اٹھائے اور اس کی پاسداری کی اور اس کی زندگی، توانائی اور صحت مندی کے لئے اپنے خونِ جگر کے ایک ایک قطرہ کا حساب دیا۔

نئی غزل کا رجحان

جس طرح آج کے مشینی اور میکانکی دور میں زندگی کے دھاروں نے مختلف سمتوں کی تلاش میں اپنے جوش و خروش کو زندہ رکھا ہے۔ ہمیں عصری رجحانات کی روشنی میں فن کے canvas پر بھی مختلف رنگوں کے نئے اور متنوع نقوش نظر آتے ہیں۔ آدمی جس کے دل میں ہزار پریشانیوں کے باوجود جینے کی تڑپ رہتی ہے وہ آج کے جدید تقاضوں سے منحرف ہو کر اپنی الگ دنیا بسا نہیں سکتا چونکہ اسے اسی زمین کی سطح پر اپنی آنکھ کے لئے روشنی، دل کے لئے دھڑکنیں، جسم کے لئے لہو حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے احساس کی وادی میں بھی وہ زمانے کی رفتار اور نئی قدروں کی انگلی تھامے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اگرچہ ہمارے ملک میں میکانکی زندگی کی چھاپ بہت کم نظر آتی ہے لیکن پورے طور پر اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ یہاں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اردو شاعری نے بھی عصری تقاضوں کے تحت مختلف روپ دھارے ہیں۔ بعض وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ جدید ذہن رکھنے والے ارباب قلم نے اردو کے روایتی حسن کو مجروح کر دیا ہے اور خصوصاً ابہام و علائم کے فروغ نے اردو شاعری کے بنیادی مقصد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ شاید انھوں نے موجودہ دور کے بدلتے ہوئے حالات کا مشاہدہ نہیں کیا یا وہ چیزیں جو ان کی فہم سے بالاتر ہوتی ہیں انھیں بے مصرف اور لایعنی سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ دراصل یہ ان کے سوچنے اور سمجھنے کے غلط زاویہ کا نتیجہ ہے۔ ورنہ ان کی مخالفت و دل آزاری کے باوجود زمانہ باقاعدہ اپنے فرض کو انجام دے رہا ہے۔ شعر و فن کی جدیدیت

کے راستے میں لاکھ کانٹے بچھے ہوں لیکن جدیدیت کو فروغ دینے والوں کا قافلہ نہایت استقلال اور توانائی کے ساتھ آگے بڑھتا ہی رہے گا۔

آج تامل ناڈو میں بھی نوجوان شعراء کی ایک کھیپ ایسی نظر آتی ہے جس میں جدیدیت کو بھرپور صلاحیت، سلیقہ مندی اور تہذیبی عناصر کے ساتھ برتنے کا شعور موجود ہے جدیدیت کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ آج کے فن کار نے اپنی انا کو ذات کے خول سے باہر نکالنے کی کوشش میں فکری توانائی کو دیانت داری کے ساتھ صرف کیا ہے آج کا فن کار اپنے وجود کے اندر کی کائنات کی تلاش میں مصروف ہے جس کا تعلق خارجی آہنگ سے گہرا ہے۔ کبھی کبھی محسوس کرتا ہوں کہ آج کی ساری جدید شاعری کا گویا ماحصل یہی ہے کہ فن کار اپنے وجود کے اندر کی کائنات کو پالینے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود واقعی جنھیں شاعر کہہ سکیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ آج شاعری کے پس منظر میں تلخ تجربات اور علم وفن کا ذخیرہ بھی ضروری ہے آج کا فن کار زندگی کے مثبت پہلوؤں کی نشاندہی خوش اسلوبی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ کسی بندھے ٹکے اصول کے زنداں میں مقید رہنا نہیں چاہتا اس کی افتاد طبع کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آزاد فضا میں اپنی فکری پرواز کو جاری رکھے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تامل ناڈو میں راز امتیاز، دانش فرازی، کاوش بدری، فرحت کیفی، علیم صبا نویدی، حسن فیاض، کاظم نائطی نے جدیدیت کے عناصر کی ترجمانی کا بوجھ اپنے کندھوں پر سنبھالا ہے۔ وہ علم وفن سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی نظر کے بھی حامل ہیں جو بظاہر نگاہ سے زیادہ وسیع اور گہری ہے اور ان کا مستقبل یقیناً روشن اور تابندہ رہے گا۔

نئی نظم کا سفر

1936ء میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس منشی پریم چند کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ سید سجاد ظہیر، احمد علی اور ڈاکٹر رشید جہاں نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ تینوں فن کار دراصل کارل مارکس کے فلسفہ اشتراکیت سے زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ غالباً 1936ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی۔ ترقی پسند تحریک نے ماورائی تصورات سے ہٹ کر سماجی حقائق کے اظہار کو اپنا اولین فریضہ جانا۔ ترقی پسند تحریک 'ادب برائے ادب' کی قائل نہیں تھی۔ اس تحریک نے اردو ادب کو 'ادب برائے زندگی' کا تصور دیا۔ اس تحریک میں کچھ ایسی کشش تھی کہ اس دور کے بڑے بڑے مشاہیر فن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ادب سماجی مسائل کا ترجمان بنے اور بدلے ہوئے عصری رجحانات کا ساتھ دے سکے۔ "انگارے" نے کافی تہلکہ برپا کیا۔ پھر اس کے بعد سجاد ظہیر نے "لندن کی ایک رات" اور "روشنائی" جیسی تصانیف سے اردو ادب کی تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام محفوظ کر لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس تحریک نے ایک دور کو متاثر کرنے کے بعد بڑی بے کسی اور کس مپرسی کے عالم میں دم توڑ دیا۔ لیکن اردو ادب کی تاریخ ترقی پسند تحریک کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتی کہ اس نے اردو ادب کو ایک نیا ذہن دیا۔ اسی دور کی بات ہے کہ ن م راشد، سعادت حسن منٹو اور میراجی جیسے ارباب فن نے لاہور میں "حلقۂ ارباب ذوق" کی بنیا

ڈالی۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے ن م راشد، سعادت حسن منٹو، اور میراجی ترقی پسند تحریک کے اسالیب سے قریب تھے۔ لیکن ان کے سوچنے کا زاویہ الگ تھا۔ آج ہم نظم جدید کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ "حلقۂ ارباب ذوق" کی صدائے بازگشت کسی نہ کسی نہج، جہت اور زاویئے سے جدید تحقیقات میں یقیناً سنائی دیتی ہے، شعوری طور پر نہ سہی لاشعوری طور پر ہی سہی ترقی پسند تحریک نے جب کل ہند سطح پر اپنا کام شروع کیا تو تمل ناڈو کے فن کار اس سے غافل نہیں رہے۔ کاوش بدری نے جو تمل ناڈو کے اردو ادب کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں تمل ناڈو کی سنگلاخ زمین سے "فن کار" اور "منزل" جیسے ماہنامے نکالے۔ اس دور کے بہترین جرائد کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین نے ان رسائل کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک کے رجحانات کو اپنانے کا سہرا دراصل دانش فرازی کے سر ہے۔ اس وقت جب کہ تمل ناڈو میں غزل کا جادو اپنا کام کر رہا تھا۔ دانش فرازی نے نئے رنگ و آہنگ اور حوصلہ مندی کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے رجحانات کو فروغ دیا۔ میں اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ دانش فرازی کے اسلوب نگارش، لہجہ اور رنگ و آہنگ نے تامل ناڈو کے ایک دور کو متاثر کیا اور پھر ان کی خاص لگن، انہماک اور بھرپور شعری اور فنی استعداد نے نئی نسل کے ابھرتے ہوئے فنکاروں کی اس انداز سے حوصلہ افزائی کی کہ آج ان کی تخلیقات بڑے بڑے رسائل میں جگہ پاتی ہیں۔

"مجلس مصنفین" کے تعلق سے دانش فرازی نے بحیثیت صدر مجلس وہ خیال افروز رول ادا کیا جسے تمل ناڈو کی ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کی تخلیقات "نگار"، "ادبی دنیا"، "ادب لطیف"، "کراچی"، "آج کل" اور "نیا دور" جیسے ادبی رسائل میں میں شائع ہوتی رہیں۔ اس وقت جدید ادب کے ان علم برداروں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ جنھوں نے بعد میں اپنی صلاحیت ادبی اور علمی استعداد اور فنی دسترس سے اپنا ایک الگ مقام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دانش فرازی کے بعد جو نئی نسل ابھری اس میں کچھ ایسے صحت مند عناصر تھے جنھوں نے رجعت پسندی کے طلسم کو توڑا اور جدیدیت کے تقاضوں میں خاص انہماک کا ثبوت دیا۔

دانش فرازی نے برسوں پہلے یہ محسوس کیا کہ اردو کے شعر و فن کا سرمایہ اندھا دھند تقلید کا متحمل نہیں ہے بلکہ عصری رجحانات اور نئے تقاضوں کے پیش نظر اپنا روپ بدلنے والا ہے۔ چنانچہ انھوں نے روایت اور رجعت کے خلاف اپنا محاذ قائم کیا اور بقول مجروح : ع

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

تمل ناڈو کے فن کاروں نے تقلید شروع کی اور ان کے رنگ و آہنگ کو اپنانے میں بڑا حصہ لیا۔ اس ضمن میں عزیز تمنائی، راز امتیاز، کاوش بدری، فرحت کیفی، ادیب بھارتی، نشاط بھارتی، علیم صبا نویدی اور حسن فیاض کے نام اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جدید شاعری اور نئے تجربے

میتھو آرنلڈ کہتا ہے۔ ادب زندگی کی تنقید ہے دنیا کی کسی زبان کا ادب زندگی کے تقاضوں اور معاشرے کے تغیرات سے دامن بچا کر نشو و نما پا نہیں سکتا۔

اردو ادب میں خصوصاً آرنلڈ کے اس نامیاتی نظریے کو ترقی پسندوں نے باقاعدہ ایک زندہ اور توانا تحریک کا روپ دیا تھا۔ آج ادبی تخلیقات کے تجربے کے سلسلے میں ان عناصر کی تلاش ہوتی ہے جن کا تعلق زندگی سے ہے۔

ادب کسی منجمد چٹان کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک فعال اور متحرک چیز ہے۔ ادب میں جمود اور انحطاط اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب فن کار اپنے ذہن کو حسین خوابوں اور پر اسرار خلاؤں کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبر ہو کر محض تخیلی فضاؤں میں فرار کی راہیں تلاش کرتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ کے پچھلے ادوار جو غزل، قصیدہ اور مثنوی کی اصناف سے منسوب تھے۔ وہ اسی لئے زیادہ جاندار، ہمہ گیر اور وقیع ثابت نہیں ہوئے کہ ان ادوار میں چند بندھے ٹکے اصولوں کی بنیاد پر ادب کی دیواریں اٹھتی تھیں۔ لیکن زمانہ جوں جوں ترقی کرتا گیا زمانے کی قدریں بدلتی گئیں اور زندگی کے نئے نئے تقاضے پیدا ہوتے گئے لامحالہ اردو کے ارباب قلم کو بھی ایک نئے زاویہ کے ساتھ سوچنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور اس کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی لٹریچر کے عمیق مطالعے نے بھی اردو ادب کی رفتار کو نئی سمتوں سے روشناس کیا۔ اختر الایمان، ن م راشد اور ان سے پہلے

عظمت اللہ خاں اور میراجی نے اسلوب میں نئے نئے تجربے کئے۔

ہمارے تامل ناڈو کا اردو ادب بیس پچیس سال پہلے تک اردو کے نئے رنگ و آہنگ سے ایک حد تک نا آشنا تھا لیکن یہ بھی کہا جا سکتا کہ یکسر نابلد نہیں تھا نئے رجحانات کے تحت لکھنے والوں کا ایک مختصر سا قافلہ آہستہ آہستہ نئی سمتوں کی طرف گامزن تھا لیکن اس کے خدوخال پورے طور پر اجاگر نہیں ہوتے تھے۔ آج یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت حاصل ہوتی ہے کہ ہمارے یہاں لکھنے والوں نے ادب اور زندگی کے باہمی رشتے کو بھرپور انداز میں سمجھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج کا ہمارا ادبی ماحول محض غزل کی عشوہ طرازیوں کا شکار ہو کر نہیں رہا۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو خوش سلیقگی کے ساتھ ادب کی بدلتی ہوئی قدروں اور نئی آوازوں سے اپنی آواز کو ہم آہنگ بنانے میں مصروف ہیں۔

آج کا شاعر ابلاغ خیال کے سلسلہ میں نئے اسالیب کی دریافت اور نئے ہیئتی تجربوں کو مطمح نظر بناتا ہے وہ ان قیود اور بندھے ٹکے دائروں کا پابند نہیں جن سے گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ بلکہ ذہن و فکر کی فضا میں آزادی کے ساتھ اپنی پرواز جاری رکھنا چاہتا ہے۔ جدید شاعری اور اس میں تجربہ اس لئے بھی قابل قبول ہے کہ اس میں انکشاف ذات کے امکانات روز بروز روشن ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا ذہنی تعلق داخلی آہنگ اور کائنات کے تغیر سے گہرا ہوتا ہے۔ انکشاف ذات کے عمل میں آج کا جدید شاعر داخلی آہنگ اور محرکات و عوامل سے کاہلی نہیں برتتا۔ اس کے پیش نظر دنیا کی تبدیلیوں کے نقوش ہمیشہ ہوتے ہیں اور خصوصاً یہ مفروضہ روایات کے زندان میں مقید ہونے کے بجائے حقائق کی روشنی میں آنکھ کھولتا ہے۔ اسے سچائی کی تلاش ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابہام و علائم کے رواج نے اس کے زاویۂ فکر کو ایک حد تک گنجلک اور مبہم بنا دیا ہے۔ لیکن یہ اپنی آواز سے غافل نہیں ہے۔ بیرونی ممالک میں بھی شاعری کے ہیئتی تجربوں نے بڑی ہر دل عزیزی اور مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ خصوصاً اس مشینی اور سائنسی دور میں قدیم قدروں کی پاسداری کے احساس سے نئی قدروں کو ٹھکراتا اور ان سے اغماض برتنا ـــــ ایک سچے اور صحیح فن کار کا شیوہ نہیں ہوتا لاکھ مخالفت کے باوجود ہیئتی تجربوں نے ترقی کے جو مراحل

طے کئے ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے اپنی ایک الگ ست رنگ فضا پیدا کر لی ہے جس کی طرف سوچنے والوں کا قافلہ آگے بڑھتا آ رہا ہے البتہ بعض ناپختہ فن کاروں نے فقدان صلاحیت کے باوجود ہیئتی تجربوں کے بلند منصب پر فائز ہونے کی کوشش کی ہے جس سے خود ہیئتی تجربے ایک حد تک بدنام بھی ہو چکے ہیں۔ بنیادی طور پر جدید ذہن شاعری کے ارتقا تنوع اور تہذیب و تنظیم سے خوب واقف ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ہمارے سامنے ہیئتی تجربہ کرنے والوں کی ایک بڑی کھیپ تمل ناڈو کی ادبی دنیا میں بھی نظر آتی ہے۔

اس نوع کے جدید تجربے کرنے والوں میں عزیز تمنائی، فرحت کیفی، علیم صبا نویدی، حسن فیاض اور کاظم نائطی کے نام بہت نمایاں اور روشن ہیں۔

آزاد غزل اور نثری غزل ہائی کو کا تجربہ کرنے والوں میں علیم صبا نویدی کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ایک ان مٹ اور لازوال حیثیت کا مالک بن چکا ہے۔

مثنوی کا فن

تامل ناڈو کے قدیم شعرا نے تقریباً دو سو سال پہلے اردو شاعری کی اس صنف کو بھی بہت فروغ دیا اور اس صنف میں بڑے عہد آفریں کارنامے انجام دیئے 1159 میں پہلی مثنوی "روضۃ الانوار" میر ولی فیاض ولی دکنی ویلوری نے لکھی۔ اس مثنوی کے بعد مثنوی نگاری کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ چل پڑا کہ جس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو وہ ایک کتابی صورت اختیار کر جائے گا۔ لیکن اس ضمن میں یہاں اتنا کہنا نہایت ضروری ہے کہ تقریباً پچیس سال پہلے جناب کاوش بدری اور راز امتیاز نے اس سلسلے میں پہل کی اور تمل ناڈو کے تین سو سالہ ادبی اور شعری سفر کا جائزہ لیتے ہوئے ایک کتاب بنام "افق تاب" مرتب کی۔ اس کتاب کے مسودے کی تیاری میں راز امتیاز نے اپنی خوشگوار اور سازگار زندگی کے بہترین لمحے نچھاور کر دیئے تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آج تک راز کے تیار کردہ تمام تر مسودے کاوش بدری کی الماری میں قید ہیں

یہاں کے شعرا کی لکھی ہوئی بعض مثنویوں کا اعتراف شمال کے اکابرین ادب نے کیا ہے مثلاً "اعجاز عشق" (مصنف شاطر مدراسی) کا ڈاکٹر اقبال نے اور "قصہ چندر بدن ماہیار" (مصنف عبدالقادر شاکر وانمباڑی) کا داغ دہلوی نے "مثنوی قبلہ نما" (مصنف کاوش بدری) کا فراق گورکھپوری اور نیاز فتح پوری نے کیا ہے۔

ان مثنویوں کے علاوہ نور نامہ، گلزار نامہ، دلہن نامہ، کلمہ نامہ، چکی نامہ، عہد نامہ، لوری نامہ، سکرات نامہ، چارکرسی اور دعائے نور جیسی مثنویاں تمل ناڈو کے شعرا کی دین

ہیں۔ متذکرہ مثنویوں میں چند فارسی مثنویاں بھی ہیں۔ ان تمام مثنویوں کا بھرپور جائزہ راز امتیاز اور کاوش بدری نے "افق تاب" میں لیا تھا جو آج تک منظر عام پر نہ آسکا۔

یہاں چند مشہور اور معرکتہ الآرا مثنویات کی فہرست درج کی جاتی ہے جس کے مطالعہ سے مدراس کی مثنویاتی پرواز کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔

نمبر شمار	مثنوی کا نام	مصنف کا نام	سنِ اشاعت: ہجری	سنِ اشاعت: عیسوی	مطبع
1۔	روضتہ الشہدار	میر ولی فیاض ولی ویلوری	1159		
2۔	دعائے فاطمہ	میر ولی فیاض ولی ویلوری	1162	1748	
3۔	قصۂ طالب و موہنی (قلمی)	سید محمد والا آرکاٹی	1172		
4۔	نمک نامہ	سید شاہ ابوالحسن قربی ویلوری	1175		
5۔	ریاض مسعود (ترجمہ قصص الانبیاء)	شاہ غوثی آرکاٹی	1191		
6۔	انور نامہ	میر اسماعیل خاں ابجدی	1193		
7۔	حقیقت نامہ	میر اسماعیل خاں ابجدی			
8۔	چہار فصل	سید شاہ عبداللطیف قادری ذوقی ویلوری	1194		
9۔	قصہ یوسف زلیخا	محمد عبدالغنی خاں آسیر مدراسی	1200		
10۔	محبوب القلوب	محمد باقر آگاہ ویلوری	1200		
11۔	ریاض الجنان	محمد باقر آگاہ ویلوری	1207		
12۔	ہشت گلزار (پانچ مثنویوں کا مجموعہ صبح نوبہار عشق، ندرت عشق، عنقائے عشق، حیرت عشق اور حسرت عشق)	محمد باقر آگاہ ویلوری	1209		

نمبر شمار	مثنوی کا نام	مصنف کا نام	سنِ اشاعت ہجری	سنِ اشاعت عیسوی	مطبع
13	گلزارِ عشق	محمد باقر آگاہ ویلوری	1210		
14	نوبہارِ عشق	غلام اعز الدین خان بہادر مستقیم جنگ نامی مدراسی	1211		1955 میں یوسف کوکن نے دوبارہ مرتب کرکے نوری پریس سے طبع کیا۔
15	مدینۃ الانوار فی رحلت سید الابرار	"			
16	ساقی نامہ (فارسی میں)	"			
17	فردوسِ اعجاز				
18	سلیمان نامہ				
19	گنجِ قدرت				
20	اسرارِ عشق	محمد آرکاٹی	1225		
21	رشکِ قمر و مہ جبیں	نادر مدراسی	1229		
22	داغستانِ کلفت	غلام اعز الدین خان بہادر مستقیم جنگ نامی	1231		
23	ریاض السیر	غلام محمود حسرت آرکاٹی	1247		
24	گلبنِ مہ رخاں	اثیمہ آرکاٹی	1268		
25	قصہ تمیم انصاری تاریخی نام "ساغرِ زیبا"	غلام محی الدین رجا ترپاتوری	1281		
26	گلزارِ شریف	شہر استاد شریف مدراسی	1292		شرفیہ طلسم حیرت، مدراس
27	باغِ ارم	مستعان مدراسی	1301		نظام المطابع، مدراس
28	اشتیاق نامہ	تجمل حسین ایمان گوپاموی	1302		غوثیہ، مدراس
29	قصہ انوار سہیلی (قلمی)	خطیب قادر باشاہ وانمباڑی	1314		
30	حلیۂ مبارک	مبشر النساء بیگم حیاؔ		1940	مدینہ پریس، مدراس
31	عیون المظاہر	سید شاہ خواجہ عبد الغفار مسکین	1313		نامی، مدراس

نمبر شمار	مثنوی کا نام	مصنف کا نام	سنِ اشاعت ہجری	سنِ اشاعت عیسوی	مطبع
32۔	نالۂ شاکر	عبدالقادر شاکر وانمباڑی	1315		شوکت الاسلام، بنگلور
33۔	بہارِ ہند (وکٹوریہ سے متعلق)	محمد صفدر حسینی مہکری	1317		شرفیہ طلسم حیرت، مدراس
34۔	کینہ مرغوب	سید شاہ عبدالغفار مسکین	1323		نامی، مدراس
35۔	مثنوی سعد	سعدالدین سعد مدراسی	1325		نامی، مدراس
36۔	صوفیانہ مناجات و عاشقانہ خیالات	فرحت ترچناپلوی			نامی، مدراس
37۔	گلزارِ شاکر (قصۂ چندر بدن ماہیار)	عبدالقادر شاکر وانمباڑی	1326		شوکت الاسلام، بنگلور
38۔	حرز جاں	نواب رؤف خان بہادر پرتو، مدراسی	1327		رزاقیہ، مدراس
39۔	بی بی مریم	علی بخش	1328		فردوسی، مدراس
40۔	کولم شریف	عبدالغنی شجاع		1930	برقی اردو پریس، مدراس
41۔	گلشنِ سیرت	مولانا ضیاء الدین امانی پلیکنڈوی	1367	1950	برقی اردو پریس، مدراس
42۔	قبلہ نما	کاوش بدری		1965	مدینہ پریس، مدراس

٭ تنقیدی شعور کا سلسلہ

تنقید بہ اعتبار فن بعد کی چیز ہے۔ اس کے دھندلے سے نقوش ہندوستان کے قدیم شعرا پر لکھے ہوئے فارسی تذکروں میں ضرور ملتے ہیں جنھیں ارباب فن نے مرتب کیا ہے۔ پچھلے دور میں شاعری اور شخصیت پر انفرادی زاویئے سے تجزیہ بہت کم لوگوں نے کیا تھا۔ کیونکہ اس دور میں تنقید کے اصول وضوابط منضبط نہس ہوئے تھے پہلی مرتبہ مولانا حالؔی نے مقدمۂ شعروشاعری میں صالح تنقیدی شعور کے سہارے قصر تنقید کا سنگ بنیاد رکھنے کی کوشش کی لیکن میرا خیال یہ ہے کہ حالؔی اور شبلؔی کے یہاں تنقبد سے زیادہ تاثر کے نقوش ملتے ہیں۔ ان دونوں مشاہیر نے ایک حد تک تحقیق، تنقید اور تاثر کے درمبان ایک متوازن سطح ابھارنے کا کارنامہ ضرور انجام دیا۔ شبلؔی اور حالؔی کے خلوص   نت اور ریاضت ومزاولت سے انکار ویسے بھی مشکل ہے۔ تخلیقی عمل کی فضا میں تنقید کے جن راستوں کا تعین ہوا ان کی روشنیاں زیادہ نہ سہی مگر دراصل وہ مشعل راہ ثابت ہوئی ہیں یعنی بعد میں جو کارواں چل پڑا ہے اس کے سفر کا آغاز شبلؔی اور حالی کے ہاتھوں ہوا۔

اردو میں صحیح تنقیدی شعور کا تعین مغربی علوم کے حصول کے بعد ہوا۔ حالؔی براہِ راست انگریزی زبان اور Literature اور اس کی ثقافت سے آگاہ نہیں تھے لیکن پنجاب کے قیام کے دوران حالؔی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتب کی صحت اور اغلاط کی تصیح کے سلسلے میں جو فرائض انجام دیئے ان کے تعلق سے مغربی Literature

سے استفادہ کرنے کا انھیں موقع ملا۔

حالیؔ نے اردو شاعری کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا اور جو تجاویز پیش کیں ان کا ردعمل خصوصاً غزل کے تعلق سے بہت اچھا ہوا۔ حالیؔ کے دور تک تمل ناڈو کی ادبی فضا پر ناسخ و آتش کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ فکر و جذبہ کی ہم آہنگی سے زیادہ زبان کی آراستگی، انداز بیان کی شگفتگی، محاورات کا استعمال اور دلآویز استعاروں پر توجہ دی جاتی تھی۔ طرز غالب کی اتباع کرنے والوں کا بھی ایک حد تک فقدان تھا۔ لیکن شریف مدراسی نے پہلی مرتبہ دیوان غالب کا جواب بڑی مہارت وفن کارانہ جسارت سے پیش کیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ مولانا شاکر نائطی نے جو مولانا ناطق گلاٹھوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ غالبؔ کے بھرپور آہنگ اور لہجے کو اپنایا۔ چونکہ مولانا کے فن اور شخصیت کے پیچھے مشاہدہ، علم اور تجربات کا سرمایہ موجود تھا جس نے حیات وکائنات کے رشتوں کو ایک نہج اور ایک نئے زاویۂ فکر سے سوچنے پر مجبور کیا۔ مولانا کے یہاں بڑی گہری تنقیدی بصیرت پائی جاتی تھی۔ چونکہ مولانا السنۂ مشرقیہ پر بھرپور دسترس رکھتے تھے اور کثرت مطالعہ نے تحقیق اور تنقید کے راستوں کو ہموار کیا تھا مولانا نے اپنی جبلی صلاحیت اور علوم سے خود بھی استفادہ کیا اور آپ کے سرچشمۂ فیض سے کئی ارباب ذوق فیضیاب ہوتے رہے۔ اس دور میں مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد کی بلند پایہ شخصیت، تبحر علمی، وسیع مطالعہ اور گہری نظر کے لئے مسلم تھی۔ مولانا گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس میں فارسی اور عربی کے پروفیسر تھے اور انگریزی Literature کا ذوق بھی دوسروں کی بہ نسبت اونچا تھا۔ آپ کی اصابت رائے کے آگے بڑے بڑے اکابرین علم وفن لب کشائی کی جرأت نہیں کرتے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یہاں کے وہ شعراء جن میں بھرپور تنقیدی صلاحیت تھی۔ ان کا تنقیدی دائرہ گفتگو تک محدود تھا۔ نامیاتی تنقید کے سلسلے میں ان کے کارنامے صفر کے برابر ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا سروش داؤدی، مولانا اسمٰعیل رفیعی، مولانا فدوی باقوی، دانش فرازی، راز امتیاز، عزیز تمنائی، کاوش بدری، عارف مدراسی، ابوبکر نظمی، حسن فیاض، کاظم نائطی، اعجاز شاکری، جلال عرفانی، علیم صبا نویدی، مظفر شہ میری، اور غیاث اقبال بھی نقد و نظر کے دشوار راستے پر سرگرم سفر رہ چکے تھے۔ ان کا بھی تقریباً وہی حال تھا کہ تنقیدی

بصیرت کے باوجود کوئی ٹھوس خدمت انجام نہیں دے سکے۔ پروفیسر حبیب خاں سروش داوٗدی کے کچھ تنقیدی مضامین ضرور شائع ہوتے ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ممکن تھا کہ اسی دور میں تنقید و تحقیق کی ایک خوشگوار فضا پیدا ہو جاتی۔ خصوصاً تامل ناڈو کے پروفیسروں اور لکچرروں کا یہ وصف لمحۂ فکریہ پیدا کرتا ہے کہ انھوں نے شمال والوں کی طرح بصری اور نامیاتی تنقید کے فرائض کو محسوس نہیں کیا محض سماجی اثاثہ تنقید نے انھیں کبھی کبھی سوچنے کچھ لکھنے پر آمادہ کیا۔ علم و آگاہی، مشاہدہ، مطالعہ اور تجربات کے باوجود کسی خاص لگن، انہماک اور شیفتگی کے ساتھ تنقید کے فن کو اپنانے اور تامل ناڈو کے فن کاروں کو اس سے ہمکنار کرنے کا حق ادا نہیں کیا۔ لیکن حضرت دانش فرازی، راز امتیاز اور کاوش بدری اور مولف تذکرہ نے تنقید کے اساسی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً علمی طور پر نقد و نظر کی تہ داری کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جس کا سلسلہ آج تک بھی جاری ہے۔

تنقید سے ہٹ کر جن ادیبوں نے تحقیقی اور معلوماتی مضامین لکھے ان میں مولانا یوسف کوکن، حمزہ حسین، علامہ محوی صدیقی، فدوی باقوی، حسرت سہروردی، پروفیسر عظمت اللہ سروری کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان مضامین کے علاوہ دینی اور علمی مضامین لکھنے والوں کی فہرست بڑی لمبی ہے لیکن یہاں چند ایک نام جو بہت اہم ہیں ان کا مختصر سا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

● **ڈاکٹر عبدالحق** کی ابتدائی تعلیم و تربیت آپ کے ابا حضور کے زیر نگرانی کرنول میں ہوئی۔ ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد آپ نے محمڈن کالج مدراس سے انٹرمیڈیٹ اور بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد افضل العلماء اور ایم۔ اے میں 1924ء میں کامیابی حاصل کی۔ پھر اسی کالج میں عربی، فارسی اور اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ نے جنوبی ہند کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی اور ان کو ٹھوس خدمات انجام دینے کی طرف راغب کیا۔

آپ نے "ابن سنار الملک" پر مقالہ پیش کر کے Oxford University لندن سے ڈی فل کی ڈگری حاصل کی 1939ء میں آپ محمڈن کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آپ نے مدراس یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کے شعبے کی بنیاد رکھی۔ آپ چار سال

مدراس پریسیڈنسی کالج کے پرنسپل بھی رہے پھر چند سالوں کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بھی رہے علی گڑھ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد واپس مدراس آئے اور اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک مدراس پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہے اور 15 مارچ 1958ء کو جاں بحق ہوئے اور مسجد والاجاہی کے احاطے میں تدفین عمل میں آئی۔

آپ نے فرانس، جرمن، اٹلی، ترکی اور Egypt کا سفر کیا اور اس سفر سے واپسی کے بعد آپ نے "اطالیہ" کتاب لکھی جس میں اٹلی کی تہذیب اور وہاں کے رہنے والوں کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ یہ کتاب مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل تھی

آپ نے انیسویں صدی کی اردو صحافت پر بھی بہت معلومات انگیز مقالہ لکھا جو سہ ماہی "اردو" اورنگ آباد میں شائع ہوا۔

● مولانا سید عبدالوھاب بخاری اپریل 1902ء میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے آپ نے ابتدائی عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں حاصل کی۔ نظام کالج حیدرآباد سے بی۔ اے اور مدراس یونیورسٹی سے ایم اے (1927ء میں) کی ڈگریاں لیں۔ 1928ء میں افضل العلما اور 1929ء میں ایل ٹی پاس کیا 1927ء سے 1930ء تک گورنمنٹ محمڈن کالج میں اسسٹنٹ لکچرر رہے اور 1930ء میں ہی مدرسہ جمالیہ مدراس کے پرنسپل بنے۔ تقریباً نو سال تک اسی مدرسہ میں عربی زبان کی خدمت کرتے رہے 1942ء سے 1944ء تک اسلامیہ کالج وانمباڑی ہی میں تاریخ اسلام کے پروفیسر اور پرنسپل کے فرائض انجام دیئے اور پھر نیو کالج مدراس میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے اور یہیں سے 1967ء میں سبکدوش ہو کر جمالیہ عربی کالج مدراس میں پانچ سال پرنسپل رہے 1974ء کے آغاز میں حیدرآباد گئے۔

مدراس میں آپ کے قیام کے دوران آپ نے جو خدمات اردو بولنے والے پسماندہ طبقے کے لئے انجام دیں وہ واقعی ناقابل فراموش ہیں۔ آپ سے مستفیض ہونے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے آپ کی مہربانیوں کی بدولت آج بہت سے احباب صاحب اقتدار بنے ہوئے ہیں۔ خود مولف تذکرہ کے بھی آپ محسن و مربی رہے ہیں۔

آپ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں کے ماہر تھے آپ 1962ء میں جب

بغداد گئے تو آپ کی عربی تقریر وہاں عراق کے صدر جنرل قاسم سن کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ جنرل قاسم نے بے حد متاثر ہو کر آپ کو سینے سے لگا لیا۔
مئی 1982ء میں حیدر آباد میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

● **مولانا محمد یوسف** کوکن 4 نومبر 1916ء کو ٹینمبور (مدراس) میں پیدا ہوئے۔ اپنے ماموں علامہ شاکر نائطی کے زیر نگرانی مولانا جامع دارالسلام عمر آباد سے فارغ التحصیل ہوئے۔ منشی فاضل اور افضل العلماء اور ایم اے ایم لٹ کی سندیں مدراس یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ عربی کی ایک سالہ اعلیٰ تعلیم کے لئے کیرو یونیورسٹی Cario University بھی گئے۔ آپ کو السنۂ مشرقیہ پر بھرپور قدرت حاصل ہے۔ عربی فارسی اور اردو میں مولانا کے تحقیقی کام (سولہ تالیفات) تامل ناڈو اردو ادب میں ایک تاریخی کارنامہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے فن اور شخصیت کا احاطہ آپ کی زندگی میں ہی ہو جانا چاہئے لیکن افسوس کی بات ہے کہ تامل ناڈو کے ارباب علم و ادب (جنھوں نے اپنی زندگی بھر مولانا کی شخصیت اور بیش بہا تالیفات سے استفادہ کیا ہے) نے آپ کے متعلق سوچا ہے نہ توجہ دی ہے۔ بہر اعتبار مولانا کوکن تحقیقی خدمات مولانا کی اعلیٰ ظرفی، وسیع النظری، کشادہ ذہنی اور وسعتِ قلبی کی روشن دلیل ہے۔ عموماً ہر شہر کے لوگ مردہ پرست واقع ہوتے ہیں لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ اہل مدراس اچھے اور بڑے فن کار کے تعلق سے نہ زندوں کے قدرداں ہیں نہ مردوں کے ہی خواہ۔ مدراس میں اردو زبان کی باگ ڈور غلط قسم کے سیاستدانوں اور بھاری بھرکم شخصیت کے مالک (جو بظاہر اردو کے ہمدرد ہیں) سنبھالے ہوتے بیٹھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک اچھی چیز غلط ہاتھوں میں آجائے تو اس کا مصرف بھی غلط ہی ہوگا۔ سارے ہندوستان میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس کی باہوں میں پاسبان قوم اور سیاست دانوں کو بہ آسانی امان مل جاتی ہے ورنہ دوسری زبانوں کے دروازے ہر ایرے غیرے کے لئے نہیں کھل پاتے۔

● **پروفیسر اے۔ آر۔ عباس** اینو کالج مدراس میں تاریخ کے پروفیسر تھے اردو کے تعلق سے آپ کی خاموش خدمات ناقابل فراموش ہیں موصوف بمقام

کڑپہ (اے پی) 1392ھ م 1929ء کو پیدا ہوئے۔ عمر کا زیادہ تر حصہ مدراس میں گزرا اور یہیں 1403ھ م 1983ء میں جاں بحق ہوئے۔ موصوف کی تالیف کردہ کتاب "عارفین" اور مرتّب کردہ مجلّہ "آئینۂ ایّام" موصوف کی یاد کو ہمیشہ تازہ کرتے رہیں گے۔

● **محمد لطف اللہ خان عدیل** مدراس میں 1915ء کو پیدا ہوئے آپنے ابتدائی تعلیم سینٹ پال ہائی اسکول مدراس سے حاصل کی۔ علم موسیقی سے بھی آپ کو لگاؤ تھا۔ اس فن میں راس کے مشہور و معروف موسیقی کے استاد عبدالحفیظ بالکے سے بھرپور مستفید ہوئے۔ آپنے ایک ماہنامہ "ادیبِ اردو" کا بھی اجرا کیا جو تین شماروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ آپ کی تخلیقات "مصحف" عمر آباد میں جگہ پا چکے ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت پاکستان گئے اور ہمیشہ کے لیے وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ حال ہی میں 1997ء میں آپکے خاکوں کا ایک مجموعہ "تماشائے اہلِ قلم" عالم ظہور میں آچکا ہے۔ اس مجموعہ میں جوش، فیض، م۔ ن۔ راشد، عصمت چغتائی وغیرہ پہ خاکے شامل ہیں یہ مجموعہ منشا ہیر ادب کی ادبی اور علمی صحبتوں، محبتوں اور عنایتوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کی تحریروں کا انداز بڑا جاذبِ دل ہے

● **ڈاکٹر ذاکرہ غوث** بمقام حیدرآباد ۱۸ر نومبر 1921ء کو پیدا ہوئیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت حیدرآباد کے ماحول میں ہوی۔ آپ نے ناگپور یونیورسٹی سے یم۔ اے ؛ پاس کرنے کے بعد شاید ڈاکٹر عبدالحق کرنولی کی ایما رپہ مدراس کے ایتھراج کالج فار ویمن میں اردو کی تدریسی خدمات پر مامور ہوئیں۔ یہیں آپنے مدراس یونیورسٹی سے یم لٹ ؛ اور پی، ایچ ڈی ؛ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپکے تحقیقی مضامین ہندوستان کے مقتدر رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔ 1995ء میں آپ کی معرکتہ کتاب "مولانا باقر آگاہ شخصیت اور فن" شائع ہوی ہے۔

● **حبیب اللہ شاہ** آپ ہندوستان کے مشہور و معروف وکلا میں سے ہیں۔ پروفیسر محبوب پاشا کے دلیے تو لاکھوں شاگرد ہیں لیکن جو امتیاز و مقام موصوف کو حاصل ہے اس کی نظیر دوسروں میں خال خال نظر آتی ہے۔ آپ کو اردو علم و ادب سے بہت گہرا لگاؤ ہے۔ اے، جے، اردو سمینار کے کارناموں میں جہاں ڈاکٹر عبدالحق، مولانا سید عبدالوہاب بخاری، عزیز تمنائی، ڈی۔ احمد علی پارسیا کے نام روشن ہیں وہیں آپکا نام نامی بھی بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ اسی ادارے کے مطبوعہ سالناموں کے توسط سے موصوف کے بہترین اردو تراجم پڑھنے کا راقم کو اتفاق ہوا ہے۔ پھر راقم کے ایک دیرینہ رفیق قمرالدّین (وکیل سپریم کورٹ) دہلی مدراس آئے تو انہوں نے موصوف کی تعریف و توصیف میں ایک ایسے نئے آسمان کی سیر کرائی جس سے راقم قریب رہ کر بھی بہت دُور تھا۔ بحیثیت مجموعی آپ کی علمی، ادبی، ملّی اور قومی خدمات یقیناً ناقابلِ فراموش ہیں۔

● سید جلال الدین جلال عرفان فرزند سید عبدالقدوس مرحوم بمقام وانمباڑی (شمالی آرکاٹ) 12 اپریل 1946ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مسجد جدید مسلم پور سے حاصل کرنے کے بعد پرائمری اور سکنڈری اسکول سے ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی میں کامیابی حاصل کی۔ بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری اسلامیہ کالج سے حاصل کرنے کے بعد انھوں نے پوسٹ گریجویشن میں ایس وی یونیورسٹی سے کیا۔ فی الحال اسلامیہ کالج، وانمباڑی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ بہت کم مدت میں انھوں نے اردو ادب کے تحقیقی اور تنقیدی دائرے میں بڑے روشن نقوش چھوڑے ہیں۔ بالخصوص انھوں نے اپنی تحقیقی اور تدقیقی عمل سے وانمباڑی کی شعری خدمات اور ادبی جغرافیہ کے وہ نقوش جو قریب قریب ارباب علم و ادب کے دل و دماغ سے مٹ گئے تھے۔ ان مٹے ہوئے نقوش کو انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے از سر نو تابندگی بخشی ہے۔ آج کل ان کی تحریروں کی نئی روشنی نے ہمیں ان کے اندر چھپے ہوئے باشعور اور پرخلوص فن کار سے بہت قریب تر کر دیا ہے۔ اس فن کار کے تخلیقی اور تحقیقی عمل میں ایک نیا افق پوشیدہ ہے جس کی پہچان کے لئے ہمیں کئی سمتوں، کئی دشاؤں، کئی فلکی فضاؤں سے گزرنا ہوگا۔ اس فن کار شخصیت کی تہوں میں جو گوہر پنہاں ہیں انھیں ڈھونڈ نکالنے کا کام ایک غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا فن کار ہی کر سکتا ہے۔

● مولانا بشیر الحق قریشی (فرزند حضرت مولانا محمد نور قریشی اشرفی ادھونی) بمقام ادھونی، ضلع کرنول، آندھرا میں 1953ء / 1372ھ میں پیدا ہوئے اردو اور عربی زبان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ تحفظ القرآن، شاہی جامع ادھونی میں حاصل کی۔ مولوی عالم اور مولوی فاضل کی تعلیم کے لئے دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور آئے اور ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ افضل العلماء اور ادیب فاضل مدراس یونیورسٹی سے پاس کیا۔ تقریباً دس گیارہ سال سے دارالعلوم لطیفیہ میں عربی لکچرار کے فرائض انجام دے رہے ہیں ـــــــــ تقریباً دس سال سے سالنامہ "اللطیف" ویلور کے ادارتی فرائض اپنے ذمہ لئے ہوئے ہیں۔ "اللطیف" کا ہر شمارہ آپ کی بہترین صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ آپ کی دس تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں ہر تصنیف سے آپ کی دینی معلومات کا وسیع تر آسمان روشن نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر حکیم سید افسر پاشا ●

آپ بمقام گڑیا تم (ضلع شمالی آرکاٹ) پیدا ہوے ۔ شمالی آرکاٹ کے حاذق طبیبوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے ۔ طبابت کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر بھر پور قدرت رکھتے ہیں ۔" امام المحدثین" جیسے معرکۃ الآراء مضامین سے موصوف کے تبحر علمی ، ژرف نگاہی اور فنی و فکری موشگافیوں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ۔ شاعری میں نعت گوئی کی طرف زیادہ مائل ہیں ۔" اللطیف" ویلور ، "نفیر" ویلور میں آپ کے مضامین اور بہترین نعتیں شائع ہوتی رہتی ہیں ۔

محمد مصباح اللہ ●

اہل نائط کے دینی علمی اور ادبی کارناموں سے ویسے بھی ٹمل ناڈو کی تاریخ معطر اور منور ہے شہر مدراس کے ادبی ماحول میں سب سے الگ تھلگ رہ کر خاموش ادبی خدمات انجام دینے والی جامع الکمال شخصیت کا ایک نام محمد مصباح اللہ بی ، ایس سی ؛ بی ٹی ؛ بھی ہے ۔ مدراس کے قد آور شعرا دبا آپ کے مضامین " نیا دور" لکھنؤ ، " پاسبان " جنڈی گڑھ ، جیسے مقتدر رسائل میں جگہ پا چکے ہیں راقم کو اسکول کے دور (1955ء میں) آپ کی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے ۔ آپ کی تخلیقی آنچ کے نقوش افسانوں کی رہ گزر میں بھی موجود ہیں ۔

ڈاکٹر پی نثار احمد ریحان ●

آپ بمقام وانم باڑی 3 ردسمبر 1950ء میں پیدا ہوے ۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ اسکول وانم باڑی اور اسلامیہ کالج سے بی اے ؛ کی سند حاصل کی ۔ نیو کالج مدراس سے ایم اے ؛ عربی اور مدراس یونیورسٹی سے عربی میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں لکچرار کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا ۔ آج کل اسی شعبہ میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو اور فارسی بھی ہیں ۔ آپ بچپن ہی سے اردو نثر نگاری کی طرف مائل رہے ۔ 1964ء میں آپکے مختصر ترین افسانے اور مضامین " سالار " بنگلور میں جگہ پا چکے ہیں ۔ حال ہی میں آپ کے مضامین کی ایک کتاب "دروس القرآن" (مطبوعہ 1995ء) ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز کے زیر اہتمام منصۂ ظہور میں آچکی ہے ۔

مندرجۂ بالا مضمون نگاروں کے علاوہ وقتاً فوقتاً دینی اور علمی مضامین لکھنے والوں میں مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری ، مولانا خاور ادیب ، مولوی محمد حسین ، مولانا سید طیب الدین اشرفی ، مولانا شاہ سید طاہر قادری ، سید مصطفےٰ حسین بخاری ۔ مولانا ابو السعود باقوی ، مولانا صادق بغدادی باقوی ، مولانا رئیس الاسلام ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی ، مولانا خطیب عبد المجید باقوی کے نام نہ صرف قابلِ ذکر ہیں بلکہ ان حضرات کے ذکر کے بغیر ٹمل ناڈو کے موجودہ دور کی دینی و ادبی تاریخ نامکمل سمجھی جائے گی ۔

صحافتی خدمات

اردو شعر و ادب کی طرح اردو صحافت کے میدان میں تمل ناڈو نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

محققین کے مطابق اردو کا سب سے پہلا اخبار "جام جہاں نما" کلکتہ سے 1822ء میں شائع ہوا مگر کچھ ہی عرصے بعد بند ہو گیا اور پھر 1823ء میں دوبارہ اس کا اجرا ہوا۔ کلکتہ کے "جام جہاں نما" کے بعد اردو کا دوسرا۔ جنوبی ہند کا پہلا اخبار "جامع الاخبار" مدراس سے یکم ذی الحجہ 1287ھ/1841ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔

مولف تذکرہ کا خیال ہے کہ اس ضمن میں تحقیقات کو فی الحال قطعیت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا حقیقت یہ ہے کہ مدراس میں لیتھوگرافی کا مطبع کلکتہ کے بعد لیکن دہلی اور لکھنؤ وغیرہ جیسے شمالی ہند کے مراکز سے بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال نے جنوبی ہند کی اردو صحافت میں بجا طور پر تحریر فرمایا ہے کہ 1857ء سے بیشتر ہی مدراس میں ایک درجن سے زیادہ مطابع قائم ہو چکے تھے

ؔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مدراس کی علاقائی زبان تمل کا پہلا اخبار 1855ء میں شائع ہوا یعنی اردو کے پہلے اخبار سے کوئی 14 سال بعد۔ اور یہ تمل اخبار بھی تمل عوام کی نمائندگی نہیں کرتا تھا بلکہ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا ایک حصہ تھا۔ جب کہ اولین اردو اخبارات بھی یہاں کے عوامی احساسات کے ترجمان تھے۔

یہ امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کا پہلا اخبار مدراس ہی سے شائع ہوا ہوگا گو کہ دستِ تحقیق اب تک اس جریدے تک نہیں پہنچا ہے۔ مدراس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کا بغور جائزہ لیں تو اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اردو اخبار کے اجراء کے لئے ناگزیر ماحول 1841ء سے بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ بہر حال یہ ایک امکان ہے جس کی طرف محققین کو متوجہ ہونا چاہئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مدراس کی اردو صحافت نے بالکل ابتدائی دور ہی سے صحافت کی اعلیٰ ترین قدروں کی پاسداری شروع کر دی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن حضرات نے یہاں اردو صحافت کے میدان میں اول اول قدم رکھا وہ پیدائشی صحافی تھے اور بغیر کسی باقاعدہ تربیت کے اس فن کے تمام پہلوؤں سے وہبی طور پر واقف تھے۔

مدراس کے اردو اخبارات کل ہند نوعیت کے ہوا کرتے تھے خصوصاً پڑوسی ریاست کرناٹک (میسور) اور حیدر آباد میں ان کا کافی اثر و رسوخ پھیلا ہوا تھا۔ اور ان اخباروں نے پہلی بار شمال و جنوب کے درمیان کھڑی فاصلے کی دیواروں کو مسمار کیا۔ مدراس سے شائع ہونے والے اخباروں کے خریدار موجودہ کرناٹک، آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور اڑیسہ کے علاقوں میں بھی تھے۔ بعض اخبارات حیدرآباد میں اپنے مستقل نمائندے رکھتے تھے۔ بنگلور سے تو مدراس کا تعلق جڑواں شہر جیسا رہا ہے۔

مدراس کے اخباروں میں شاہ ظفر، غالب اور اقبال جیسے شعراء کی تازہ تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں اور یہاں کے بعض اخباروں میں شائع شدہ خبروں کو اس قدر معتبر سمجھا جاتا تھا کہ شمال کے ہم عصر ان کے حوالے دیا کرتے تھے۔ ان حقائق کا کچھ تفصیلی ذکر ڈاکٹر افضل اقبال کی مذکورہ تالیف میں ملتا ہے۔

جن اولین صحافیوں نے تمل ناڈو میں اردو صحافت کی بنیاد رکھی اور اسے بلندیاں عطا کیں ان میں جنوب کے پہلے اردو اخبار "جامع الاخبار" کے ایڈیٹر سید رحمت اللہ، "اعظم الاخبار" کے ایڈیٹر سید محمد اعظم، "شمس الاخبار" اور "عزیز الاخبار" کے بانی اور ایڈیٹر

شاہ عزیز الدین گھٹالہ اور اول الذکر اخبار کے پہلے ایڈیٹر سید عبدالستار سنین اور دوسرے ایڈیٹر مولوی نصیر الدین گھٹالہ "صبح صادق" اور "طلسم حیرت" کے نگراں اور شہیر استاد حضرت صادق الحسینی شریف مدراسی کو اردو زبان و ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کے بعد آنے والوں میں مولانا عبدالمجید شرر آلندوری (آلندور شہر مدراس کا ایک محلہ ہے) ایڈیٹر "قومی رپورٹ"۔ علامہ شاکر نائطی ایڈیٹر "مصحف"۔ مولانا ابوالجلال ندوی ایڈیٹر "سہیل"۔ مولانا سید سلطان محی الدین بہنمی مدیر "حیات" و "امام" کے اسمائے گرامی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔

جو صحافی آزادی سے پہلے سرگرم تھے اور اس کے بعد بھی کئی برس تک اس میدان میں خدمت انجام دیتے رہے ان میں جناب ایس ایم فاضل[1] (روزنامہ "مسلمان") مولوی سید سلطان محی الدین بہنمی (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) اور مولانا سید عبداللطیف فاروقی ("آزاد ہند" اور "مسلمان") اہم مقام رکھتے ہیں۔

آزادی کے بعد جن حضرات نے تمل ناڈو میں اردو صحافت کو نئے آفاق سے روشناس کرایا اور صحافت کے نئے تقاضوں کو پیش نظر رکھا ان میں حضرت کاوش بدری (فنکار اور منزل کے مدیر۔ نجمہ، پاکیزہ وغیرہ کے شعبۂ ادارت میں سرگرم) اور حضرت راز امتیاز ("ساون"۔ "ادبی رپورٹ"۔ "اتحاد" کے مدیر اور "نجمہ"۔ "پاکیزہ"۔ "فلم دیش" وغیرہ کے شعبۂ ادارت میں سرگرم) کی کاوشوں کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ حضرت راز امتیاز کی صحافتی خدمات تامل ناڈو سے کرناٹک تک پھیلی ہوئی ہیں اور

---

[1] ایس ایم فاضل مرحوم شہر مدراس کے ممتاز دانشور، خطیب اور صحافی تھے جنھیں کم وبیش تمام علوم قدیم و جدید سے دلچسپی تھی اور ان میں سے کئی ایک میں وہ اپنی ایک الگ اور منفرد رائے رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی قائم کردہ "انجمن کریسنٹ سوسائٹی" کے پلیٹ فارم سے تمل ناڈو اور خصوصاً مدراس کی تہذیبی دنیا کو مالا مال کیا اور علم و ادب کے فروغ اور جدید دور کی تفہیم میں مرکزی کردار ادا کیا۔ موصوف کا ذریعۂ اظہار اردو نہیں انگریزی زبان تھی جس میں ایک اہل زبان کی طرح مہارت تامہ رکھتے تھے۔ دراصل وہ انگریزی زبان کے صحافی تھے۔ "مسلم کرانیکل" اور "دکن ٹائمز" جیسے جریدوں کی ادارت کرچکے تھے۔ مزید براں ایک خبر رساں ایجنسی بھی قائم کر رکھی تھی۔

موصوف بنگلور میں روز نامہ "سالار" کے روح رواں اور روزنامہ "علمبردار" کے مدیر رہے ہیں اور آج کل وہ "سالار" ہی سے منسلک ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ حضرت عبدالعزیز عادل (یادگار زمانہ) مولانا محوی صدیقی (معیار ادب، الارشاد) جناب عزیز اللہ اور ان کے فرزند جناب محمد کریم اللہ (آزاد نوجوان) جناب اسماعیل سیٹھ اور ان کے برادر موسیٰ سیٹھ شہاب (دلچسپ) وغیرہم کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تامل ناڈو کی اردو صحافت کا تفصیلی اور ایماندارانہ جائزہ آج تک نے نہیں پیش کیا ہے۔ 1807ء کی تاریخ کا قابل تعریف حد تک حقیقت پسندانہ جائزہ ڈاکٹر افضل اقبال کی کتاب میں ملتا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ دوسری کتابوں یا مضامین میں یا تو انتہائی مختصر ذکر ملتا ہے یا پھر متعصبانہ تذکرہ۔

آج کل ٹمل ناڈو میں اردو صحافت کا یہ عالم ہے کہ دور دور تک مستقل طور پر کوئی ہفت روزہ، پندرہ روزہ یا ماہنامہ نظر نہیں آتا۔ ایسے مسموم اور ناسازگار حالات میں بھی روزنامہ "مسلمان" ٹمل ناڈو کی نمائندگی میں سرگرم عمل ہے۔ ٹمل ناڈو کا یہ واحد روزنامہ ہے جو 1927ء سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس روزنامے کی پالیسی سب سے الگ تھلگ ہے۔ نہ کسی سے دوستی اچھی نہ کسی سے دشمنی اچھی کے اصول پر کاربند ہے۔ اس روزنامے میں مقامی خبروں کے علاوہ مدراس اور بیرون ہند ہونے والی مذہبی، علمی و ادبی نشستوں کی رپورٹیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اس روزنامہ کو سید فضل اللہ نے اپنے مصمم ارادوں، مستحکم عزائم سے اور مسلسل جدوجہد سے نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اردو صحافتی تاریخ میں اپنا نام بھی محفوظ کر لیا ہے۔ اس روزنامے سے وابستہ نامہ نگاروں میں جناب علی حسین صاحب، جناب ابوالحسنات، جناب احمدالدین، جناب حیات افتخار، جناب قاضی حبیب اور جناب ع۔ ر۔ غ۔ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ اور اس روزنامہ کے شعبۂ کتابت (دورِ قدیم) خطیب محمد یعقوب، عبدالغنی خان حائل، خطیب عبدالجبار، تاج الدین، نور خان، شریف برکاتی، عبدالرزاق عبدالغفور، پہلوان اسماعیل خان، سید شمسی اور دور جدید میں عبدالرحمٰن حسینی، خورشید بیگم کی خدمات بھی قابلِ قبول ہیں۔

آخر میں ٹمل ناڈو کے چند مشہور جرائد کی فہرست درج کی جاتی ہے۔ جس کے مطالعہ سے یہاں کی صحافتی سرگرمیوں کا ایک ہلکا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔

نمبر شمار	اخبار کا نام / مقام	سن اجراء	وقفۂ اشاعت	مدیر
1	جامع الاخبار، مدراس	1841	ہفت روزہ	سید رحمت اللہ
2	اعظم الاخبار، مدراس	1848	ہفت روزہ	حکیم سید محمد
3	آفتاب عالم، مدراس	1849		
4	عمدۃ الاخبار، مدراس	1849	ہفت روزہ	محمد انور
5	تعلیم الاخبار، مدراس	1851	ہفت روزہ	منشی سید حسین
6	صبح صادق، مدراس	1855	ہفت روزہ	سید عبدالرحمٰن
7	طلسم حیرت، مدراس پنچ	1856	روزنامہ	غلام محی الدین
8	مظہر الاخبار، مدراس	1856	ہفت روزہ	محمد خواجہ بادشاہ عبرت
9	شمس الاخبار، مدراس	1859	ہفت روزہ	محمد اعظم گھٹالہ
10	ماہِ نو، مدراس	1864	ماہنامہ	جعفر حسین
11	نیّرِ اعظم، مدراس	1864	روزانہ	محمد عبدالستار صدیقی
12	یادگارِ زمانہ، مدراس	1871	ماہنامہ	منشی عبدالرزاق
13	جریدۂ روزگار، مدراس	1875	ہفت روزہ	سید مرتضیٰ شاہ قادری
14	مظہر العجائب، مدراس	1879	روزانہ	مصطفیٰ حسین
15	احسن الجرائد، مدراس	1881	ہفت روزہ	حکیم محمد حسین
16	عزیز الاخبار، مدراس	1882	ہفت روزہ	شاہ عزیز الدین گھٹالہ
17	اتحاد، مدراس	1884	ہفت روزہ	محمد عظیم الدین
18	کرناٹک پنچ، مدراس	1884	روزانہ	منشی محی الدین حسن خاں
19	جلوۂ سخن، مدراس	1887	ماہنامہ	سید علی قادری بہار
20	مخبر دکن، مدراس	1895	ہفت روزہ	سید عبدالقادر فقیر
21	نیّر آصفی، مدراس	1898	ہفت روزہ	اسدالدین احمد

نمبر شمار	اخبار کا نام / مقام	سنِ اجرا	وقفۂ اشاعت	مدیر
22۔	آفتابِ دکن، مدراس	1900	ہفت روزہ	سید جلال الدین گھائل
23۔	اتفاق، مدراس	1900	ہفت روزہ	عبد الملک
24۔	خورشید، مدراس	1910	ماہنامہ	سید جلال الدین گھائل
25۔	المضمون، مدراس	1911	ماہنامہ	منشی انصر الدین بیخود
26۔	مورخ، مدراس	1912	ماہنامہ	مولوی محمد بدیع الدین
27۔	قومی رپورٹ، مدراس	1914	روزانہ	مولانا شرر آلندوری
28۔	رسالۂ نور (خواتین کے لئے)	1916	ماہنامہ	مولانا عبد المجید شرر آلندوری
29۔	آزاد ہند، مدراس	1922	روزانہ	محمد عبد اللطیف فاروقی
30۔	مسلمان، مدراس	1927	روزانہ	مولانا ابو الجلال ندوی، سید سلطان بہمنی اور نذیر احمد شاکر
31۔	سفینہ، مدراس	1928	سہ ماہی	ڈاکٹر عبد الحق، عبد الجبار اور غلام محمد
32۔	آزاد نوجوان، مدراس	1929	روزانہ	محمد عبد اللطیف فاروقی، عبد الکریم آزاد
33۔	بشریٰ، مدراس	1933	ماہنامہ	مولانا ابو الجلال ندوی
34۔	دلچسپ، مدراس	1934	ہفت روزہ	محمد اسمٰعیل سیٹھ
35۔	رفیق، مدراس	1934	ماہنامہ	قاضی محمد عبد الرحمٰن
36۔	مصحف، عمر آباد	1935	ماہنامہ	علامہ شاکر نائطی
37۔	مسلم گزٹ، مدراس	1935	روزانہ	محمد کریم الدین
38۔	مسلم رپورٹ، مدراس	1935	روزانہ	غلام محی الدین (بیادگار شرر آلندوری)
39۔	رسالۂ حیات، مدراس	1936	ماہنامہ	ایمان گوپاموی، سید سلطان بہمنی
40۔	سہیل، مدراس	1936	روزانہ	مولانا ابو الجلال ندوی
41۔	ہمدرد، مدراس	1937	ماہنامہ	سید سلطان بہمنی

نمبر شمار	اخبار کا نام / مقام	سن اجراء	وقفۂ اشاعت	مدیر
42	ادیب ، مدراس	1947	ماہنامہ	سید سعد اللہ ممتاز
43	زندگی، مدراس	1948	ہفت روزہ	سید احمد گلاب مدراسی
44	آزاد مزدور، مدراس	1948	ہفت روزہ	سید احمد گلاب مدراسی
45	جام جم ، ویلور	1950	ماہنامہ	مولانا محمد جعفر حسین فیضی صدیقی
46	فن کار، مدراس	1950	ہفت روزہ	کاوش بدری
47	فلمستان، مدراس	1950	ہفت روزہ	سید سعد اللہ ممتاز
48	امام ، مدراس	1951	ہفت روزہ	سید سلطان بہمنی
49	مشعل ، مدراس	1951	ماہنامہ	اصغر ویلوری
50	معیار ادب، میل وشارم	1952	ماہنامہ	مولانا محوی صدیقی
51	الارشاد، میل وشارم	1952	ماہنامہ	مولانا محوی صدیقی
52	شاکر، مدراس	1953	ہفت روزہ	حامد علی شاکر
53	منزل، مدراس	1952	ماہنامہ	کاوش بدری
54	نجمہ ، مدراس	1959	ہفت روزہ	سید یوسف
55	پاکیزہ ، مدراس	1959 1962	ہفت روزہ ماہنامہ	بیگم جواہر نگار، جوہر فاروقی
56	سرکار، مدراس	1960	ہفت روزہ	بیگم خورشید حسین
57	فلم دیش، مدراس	1961	ہفت روزہ	کاتب محمد یعقوب
58	جلترنگ، مدراس	1963	پندرہ روزہ	بیگم عارف مدراسی
59	سفیر ہند، مدراس	1964	پندرہ روزہ	نعیم المشرقی
60	اتحاد ، مدراس	1966	ہفت روزہ	راز امتیاز
61	امام	1967	ماہنامہ	مولانا نثار نگری
62	ہمسفر	1967	ہفت روزہ	دانش فرازی
63	ساون	1967	ماہنامہ	راز امتیاز

نمبر شمار	اخبار کا نام / مقام	سنِ اجراء	وقفہ اشاعت	مدیر
64۔	ساون	1971	پندرہ روزہ	راز امتیاز
65۔	آب و تاب	1968	ماہنامہ	مولانا نثار نگری
66۔	حنا، ڈائجسٹ، وانمباڑی	1973	ماہنامہ	ملک العزیز (نگراں)
67۔	مسلم رپورٹ	1975	ہفت روزہ	قمر سعید
68۔	ہمنشین، مدراس	1975	ہفت روزہ	بدر حیدر آبادی
69۔	اقبال	1952	سالنامہ	اکبر الدین کمال مدراسی
70۔	فانوس خیال		سالنامہ	اے جلال الدین
71۔	صغیر، ویلور	1969	سالنامہ	مولانا راہی فدائی
72۔	اللطیف، ویلور	1970	سالنامہ	پی محمد ابوبکر یلیباری، بشیر الحق قریشی
73۔	شرر (بیادگار شرر آلندوری)	1950	ہفت روزہ	ایم اسلم دھرمپوری
74۔	اتحاد	1952	ہفت روزہ	سید اسمٰعیل
75۔	آشیاں کے تنکے، وانمباڑی		ماہنامہ	مدراسی محمد یعقوب وانمباڑی
76۔	صداقت، وانمباڑی		ماہنامہ	مدراسی محمد یعقوب
77۔	ادبی رپورٹ	1978	ہفت روزہ	راز امتیاز
78۔	تمل ناڈو ٹائمز	1971	ہفت روزہ	محمد عبدالوہاب صوفی
79۔	شعلہ (فلمی) وانمباڑی	1949	ماہنامہ	تبسم رشید
80۔	زحل، وانمباڑی	1974	ہفت روزہ	
81۔	ہندوستان، مدراس	1947	ہفت روزہ	عبدالجبار
82۔	نقیب، مدراس	1950	روزنامہ	غلام محی الدین
83۔	نکتہ نظر، مدراس	1987	ماہنامہ	سید عظمت

فن خطاطی اور کتابت

کتابت کا فن تامل ناڈ میں کس نے اور کب شروع کیا اس کا صحیح تعین کرنا بہت دشوار کن امر ہے۔ لیکن اتنی بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس فن کو خاص لگن اور انہماک سے اپنانے والوں اور اس میں اپنے جوہر دکھانے والوں کا کارواں آج کل بھی تامل ناڈو میں مدراس سے آرکاٹ، وشارم، ویلور، پرنام پیٹ، آمبور، وانمباڑی اور ترپاتور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس فن کے قدیم اور بہترین نمونے آج بھی مدرسۂ محمدی، دیوان صاحب باغ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

مدرسۂ محمدی کے کتب خانے کے بیش بہا اور نایاب نسخوں کو دیکھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ "قاضی بدرالدولہ" کے خاندان کے اکثر افراد فن خطاطی اور خوش نویسی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ اس خاندان کے ہر فرد کو خوش نویسی کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس خاندان کے سیکڑوں قلمی نسخے مدرسۂ محمدی کے کتب خانے کی زینت بنے ہوتے ہیں۔

مولوی حاجی ابو احمد حسین عطاء اللہ (ولادت 30 شعبان 1260ھ بمقام مدراس) فرزند ارجمند قاضی بدرالدولہ نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب "تقریب التہذیب" کا قلمی نسخہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھا ہے۔ احمد حسین عطاء اللہ[1] اپنے دور کے

---

[1] آپ اپنے بھائی مولوی مفتی محمد سعید خاں کے ہمراہ 1286ھ میں حیدرآباد گئے اور وہیں 1327ھ میں انتقال ہوا۔

ممتاز خطاط تھے۔ آپ کی لکھی ہوئی چند کتابوں سے اس دور کی خطاطی اور خوش نویسی کی بلند مذاقی کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کے دور میں اور بھی کئی خوش نویس حضرات موجود تھے جن میں حاجی احمد علی شوق، محمد حسین خاں راقم، ندیم اللہ خاں ندیم، غلام محی الدین معجز (مولانا باقر آگاہ جانشین) اور عبدالقادر ناظر کے نام قابل ذکر ہیں۔

قاضی بدرالدولہ کے خاندان کے افراد کا محبوب مشغلہ عربی اور فارسی کے ضخیم مسودوں کی نقل نگاری اور خوش نویسی تھا۔ دینی علمی اور ملی خدمات انجام دینے میں جہاں اس خاندان کے حضرات نے نت نئے جوہر دکھائے تھے وہاں فن شاعری اور کتابت کے فن کو بھی روشنی اور جلا بخشنے میں اپنی استعداد اور بھرپور قابلیت کے چراغ جلائے تھے

1160 اور 1180 ھ کے درمیان مولوی ندیم اللہ خاں ندیم فارسی زبان کے اچھے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ فن خوش نویسی کے استاد بھی مانے جاتے تھے اس فن کو حاصل کرنے کے لئے مولوی ندیم نے بہت سے استادوں کی شاگردی اختیار کی تھی۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند غلام محی الدین معجز (المتوفی 1229 ھ) اور آپ کے پوتے عبدالقادر ناظر (المتوفی 1243 ھ) نے اس فن میں بھرپور دسترس حاصل کی اور بہت مشہور ہوئے عبدالقادر ناظر فرزند محمد حسین (المتوفی 1299 ھ) کو یہ فن ورثہ میں ملا تھا ان کے لکھے ہوئے (1250 ھ سے 1293 ھ کے درمیان) عربی اور فارسی کے نسخے آج بھی ان کے پاکیزہ خط کے ضامن ہیں۔

فن خطاطی کے تعلق سے حضرت سید محمد حبیب اللہ (المتوفی 1292 ھ جنھیں سرکار والاجاہی نے 1254 ھ میں نائب مفتی کی خدمات پر مامور کیا تھا اور بعد میں چیف قاضی بھی بنے) کا نام بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔ آپ نے فن خطاطی مولوی احمد صاحب سے سیکھا اور اس میں مہارت تامہ حاصل کی تھی۔

1319 ھ / 1900ء اور 1370 ھ / 1950ء کے درمیان جو خطاط تامل ناڈو کی سرزمین سے ابھرے اور اپنی کتابت کے کمالات کا روشن اور زندۂ جاوید ثبوت مدراس کے علمی، ادبی، دینی اور شعری دنیا میں چھوڑ گئے ہیں ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

جان عالم خاں عاشق، اولیا صاحب، سید تاج الدین، عبدالعزیز، سعد الدین سعد،

سید جلال الدین گھائل، محمد مخدوم، عبدالغنی خاں گھائل، مولانا فانی ترپاتوری، محمد اسمٰعیل پہلوان، سید شمس الدین حق آمی، غلام رسول امین، سید پیران، محمود دلبتے، عبدالقادر، عبدالحی، محمد ابراہیم، سید مجیب، محمد اکبر (جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے) نثار نگری ابوالبرکات انور، چاند بھائی، عبدالرزاق، زکریا امین، خطیب محمد یعقوب، خطیب عبدالجبار۔

بیسویں صدی میں آزادی سے پہلے جن کاتب حضرات نے فن خطاطی کے میدان میں اپنی اعلیٰ قدر فن کاری کا مظاہرہ کیا تھا ان میں خطیب محمد یعقوب، زکریا امین، عبدالجبار، عبدالغنی خاں مائل وغیرہم کے نام اس اعتبار سے بھی قابل قدر ہیں کہ یہ حضرات کتابت کے فن کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو زبان کے عالم اور فاضل بھی تھے 1950ء کے بعد 1980ء تک جو حضرات آج بھی بقید حیات ہیں اور فن خطاطی کا چہرہ پُرنور کرنے میں مصروف ہیں۔ ان میں عبدالعزیز عادل، محمد نور خاں، خطیب عبدالغفور، شمس ویلوری فضل الرحمٰن، شریف برکاتی، محمد یعقوب، کاظم نائطی، سالک نائطی، عبداللہ باقوی، عبدالرحمٰن باقوی قاسمی، محمد معین الدین شمسی کے نام پیش پیش ہیں۔

مندرجہ بالا اکثر کاتب حضرات مدراس، ویلور، میل وشارم، آمبور، وانمباڑی سے نکلنے والے روزناموں، ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہناموں میں کتابت کے فرائض انجام دے چکے ہیں اور بعض حضرات رسائل کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔

تصنیفات اور تالیفات کا سلسلہ

تامل ناڈو کی تین سو سالہ ادبی تاریخ میں تصنیفات اور تالیفات کا ایک ایسا شاندار اور ناقابل فراموش یادگار سلسلہ چلا ہے جس کے احاطے اور تجزیہ سے مختلف گم نام گوشے نمایاں ہو سکتے ہیں۔ مدراس ہندوستان کے ان بڑے شہروں میں سے ایک ہے جس کی سیاسی، ادبی اور ثقافتی افادیت و اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

تامل ناڈو کے اہل قلم نے کبھی اس خواہش پر اپنی تخلیقی صلاحیت کو قربان نہیں کیا کہ ان کی تخلیقات کا مجموعہ منظر عام پر آئے اور وہ شہرت کے افق کو چھو لیں۔ لیکن تامل ناڈو کی ادبی تاریخ میں ایک ایسا دور بھی آیا ہے کہ جب یہاں کے فن کاروں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ اگر وہ اپنے ذہنی اور ادبی سرمائے کو کتابی صورت میں محفوظ نہ کریں تو وہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں تلف ہو کر رہ جائے گا یا اس پر مہ و سال کی ایسی دبیز گرد جم جائے گی جس سے خود فن کار کے خدو خال کی پہچان میں کئی مرحلے پیش آئیں گے۔

مولفِ تذکرہ کو آج یہ لکھتے ہوئے واقعی بہت صدمہ ہو رہا ہے کہ مدراس کے سرمایہ دار طبقے کی تجوریوں کے دروازے شمال سے آنے والے واعظوں کے لئے کھلتے رہتے ہیں اور اس طبقے نے واعظوں کی خدمات بجا لانے میں اپنا قیمتی وقت جس فراخ دلی سے نچھاور کیا اس کی نظیر سارے ہندوستان میں کہیں اور نہیں ملتی۔ لیکن اہل ثروت حضرات کا یہ ظالمانہ رویہ ہمیشہ پردے میں رہا کہ انھوں نے خود اپنے دور کے عظیم فن کاروں

اوران کے فن پاروں کی کبھی قدر نہیں کی۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی یہ مار پتہ نہیں مدراس کے کتنے عظیم فن کاروں پر پڑی اور وہ گمنامی کے غار میں دب کر رہ گئے۔ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اپنے دور کے عظیم شاعر مرزا غالب کے ہم عصر شہیر استاد شریف مدراسی نے بھی اس نازیبا رویے کا شکار ہوتے ہوئے دل برداشتہ کہا ہے ؂

مدراس سا ناقدر کوئی شہر نہیں

آج بھی ہمارے بہت سارے محقق، ادیب اور شعراء کے کارہائے نمایاں گرد آلود ہو کر دیمک کی غذا بننے کے لئے مضطرب ہیں۔ شاید ہمارے بے حس سرمایہ دار طبقے کو بھی اس دن کا انتظار ہے۔

میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا ابوالجلال ندوی کے تحقیقاتی مسودے[ل] (جو عمرآباد میں قیام کے دوران تیار ہوئے) آج بھی جامعہ دارالسلام میں موجود ہیں۔ ان مسودوں کو یہ عربی مدرسہ چاہے تو مہینوں میں شائع کر سکتا ہے لیکن آج تک جامعہ نے اس طرف توجہ نہیں دی ہے۔

علامہ شاکر نائطی (ناظم جامعہ دارالسلام، عمرآباد) کا زندگی بھر کا شعری اور نثری سرمایہ خود ان کے اپنے فرزندوں میں زمینی جائداد کی طرح بٹا ہوا ہے۔ علامہ نے اپنی زندگی ہی میں ایک شعری مجموعہ تیار کیا تھا جو آج تک شائع نہ ہو سکا۔ علامہ کے تمام فرزند مالی طور پر اچھی حالت میں ہیں لیکن انھوں نے اپنے والد کے علمی و ادبی کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کی آج تک ضرورت محسوس نہیں کی۔

مولانا حکیم سید عباس آسی ترپاتوری نے بھی اپنا شعری اثاثہ مرتب کرنے کے بعد اشاعت کے لئے سرمایہ کے ساتھ اپنے شاگرد جلال کڑپوی کے حوالے کیا تھا۔ تقریباً پندرہ سولہ سال پہلے یہ گرم خبر مدراس کے ادبی ماحول میں پھیلائی گئی تھی کہ مولانا آسی کا مجموعۂ کلام ادارہ "برگِ آوارہ" حیدرآباد سے بہت جلد شائع ہو رہا ہے لیکن آج تک یہ خبر

ل مولانا نے انتقال سے ایک ماہ پہلے سید سلطان، مالک عندلیب پرنٹس (فرزند سید عظمت اللہ مالک پبلشر اور پرنٹر روزنامہ "مسلمان" مدراس) پاکستان گئے تھے تو ان کی وساطت سے ان مسودوں کی اشاعت کے متعلق ایک خط کاکا عمر کے نام بھیجا تھا۔

ہمارے لئے "خبر" ہی نہی رہی ۔ جلالؔ کڑپوی کا کہنا ہے کہ جو رقم مولانا نے اپنے دیوان کی اشاعت کے لئے ان کے پاس چھوڑ رکھی تھی وہ ان کے فرزند لے گئے غالباً حضرت آسیؔ کو خدشہ تھا کہ ان کے فرزند یہ کام انجام نہیں دیں گے، اس لئے یہ ذمہ داری اپنے ایک شاگرد کو سونپی ۔ فرزند سنگ دل نکلے اور شاگرد غیر ذمہ دار ۔

حضرت دانشؔ فرازی نے 1958ء اور 1960ء کے درمیان (حضرت شاداں وشارمی کی معیت میں صدیق سرائے میں قیام کے دوران) مولانا عبدالمجید شررؔ آلندوری پر جو پُر مغز تحقیقی مقالہ بنام "نقش دوام" لکھا تھا اس کا مسودہ آج تک مولانا محوی صدیقی کے فرزند اور شاداں و شارمی کے داماد پروفیسر حامد حسین صدیقی کے صندوق میں قید ہے ۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ حضرت دانش فرازی کا یہ تحقیقی کارنامہ منظر عام پر آجائے لیکن آج تک ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا ۔ اگر یہ مسودہ شائع ہو جائے تو حضرت دانش فرازی مرحوم کی نثری صلاحیتوں کے اعلیٰ ترین اور تابندہ نقوش اجاگر ہوتے اور ساتھ ہی تامل ناڈو کے ایک عظیم صحافی کا دنیائے ادب سے صحیح تعارف ہوتا ۔

مولانا رحیم احمد فاروقی آزادؔ "آفتاب علم و ادب" کی علمی کرنیں بھی آج تک زمانے کی دھند اور خود ان کے اپنے شاگردوں اور فرزندوں کی بے توجہی کے غبار میں اٹی ہوئی پڑی ہیں ۔ مولانا نے عربی زبان کے سیکڑوں الفاظ اور دوسری زبانوں (مثلاً تامل، تلگو اور انگریزی) پر ان کے اثرات کے تعلق سے ایک تفصیلی تحقیقی کام[1] (جو فل اسکیپ کے دوسو صفحات پر مشتمل ہے) کیا تھا وہ آج بھی اشاعت کا محتاج ہے ۔ مولانا آزادؔ نے اس تحقیقی کام کے علاوہ مرزا غالبؔ کی زمینوں میں چالیس پچاس معرکتہ الآرا نظمیں لکھی تھیں ۔ یہ سرمایہ بھی ان کے وارث اور شاگرد دنیائے علم و ادب کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہتے ۔[2]

حضرت آثمؔ کرنولی کی تقریباً چار پانچ سو غزلوں کا مسودہ بھی آج تک ان کے

---

[1] مولف تذکرہ نے اس کا مخطوطہ مولانا کے مقدمہ کے ساتھ جناب سید سلطان (مالک عذرا پرنٹس مدراس) کے پاس دیکھا ہے ۔ [2] سید سلطان صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ یہ مجموعہ اشاعتی منزلوں میں ہے ۔

بھرپور مالی استعداد رکھنے والے فرزندوں کی الماریوں میں پڑا اپنی آخری تمنا اور اشاعت کا انتظار کھینچ رہا ہے۔

ادیب بھارتی، ساحل رشید، اور فرحت کیفی (شاعر اور افسانہ نگار) کی تخلیقات بھی مرحوموں کے گھروں کے صندوقوں یا الماریوں میں سڑ رہی ہیں۔ پتہ نہیں اللہ تعالیٰ ان کے ورثا کو اشاعت کی توفیق کب دے گا۔؟

محمد محی الدین عارف مدراسی کا کلام بھی ان کے اپنے بہترین دوست اور ادبی زندگی کے ہم سفر جناب شیخ احمد علی اعجاز شاکری کے پاس پڑا اشاعت کے لئے تیار ہے۔ کاش کوئی سرمایہ لگانے والا پیدا ہو جائے!

حضرت عبداللہ حسین عبد (شہر مدراس کے مشہور نعت گو شاعر) اور حضرت حیرت القادری کی شعری متاع بھی ان کے وارثوں کے پاس پڑی ہوئی ہے جنہوں نے صاحب حیثیت ہونے کے باوجود آج تک اس کی اشاعت کا بیڑہ نہیں اٹھایا ہے۔

حضرت عظمت اللہ سرمدی نے بڑی محنت اور خاص لگن سے تامل زبان کے عظیم شاعر "وتور" کی عظیم ترین نظموں کا ترجمہ اردو زبان میں کر کے ایک بڑا اہم کارنامہ انجام دیا۔ ان نظموں کا مسودہ بھی ڈاکٹر سید صفی اللہ (عابد صفی) کی نجی لائبریری میں پڑا اشاعت کے لئے بے چین ہے۔

جناب اجمل مدراسی کی غزلوں کا مسودہ حیات مدراسی کے پاس اشاعت کے لئے تیار ہے۔

حضرت فہیم آمبوری معاشی و اقتصادی اعتبار سے نہایت فارغ البال تھے اور ان کا شمار اس دور میں آمبور کے بلند پایہ رئیسوں میں ہوتا تھا انھوں نے مرنے کے بعد بھی اپنے پیچھے اتنا سرمایہ چھوڑا کہ اگر ان کے متعلقین خلوص کے ساتھ چاہتے تو حضرت فہیم کی نظموں اور غزلوں کے دو تین مجموعے شائع کر سکتے تھے اب اس کا علم بھی نہیں کہ ان کی عمر بھر کی تخلیقات کا سرمایہ کس کے پاس محفوظ ہے یا اس کے اوراق خلاؤں میں بکھر کر رہ گئے۔

تامل ناڈو کے ماحول میں کسی فن کار کا ادبی اور فنی کاوشوں کا ذخیرہ اگر اسی کی حیات میں چھپ کر منظر عام پر آجائے تو یہ بذات خود ایک اہم کارنامہ ہے ورنہ یہ توقع رکھنا کہ

ان کے بعد ان کی تخلیقات کا مجموعہ منظر عام پر آسکتا ہے ایک طرح کی خطرناک خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

میں آخر میں مدراس کے سرمایہ دار طبقے، عربی مدارس اور علمی اور ادبی اداروں سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے طور پر منظم ہو کر ان تیار شدہ علمی، ادبی، شعری اور تحقیقی مسودوں کی اشاعت کی کوئی معقول سبیل نکالیں تاکہ یہ تمام مسودے دیمک اور ماہ و سال کی گرد کی نذر ہونے سے بچ جائیں۔ اور تامل ناڈو کی تاریخ ادب میں اضافے کا باعث بنیں

میں مدراس یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بھی گزارش کرتا ہوں کہ وہ غلط سلط موضوعات پر تیسرے درجہ کی چیزیں پیش کر کے ایم فل اور پی ایچ ڈی ڈگریوں میں مدراس کے نوجوانوں کو سرفراز کرنے کی بجائے تامل ناڈو کے بڑے فن کاروں پر تحقیقی کام کرائے۔ اور ان کی علمی اور ادبی جغرافیہ کی تلاش و جستجو میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرے جس سے آئندہ نسل کا فائدہ اور ان فن کاروں کی زندگی کے پوشیدہ گوشے نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی فکری پرواز کا صحیح تعین بھی ہو سکتا ہے۔

تمل ناڈو کے عربی مدارس میں اردو کی خدمات

اردو زبان وادب کی بقار اور ترقی و ترویج میں تمل ناڈو کے عربی مدارس کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان مدارس نے عربی اور فارسی علوم کے ساتھ ساتھ ہر دور میں اردو زبان وادب کو بھی نئی رفعتیں بخشی ہیں۔ اس کے زندہ جاوید ثبوت ان مدارس سے شائع شدہ علمی وادبی جریدے ہیں جو آج بھی بالالتزام سالناموں کی شکل میں منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔ ان جرائد میں دینی، علمی اور معلوماتی مضامین کے ساتھ اردو شعر وادب کے اعلیٰ نمونے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان مدارس کے اساتذہ اور طلبار نے جہاں دینی علوم کی طرف خاص توجہ دی وہیں اردو شعر وادب کے خزانے کو بھی مالا مال کیا ہے ۔ ان مدارس نے علاقائی طور پر علم دین اور شعر وادب کی خدمت کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی تمل ناڈو کا علمی اور ادبی پرچم بلند کیا ہے۔ علم وادب کا کوئی بھی مورخ ان عربی مدارس کی خدمات اور ان کے کارناموں سے اغماض نہیں برت سکتا۔

تمل ناڈو کے چند اہم عربی مدارس کا اب یہاں مختصر ذکر کر رہا ہوں۔

الباقیات الصالحات

بقول حضرت مولانا محمد جعفر حسین فیضی صدیقی باقوی

" 1857 کے غدر نے اسلام اور مسلمانوں کو نہایت عظیم نقصان پہنچایا۔ انگریزوں

نے اسلام کے استیصال میں کوئی کسر چھوڑی۔ یہاں تک کہ اس کا قلع قمع ہو کر رہ گیا۔ سرزمین ہند میں اسلامی سلطنت کا پرچم سرنگوں ہو گیا۔ جہاں اسلامی شان و شوکت کا طوطی بول رہا تھا وہاں ان کھنڈرات پر سامراجی الو بولنے لگا تھا۔ جہاں اسلامی جاہ و جلال کے نقارے بج رہے تھے۔ وہاں سامراجی اقتدار کے تازیانے بجنے لگے تھے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا دیوالہ نکل چکا تھا۔ اور علمار دین کا قحط الرجال تھا اسلامی دنیا منتظر تھی کہ "مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند"

"ایسے بحرانی دور میں چند راسخ الاعتقاد علمائے صالح اپنی بے پناہ حوصلہ مندی اور مستقل عزمی سے اسلام کی گرتی ہوئی دیوار کو تھامنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے جابہ جا دین کی اشاعت کرنا اور اپنے اپنے گھروں میں دینی تعلیم دینا شروع کی۔ اس وقت ہر مقتدر عام کا گھر دینی درسگاہ تھا۔ بعد کو انھوں نے اپنے اپنے طور پر مختلف علاقوں میں دینی مدارس قائم کئے جو اسلام کی بقار و سرخروئی میں آہنی قلعوں کا کام دے رہے ہیں؛

انھیں بزرگوں میں سے ایک زبدۃ الاولیار فہامۂ دوراں شمس العلمار اعلیٰ حضرت عبدالوہاب شاہ قادری قدس سرہ العزیز تھے جنھوں نے جنوبی ہند میں مادر علمی مدرسۂ الباقیات الصالحات ویلور کی بنیاد رکھی جس کی عمر آج بفضلہ تعالیٰ ایک صدی سے زیادہ ہو گئی ہے۔

اس مدرسہ کو ام المدارس کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کیونکہ اس کے فیضان سے جنوبی ہندوستان کے مختلف مقامات میں کئی عربی مدارس قائم ہوئے۔ باقیات کی شہرت ہندوستان سے نکل کر بیرونی علاقوں مثلاً مالدیپ، جاوا، سماٹرا، سنگاپور وغیرہ میں بھی پہنچی جہاں سے کثیر تعداد میں طلبار تحصیل علم کے لئے آنے لگے۔ ہزاروں فرزندان باقیات آج بھی دنیا کے گوشے گوشے میں علم اور دین کی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس سے فیضان حاصل کرنے اور اردو زبان و ادب کی خدمات کرنے والی بعض ممتاز شخصیتیں حسب ذیل ہیں۔

مولانا حبیب اللہ ندوی، مولانا عبدالسلام کمالی ویلوری، مولانا سید عبدالجبار صاحب، مولانا نثار احمد فدوی باقوی، حضرت مولانا جعفر حسین فیضی صدیقی، مولانا اشرف علی

اشرف سوی، مولانا ظہیر احمد راہی فدائی۔

خاص طور پر اردو زبان وادب کی خدمت کے لئے اس مدرسہ نے "انجمن ترقی اردو" کی (اس انجمن کا دہلی کی انجمن سے کوئی تعلق نہیں ہے) بنیاد رکھی اور اس انجمن کے زیر اہتمام ایک سالنامہ "صغیر" کا اجرا بھی عمل میں آیا جو آج بھی باقاعدہ شائع ہو رہا ہے اس انجمن کے تحت وقتاً فوقتاً ادبی اور شعری محفلیں بھی منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ اسی مدرسہ کے دارالاشاعت سے مندرجہ ذیل کتابیں منظر عام پر آئیں۔

1 مجدد جنوب ۔ مولف مولانا فدوی باقوی
2 الباقیات صد سالہ نمبر
3 نئی کلیاں (بچوں کے لئے) مصنف مولانا حافظ باقوی
4 حیات ترمزی ۔ مولف مولانا محمد حسین باقوی مدنی

ادارۂ صغیر کی جانب سے جو کتابیں منصۂ شہود پر آئیں وہ حسب ذیل ہیں:

1 باقیات ایک جہاں ۔ مولف مولانا ظہیر احمد راہی فدائی
2 تصنیف (شعری مجموعہ) مصنف مولانا ظہیر احمد راہی فدائی
3 انامل (شعری مجموعہ) مصنف مولانا ظہیر احمد راہی فدائی
4 جان پدر ۔ مولف مولانا سید شاہ عبد الجبار قادری باقوی
5 عبرت ونصیحت (جلد اول اور دوم) ۔ مولف مولانا جعفر حسین فیضی صدیقی
6 مضامین تفسیر ۔ مولانا سید شاہ عبد الجبار قادری باقوی
7 تفسیر ام الکتاب ۔ مولانا سید شاہ عبد الجبار قادری باقوی
8 اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ ۔ مولانا سید شاہ عبد الجبار قادری باقوی

دارالعلوم لطیفیہ

دارالعلوم لطیفیہ (حضرت مکان ویلوری) اس مدرسہ کی بنیاد 1140ھ اور 1150ھ کے درمیانی عرصے میں حضرت مولانا عبد اللطیف قادری رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک ہاتھوں رکھی گئی۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں آپ کی اولاد امجاد کے ذریعے اس کی توسیع ہوئی۔ حضرت مولانا ابو الحسن قربی قادری ویلوری رحمۃ اللہ علیہ نے 1179ھ میں خانقاہ

تعمیر فرمائی جس کے متعلق حضرت باقرؔ آگاہ ویلوری نے تاریخی قطعہ نکالا۔

اے خانقاہِ نوکہ دہد شرح صدور
دل تازہ کند دیر تنگ کعبہ زسرور
گفتند ملک بہ چرخ کایں قبۂ نور
والطور سینین لبیت المعمور

بقول مولوی حافظ ابو النعمان محمد بشیر الحق قریشی قادری ادھونی "یہ خانقاہ صرف صوفیانہ سلوک کی تربیت گاہ نہ تھی بلکہ اس عہد کے مزاج اور ماحول کی مناسبت سے قرآن وحدیث کی درسگاہ، علوم وفنون کا دار العلوم مصالح عوام اور فقہی مسائل کے لئے دار الافتار دعوت وتبلیغ کے لئے افراد سازی کا قلعہ اور شعر وسخن کی بزم تھی"

حضرت مولانا غلام محی الدین سید شاہ عبد اللطیف ذوقی قادری ویلوری نے ایک دار الاقامہ کی بنیاد ڈالی۔ اور حضرت مولانا سید شاہ ابو الحسن محوی قادری ویلوری نے ایک عالیشان عمارت تعمیر فرمائی جس کا تذکرہ حضرت مولانا عبد الحئ واعظ بنگلوری نے اپنی منظوم کتاب مثنوی "مطلع النور" میں کیا ہے۔

"مجدد جنوب" علامہ شاہ محی الدین سید شاہ عبد اللطیف المعروف بہ قطب ویلور نے دار العلوم لطیفیہ کو ایک دعوت وتحریک کا روپ دیا۔ حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری ویلوری نے ندوۃ العلماء کی تحریک کی نصرت وحمایت میں قدم اٹھایا۔ مولانا موصوف نے دار العلوم لطیفیہ کی نشاۃ ثانیہ فرمائی۔ مولانا ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری ویلوری اور حضرت ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری ویلوری اور خانوادۂ حضرت مکان کے دیگر اکابرین نے اس مدرسہ کو علم دین کے ساتھ دیگر علوم وفنون کا بھی ایک عظیم مرکز بنا دیا۔ یہ اکابرین خود بھی اپنے اپنے دور کے جید عالم، ادیب اور شاعر تھے۔ اور اپنے وابستگان دامن کو بھی علم وادب کا سرچشمہ بنا کر چھوڑا۔ اردو ادب کے عظیم ستون حضرت باقر آگاہ ویلوری سید شاہ عبد الغفار قادری چشتی مسکین، حضرت علامہ شاکر نائطی، حضرت مولانا عبد الحی واعظ بنگلوری، اور کئی دوسرے شعراء وادباء اس منبع نور سے اکتساب نور کرتے رہے حضرت مکان سے براہ راست نہ سہی بالواسطہ اکتساب نور کرنے والوں میں ہم مولانا

اسمٰعیل رفیعی، حضرت دانش فرازی، جناب کاوش بدری، جناب راز امتیاز اور دوسرے کئی ممتاز شعراء و ادباء کے نام لے سکتے ہیں۔

دارالعلوم لطیفیہ میں تصنیف و تالیف کی اشاعت کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ مخطوطات پر بھی تحقیقی کام ہوتا ہے۔ دارالعلوم سے سالنامہ "اللطیف" کا اجرا بھی ہوا جو تقریباً تیس سال سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔ اس سالنامہ کے ذریعہ علوم دین کے ساتھ شعر و ادب کی بھی نمایاں خدمت انجام ہوتی رہی ہے۔

مدرسۂ منبع الانوار

1864ء / 1281ھ میں لال پیٹ، جنوبی آرکاٹ میں یہ عربی مدرسہ قائم ہوا اس مدرسہ کا اہم مقصد یہ تھا کہ تمل ناڈو کے تمل زبان بولنے والے مسلمانوں کو تمل زبان کے ذریعے عربی زبان اور قرآنی تعلیم سے واقف کرانا تھا۔ مولانا ضیاء الدین امانی پلّی گنڈوی (المتوفی 1967ء) اس مدرسہ کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ مدرسہ آج بھی جاری ہے۔

مدرسۂ معدن العلوم اور مدرسہ مفیدِ عام

اس مدرسہ کی بنیاد 1887ء / 1304ھ میں وانمباڑی میں عربی، فارسی اور اردو علوم کے فروغ کے لیے رکھی گئی۔ مولانا مولوی محمد صادق اس مدرسہ کے پہلے پرنسپل 1888ء / 1305ھ میں مقرر ہوئے جو الازہر یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس مدرسہ سے فیضیاب ہونے والوں کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ بحیثیت مجموعی اس مدرسہ کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔

مدرسۂ محمدی

26 فروری 1892ء رجب 1309ھ میں ترازش خان بہادر نے عربی اور فارسی کے علاوہ دینیات کی تعلیم کے فروغ کے لئے یہ مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسہ کی تعمیر کے لئے قاضی بدرالدولہ نے زمین وقف کی تھی۔ مولوی حاجی صدارت خان بہادر، مولوی محمد عنایت خان بہادر، حاجی نظام احمد منتظر جنگ بہادر، حاجی نصیر الدین عبدالقادر امیر نواز جنگ بہادر،

مولوی مفتی سید خان بہادر، شمس العلماء قاضی عبید اللہ وغیرہم اس مدرسہ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اس مدرسہ کے صدر الصدر مولوی محمد عبید اللہ صدارت خان بہادر (ولادت 1236ھ) تھے۔ یہ مدرسہ نواب غوث خان اعظم کے آخری دور میں عربی اور فارسی علوم کا منبع نور تھا۔ اس نور سے فیضیاب ہونے والی شخصیتوں کی خدمات کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اس مدرسہ کے علماء وفضلاء نے جو علمی اور تحقیقی خدمات انجام دیں ان کے زندہ جاوید نقوش آج بھی مدرسہ محمدی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ اس دور میں عربی اور فارسی میں جتنی کتابیں لکھی گئیں اس کی نظیر خال خال ہی ہندوستان کے نقشہ میں ملے گی۔

مدرسۂ جمالیہ

1900ء/ 1318ھ میں عربی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے جمال محی الدین تاجر چرم نے اس مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ مولانا مدار صاحب اس مدرسہ کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مولانا مدار صاحب کے وصال (1925ء/ 1344ھ) کے بعد سید علوی، مولانا محمود الحسن خسرو، مولانا سید ابوظفر ندوی، مولانا سید عبد الوہاب بخاری اور مولانا ابراہیم جیسے جید علماء نے اس مدرسہ کی پرنسپل شپ کے فرائض انجام دیئے یہ ہندوستان کا واحد اور پہلا مدرسہ تھا جس میں عربی زبان اور اسلامک سائنس کی تعلیم عربی زبان میں رائج تھی۔ یہ مدرسہ اس یونیورسٹی سے Affileate ہونے کی وجہ سے بہت سے Scholar اس مدرسہ سے مستفیض ہوئے 1925ء میں اس مدرسہ کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندوی مدراس تشریف لائے اور اس مدرسہ میں مولانا نے اپنے قیام کے دوران رسول عربی کی زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے چھ موثر تقاریر سے مدرسہ کے احباب کو سرفراز فرمایا۔ آگے چل کر موصوف کی یہ تقاریر کتابی صورت میں بنام خطبات مدراس منظر عام پر آئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد ڈاکٹر سید محمد اقبال بھی بانی مدرسہ حاجی محی الدین (المتوفی 1925ء/ 1342ھ) کی دعوت پر مدراس آئے اور آپ نے بھی اسلام سے متعلق اس مدرسہ میں تقاریر کیں۔ ان تقاریر کا ایک کتابچہ اسلام میں مسلم خیالات کی ازسر نو تشکیل Reconstruction

منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ of Muslim Thoughts

جامعۂ دارالسلام، عمرآباد

1924ء میں جامعہ دارالسلام کا قیام توحید کی اشاعت اور مذہب و ملت کی خدمت کے لئے عمل میں آیا تھا۔ اس کے بانی کاکا حاجی محمد عمر نور اللہ مرقدہ تھے۔ آپ بڑے ولی صفت اور روشن خیال تھے۔ محض رضائے الٰہی کے لئے دارالسلام کی بنیاد رکھی اور اس کے قیام کے تین سال بعد 1927ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ان کے بعد آپ کے خلف الرشید خان بہادر کاکا حاجی محمد اسمٰعیل مرحوم نے دارالسلام کے ابھرتے ہوئے پودے کو اپنے خون سے سینچ کر ایک ایسا تناور درخت بنایا جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں آج بھی ہزاروں تشنگانِ علم دین آرام و سکون کی پیاس بجھا رہے ہیں۔ آج بھی ہزاروں طلبا سیلون، ملیشیا، نیپال اور افریقہ سے اس جامعہ میں داخلہ لے کر بھرپور علم حاصل کرنے کے بعد اپنی اپنی بستیوں میں دارالسلام قائم کر کے دین کی خدمت کر رہے ہیں خوشی اس بات کی ہے کہ آج اس جامعہ کے بچے حجاز مقدس، افریقہ، اور امریکہ اور جنوبی ایشیا کے کئی ملکوں میں دین کی تعلیم دے رہے ہیں۔ کاش آج کاکا محمد عمر صاحب بقید حیات ہوتے تو اس منظر کو دیکھ کر مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے اللہ تعالیٰ اس عظیم ہستی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین۔

آج بھی جامعہ دارالسلام، عمرآباد اور جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ کے روابط اتنے گہرے ہیں جس کا ثبوت جامعہ دارالسلام کی وہ تصویریں ہیں جو آج بھی جامعہ اسلامیہ کی لائبریری میں آویزاں ہیں۔ یہ جامعہ دارالسلام کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔

اس جامعہ سے فارغ ہونے والے آج پورے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی درس و تدریس اور دعوت و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ 1979ء میں عمرآباد کا وفد عرب ممالک کے دورے پر گیا تو ہر جگہ اس کا پرخلوص اور شایان شان خیر مقدم کیا گیا۔ اور جامعہ اسلامیہ نے اس کی اتنی قدر و منزلت کی جس کا اظہار لفظوں میں ناممکن نہ سہی لیکن دشوار ضرور ہے۔

کاکا خاندان کا یہ احسان عظیم ہر دور میں سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔ اس مدرسہ کے اساتذہ اور فارغ التحصیل طلبار کی فہرست جنھوں نے علم و ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں بہت طویل ہے۔ جن میں سرفہرست حضرت علامہ غضنفر حسین شاکر نائطیؒ ہیں جو اس مدرسے کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے (شعرا کے تذکرے میں ان کی خدمات ملاحظہ فرمائیے) مولانا سروش داودی عمری، عبدالرحمٰن آشنہ، مولانا محمد یوسف کوکن، مولانا سید عظمت اللہ سرمدی، مولانا اسمٰعیل رفیعی، مولانا ابوالبیان حماد، مولانا سالک نائطی، مولانا فہمی کرشنگری، مولانا عبدالقادر ندیوی، مولانا اللہ بخش نوری، مولانا محمد زکریا امین عمری، مولانا ادیب خاور، مولانا اوج کشنگری، تمنا یوسفی، ڈاکٹر حکیم عزیزالرحمٰن رونق اعظمی، جناب محمد یعقوب اسلم، عبدالغفار فوقی نائطی وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا علامہ غضنفر حسین شاکر نائطی نے یہیں سے ماہنامہ مصحف نکالا تھا جس کا تفصیلی ذکر "تمل ناڈو میں اردو صحافت" کے باب میں آئے گا۔

ان عربی مدارس کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لئے مدراس کے اور بھی بہت سارے ہائی اسکول، پرائمری Primary اسکول اور کالج نے بہت اہم رول ادا کئے ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

1۔ مدرسہ اعظم، مونٹ روڈ، مدراس 2۔
2۔ مسلم ہائی اسکول، ٹرپلی کین، مدراس 5
3۔ ہوبارٹ ہائی اسکول (زنانہ) مدراس 14
4۔ جارج ٹاؤن ہائی اسکول (زنانہ اور مردانہ) مدراس 1
5۔ کارپوریشن ہائی اسکول، سمٹری روڈ، مدراس 21
6۔ مرتضویہ اورینٹل ہائی اسکول، مدراس 5
7۔ مظہر العلوم ہائی اسکول، آمبور
8۔ اسلامیہ ہائی اسکول، وانمباڑی
9۔ گورنمنٹ مسلم ہائی اسکول، ویلور
10۔ حبیبیہ ہائی اسکول، آمبور
11۔ عبیعباسں ہائی اسکول، ترپاتور۔

12۔ اسلامیہ ہائی اسکول، وشارم
13۔ اسلامیہ ہائی اسکول، پرنام پیٹ
14۔ حاجی عیسیٰ اَیا سیٹھ ہائی اسکول، مدراس 1
15۔ آرٹس کالج، مدراس 14
16۔ نیو کالج، مدراس 14
17۔ ایس۔آئی۔ای۔ٹی (S.I.E.T) کالج (زنانہ)
18۔ اسلامیہ کالج، وانمباڑی، شمالی آرکاٹ
19۔ سی عبدالحکیم کالج، وشارم، شمالی آرکاٹ
20۔ جمالیہ کالج، ترچناپلی
21۔ وقف بورڈ کالج، مدورے
22۔ پریسیڈنسی کالج، مدراس 5
23۔ کوئینس میری کالج (زنانہ)، مدراس 5
24۔ قائد ملت آرٹس کالج (زنانہ)، مدراس 2
25۔ اوریس کالج، ویلور
26۔ آرٹس کالج، کشنگری،
27۔ گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول۔ کشنگری۔
28۔ گورنمنٹ آرٹس کالج۔ ترِیام
29۔ میونسپل ہائر سکنڈری اسکول گڑیاتم
30۔ عثمانیہ ہائی اسکول۔ ترپاتور
31۔ گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول۔ ترپاتور
32۔ الامین میٹریکولیشن ہائر سکنڈری اسکول۔ ترپاتور
33۔ فاطمہ میٹریکولیشن اسکول۔ وانم باڑی
34۔ ھدیٰ میٹریکولیشن اسکول۔ وانم باڑی
35۔ ٹی۔عبدالواحد میٹریکولیشن ہائر سکنڈری اسکول۔ آمبور
36۔ حسناتِ جاریہ ہائر سکنڈری اسکول (گرلز) آمبور

افسانے کا فن

تامل ناڈو کا افسانوی ادب اپنی متنوع خصوصیات کی بنا پر قابل ذکر سہی لیکن عمر، رفتار اور نشو و نما کے اعتبار سے شاعری کے برعکس در خور اعتنا نہیں چونکہ تمل ناڈو کے فن کاروں نے جہاں عصری ادب اور نئے رجحانات کو لگن، انہماک اور دلچسپی سے اپنایا وہیں دوسری اصناف ادب سے قطع نظر افسانہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی۔ افسانہ، ناول اور ڈرامہ کی اصناف نے کل ہند سطح پر ترقی کے جو مراحل طے کئے، میرے اپنے علم کے مطابق تمل ناڈو ان اصناف ادب کو اپنانے میں دوسری ریاستوں کی بہ نسبت بہت پیچھے ہی رہا۔

یہاں کی صد سالہ تاریخ کا تدریجی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پچھلے بیس تیس سال کے عرصے میں کوئی ایسا افسانہ نگار تامل ناڈو کی سرزمین سے نہیں ابھرا جس کو ہم کرشن چندر، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، عصمت اور احمد ندیم قاسمی کی صف میں کھڑا کر سکیں۔ جتنی سج دھج اور دھوم دھام سے یہاں شاعری ہوئی ہے اس مقام کو افسانوی ادب نے نہیں چھوا پھر بھی خوشی کی بات یہ ہے کہ یہاں کے بعض فن کاروں نے سنجیدگی کے ساتھ صنف افسانہ نگاری کو بھی اپنانے کی کوشش کی جن میں بعض کی تخلیقات ہندوستان کے مختلف جرائد میں شائع بھی ہوئی ہیں۔

اس بات کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہے کہ تامل ناڈو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ اردو کی بہ نسبت تامل کا افسانوی ادب اتنا اونچا اور معیاری رہا ہے کہ تامل افسانوں کا ترجمہ

کئی زبانوں میں ہو چکا ہے خصوصاً میدان سیاست کے شہسوار اور دانائے راز آنجہانی شہری راج گوپالاچاری کے مختصر تامل افسانوں نے کافی مقبولیت حاصل کی اور کئی زبانوں میں ان کے افسانوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ مشکل یہی ہے کہ تامل ناڈو میں اردو اور تامل فن کاروں کے درمیان نہ کوئی ادبی اشتراک ہے نہ کوئی فکری ہم آہنگی۔ اس بنیاد کا سبب یہ ہے کہ اکثر اردو کے فن کاروں کا یہ حال ہے کہ انھوں نے کبھی تامل ادب سے دلچسپی لی نہ اس زبان کی تخلیقات سے استفادہ کرنے کا رجحان ان میں پیدا ہوا۔

تامل ناڈو کے اردو افسانوی ادب کی عمر زیادہ نہیں ہے لیکن اس قلیل مدت میں بھی یہاں کے افسانہ نگاروں نے زمانہ کی بدلتی ہوئی قدروں اور تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تخلیقات میں انفرادیت پیدا کی ہے جو یقیناً قابل تحسین ہے۔ انھوں نے اردو کو بہت کچھ نہ دیا ہو لیکن جو کچھ دیا ہے یہ سرمایہ بھی تامل ناڈو کے ماحول، حالات اور افتادِ طبع کے پیش نظر بہت غنیمت ہے۔ ذیل میں چند افسانہ نگاروں کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

ادیب بھارتی

ادیب بھارتی کو مرحوم لکھتے ہوئے خامہ خوں چکا ہوتا ہے تو انگلیاں فگار —
وہ زندہ دل باغ و بہار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے زندگی بھر اردو کی خدمت کی فن کے حق کو پہچانا اور اپنی تخلیقات کو اپنے لہو کے ایک ایک قطرے کا حساب دیا۔ ادیب بھارتی تامل ناڈو کا وہ پہلا فن کار ہے جس نے تند جذبات اور شدت احساس کے ساتھ نظم جدید کو اپنایا۔ دراصل وہ پہلے شاعر تھا اور بعد میں افسانہ نگار۔ اس کے اندر جو افسانوی خصوصیات پنہاں تھیں وہ اس کی نظموں سے عیاں ہوتی تھیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے اپنے مزاج کی افتاد اور اپنی طبیعت کے تقاضے کو پہچانا تا پھر افسانہ نگاری کی طرف اس خطرناک حد تک توجہ دی کہ آخر کار افسانہ لکھتے لکھتے وہ خود ایک افسانہ بن گیا۔

راز امتیاز

راز امتیاز جہاں شاعر، صحافی، اور نقاد ہیں وہاں افسانہ نگار بھی ہیں۔ اگرچہ انھوں

نے صنف افسانہ نگاری کو اپنا موضوع نہیں بنایا لیکن اپنی افتادِ طبع کے پیشِ نظر انھوں نے ایسے افسانے بھی اردو ادب کو دیئے ہیں جن سے ان کے ذہن و فکر اور فنی صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔ رآز امتیاز کے افسانوں میں نفسیاتی تحلیل کے ساتھ ایک ایسا لطیف عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ جس میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کے ذہن کی سطح پر سوچ کی جو لہر ابھرتی ہے وہ بتدریج جانے پہچانے آفاق کو چھو جاتی ہے۔ رآز امتیاز کے افسانوں کے دریچوں سے چھلنے والی روشنی کبھی دھند کی شکل اختیار کرتی ہے تو کبھی صبح درخشاں۔ رآز امتیاز ابلاغ خیال کے سلسلہ میں ڈنڈا لے کر پیچھے نہیں پڑتے بلکہ ان کے احساسات موضوع کی صدرنگ بوتل میں خود بخود اترتے چلے آتے ہیں۔ رآز امتیاز کے ذہنی پس منظر میں زندگی کا کرب بھی ہے اور نشاطِ غم بھی۔ یقین ہے کہ اردو کا مستقبل رآز کے سواگت کے لئے خود آگے بڑھے گا۔

رشید مدراسی

رشید مدراسی کی تخلیقات کی عمر بھی کافی طویل ہے۔ وہ ایک زمانے سے لکھتے رہے ہیں۔ رشید مدراسی کے طبع آزاد افسانے بھی ہندستان کے مقتدر رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔ اور ان کے ناول "ہیرو" کو مشورہ بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔ جو کافی مقبول ہوا ہے۔ انھوں نے جتنا بھی لکھا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے اس کی افادیت ہمہ گیری اور دل کشی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ موصوف کا اسلوبِ نگارش نہ پریم چند سے ملتا ہے اور نہ ہی کرشن چندر سے وہ دونوں کے بین بین چلتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا موضوع اکثر رومانی رہا ہے۔

علی اکبر آمبوری

علی اکبر آمبوری کی شخصیت تامل ناڈو کے افسانوی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے ابتدا ہی سے اس صنف ادب کی طرف خاص توجہ دی اور ان کے افسانے ہندوستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ علی اکبر کے افسانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خواجہ احمد عباس کے اسلوب نگارش سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔

جدیدیت کا اطلاق ان کے افسانے پر اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ اس دور کی پیداوار ہیں جب کہ عباس، کرشن چندر اور ان کے ہم عصروں کا ہنگامہ تھا۔ موصوف کی تخلیقات میں اگرچہ حیات و کائنات کی ہم آہنگی اور ژرف بینی کے عناصر نہیں پاتے جاتے لیکن افسانوی ماحول دل کو چھو جانے والا ضرور ہوتا ہے۔ ان کے یہاں چونکانے والی کیفیت ہونے کے باوجود اس میں وہ شدت نہیں ہے جو منٹو کے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ موصوف کے افسانوں کا مجموعہ "برف سی اجلی" منظر عام پر آچکا ہے جو تامل ناڈو کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔

ایس۔ ایم۔ حیات

ایس۔ ایم۔ حیات طبع زاد افسانوں سے زیادہ ترجموں کے سلسلہ میں بے حد مشہور ہیں۔ انھوں نے تامل، انگریزی، ہندی، بنگالی اور ملیالی افسانوں کے ترجمے بکثرت کئے ہیں۔ لیکن ان کے ترجمہ شدہ افسانوں میں بھی اردو کا اپنا ایک خاص مزاج ملتا ہے افسانہ پڑھنے کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ طبع زاد تخلیق کی انفرادیت ان کے افسانوں میں جا بجا ملتی ہے۔ زبان اور فن پر بھرپور دسترس حاصل ہونے کی وجہ سے حیات نے اردو کے افسانوی ماحول کو بالکل سازگار بنا دیا۔

مہر طلعت آمبوری

تامل ناڈو کی خواتین میں مہر طلعت آمبوری کی ادبی شخصیت ہر اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ چونکہ مہر طلعت کا ماحول ادب، زبان اور ان کے دائرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور پھر پردے کی سخت پابندی کی وجہ سے ان کے مزاج میں جو گھٹن کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس کے پیش نظر جب ہم ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک حیرت سی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ قفس میں رہ کر بھی طاقت پرواز کی یہ شان ان کی انفرادیت کو اجاگر کرتی ہے۔ موصوفہ کے بعض افسانوں کے مطالعہ سے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ شہ پارے کیا اس ماحول کے پروردہ ہیں، جہاں قدم قدم پر پابندی ہی نہیں بلکہ فن کار کی آواز بھی پابہ زنجیر ہوتی ہے۔ ان کے افسانے "شمع"، "بیسویں صدی"، "بانو" اور دوسر

رسائل میں ہمیشہ جگہ پاتے رہتے ہیں۔

عابد صفی

ان قدیم شہسوارانِ علم وادب میں سے ہیں جن کی تحقیقی وتنقیدی تحریریں اردو ادب کے نگارخانوں میں مختلف زاویوں سے پھیل کر روشن ہوی ہیں۔ راقم کی نگاہ 1958ء سے آپ کی تخلیقاتی جزیروں کے اطراف برابر چکر لگا رہی ہے۔ آپ کی تحریروں میں بالخصوص افسانوں میں جمالیاتی عنصر کے ساتھ ساتھ زندگی اور کائنات کے بعض اہم پہلو اُجاگر ہوے ہیں۔ رومانیت سے قطع نظر آپ نے عصری تقاضوں سماجی قدروں اور اپنے ماحول کی فضاؤں میں نمودار ہونے والی نئی کروٹوں کو بھی اپنی تخلیقات میں سمونے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ صحافتی ادب میں بھی آپ نے قدم رکھ کر بعض نامعلوم رسائل اور اُن کی خدمات کو نمایاں کیا ہے

فضلؔ جاوید

فضل جاوید نے اگرچہ بہت کم لکھا ہے لیکن اتنا ضرور لکھا ہے کہ ہم انھیں بہ حیثیت افسانہ نگار فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کے افسانوں میں طنز و مزاح کا لطیف عنصر پایا جاتا ہے جو ہمیں احمد جمال پاشا سے قریب کر دیتا ہے۔ جذبات کا ہیجان متوازن صورت میں ان کی تخلیقات کا جزو بنتا ہے۔ تامل ناڈو کے دوسرے افسانوی مجموعے "روشنی کے بھنور" میں فضل جاوید کی تخلیقات بھی جگہ پا چکی ہیں اور ان کی تخلیقی صلاحیت کو تامل ناڈو کے منجھے ہوئے فن کاروں نے بھی سراہا ہے۔

حسن فیاّض

حسن فیاض اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس پر بہ ہر اعتبار جدیدیت کا اطلاق ہوتا ہے ابتدا ہی سے ان کا رجحان جدیدیت کی طرف رہا ہے انھوں نے نظموں اور افسانوں میں علائم کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقات کو معمہ نہیں بنایا ابلاغ کے سلسلے میں ان کی کوشش ہمیشہ راست باز رہی ہے ان کی تخلیقات کے کردار ہمارے ہی اپنے سماج کے چلتے پھرتے، سانس لیتے، مہکتے مسکراتے اور سسکتے ہوئے

کردار ہیں۔ ان کے افسانوں میں سپاٹ پن کے عنصر نے کبھی جگہ نہیں پائی۔ حسن فیاض کی تخلیقات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زندگی اور سماجی مسائل کو جس طرح سنجیدگی کے ساتھ سوچا اسی طرح انھیں فن پارے کا روپ بخشا ان میں ابھرنے کے اچھے امکانات ہیں بشرطیکہ وہ اسی طرح لکھتے رہیں۔

صلاح الدین برق

صلاح الدین برق کی شخصیت ست رنگ دھنک کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ انھیں شاعر ہونا چاہئے تھا یا ہیرو۔ لیکن انھوں نے اپنے وجود کے اندر چھپے ہوئے ہیرو کو مختلف رنگ و آہنگ اور مختلف روپ میں اپنی تخلیقات کے اسٹیج پر کھڑا کیا ہے۔ ان کی طبیعت کی برقی رو تخلیق کی آنچ میں تپ کر سنجیدگی کی فضا میں سانس لینے لگی ہے انھوں نے اب تک اردو ادب کو جو کچھ دیا ہے ادب کا مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ خلیل جبران سے صلاح الدین برق کی دلی وابستگی ان کی فکری ہم آہنگی کا زندہ ثبوت ہے جبران کی تخلیقات نے ہمیشہ ان کے احساسات کے دروازے پہ دستک دی ہے۔ ان کے یہاں حقائق کے ماحول میں جو ماورائی کیفیت ملتی ہے۔ وہ انسان کو تلخابۂ ہستی کی گرہ کشائی پر مجبور کر دیتی ہے۔ صلاح الدین برق کی جبران سے وابستگی ان کے زاویۂ نظر کو واضح کرتی ہے ان میں ابھرنے کے اچھے امکانات ہیں مجھے امید ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی وہ ان امکانات کی لچک کو کم کرنے کی بھولے سے بھی کوشش نہیں کریں گے۔

سبیل عرفان

سبیل عرفان کے افسانے ایک ایسی سچائی اور حقیقت کے غماز ہیں۔ جسے کوئی بھی قاری جھٹلا نہیں سکتا۔ آپ کے کچھ افسانوں سے بڑی مایوسیت ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہی مایوسیت ان کو اور ان کے افسانوی فن کو بہت اونچا بھی اٹھاتی ہے انھوں نے اپنی زندگی میں دس بارہ افسانے لکھے ہوں گے۔ لیکن انھوں نے جو بھی لکھا اس میں احساسات کی تھرتھراہٹ، جذبات کی لو اور خلوص و محبت کی صناعی ملتی ہے۔

اعجاز آرشاکری

اعجاز آرشاکری کو ہلکے پھلکے کرداروں کو بڑے اچھے اور تیکھے انداز میں پیش کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ آپ کے افسانوں میں آج کی روزمرہ اور سماجی زندگی میں سانس لینے والی اچھائیوں اور برائیوں کی بہت ساری جھلکیاں نمایاں طور پر ملتی ہیں تامل ناڈو کے افسانوی ادب میں آپ کے افسانے واقعی قابل توجہ ہیں۔

یعقوب اسلم

یعقوب اسلم کے افسانوں کی زبان نہایت صاف، شیریں، شگفتہ اور رواں ہے۔ آپ کی عبارت میں کہیں جھول نظر آتا ہے نہ کہیں اظہار علمیت، چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے پتے کی باتیں نہایت آسانی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد قاری کو الفاظ کی بھول بھلیوں اور علائم کی تاریک اور ناآشنا گلیوں میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔

کاظم نائطی

آپ تامل ناڈو کے نقاد، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے اکثر افسانوں کے پلاٹ نئے نئے سے لگتے ہیں۔ لیکن پیش کرنے کے انداز میں وہ تیکھاپن اور چونکا دینے والے نقوش نہیں ملتے جو آج کے افسانوی ادب کا خاصہ ہیں۔ آپ نے شاعری کی طرح افسانوں کو بھی یکسوئی اور اپنائیت کے ساتھ لکھنے اور برتنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ تساہل سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے افسانوی ادب میں بھی اپنا مقام متعین نہیں کیا۔ آپ نے شاہد علیم کے نام سے بھی کئی افسانے تحریر کئے ہیں۔

فخر اعجاز

آپ کے افسانوں میں بہترین منظر کشی کے ساتھ ساتھ نظم کا آہنگ بہت زیادہ ملتا ہے۔ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی آپ نے افسانہ کو شاعری کی سی زبان عطا کی ہے

کہیں کہیں ایسا احساس ہوتا ہے کہ آپ نثر میں شاعری کا رس نچوڑ رہے ہیں آپکے افسانوں کی یہ خصوصیت تامل ناڈو کے اکثر احباب کے ذہنوں میں جلوہ فگن ہے۔

محمد فیّاض حسین

محمد فیاض حسین بمقام مدراس 1943ء میں پیدا ہوئے 1960ء سے 1968ء تک فیاض یہاں کے ادبی پروگراموں اور شعری نشستوں کی کارروائی میں ہمارے دراز امتیاز، کاوش بدری، ادیب بھارتی، انور ربانی، حسن فیاض، علیم صبانویدی، لقا رضوی، صلاح الدین برق اور فضل جاوید) ہمسفر رہے انھوں نے شاعری سے نثر کی طرف بہت زیادہ توجہ دی۔ بالخصوص افسانوی ادب میں ان کی شناخت آج بھی محفوظ ہے۔ زندگی کے روزمرہ مسائل اور ان مسائل سے جنم لینے والی اچھائیوں اور برائیوں کی اپنے مختصر ترین افسانوں میں بڑے اچھے اور تیکھے انداز میں عکاسی کرنے کے فن سے فیاض بخوبی واقف ہیں. اگرچہ انھوں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں لیکن جتنے بھی لکھے ہیں وہ تامل ناڈو کے اردو افسانوی ادب میں ناقابل فراموش ہیں۔

فیاض نے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد اردو ادب سے مستقل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ اگر فیاض حسین، صلاح الدین برق اور فضل جاوید جیسے جینئس فن کار دوبارہ ادب کی طرف رجوع ہوں گے تو یقیناً ان کے تخلیقی جواہر پارے تامل ناڈو کے اردو ادب میں اضافہ ثابت ہوں گے۔

انور کمال

انور کمال کے افسانے آج کے دور کے حالات، احساسات اور جذبات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں ایک اچھے افسانہ نگار بننے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں بشرطیکہ خاص لگن اور مسلسل انہماک کے ساتھ پرورش لوح قلم کرتے رہیں۔

غیاث اقبال

غیاث اقبال کا ہر افسانہ پلاٹ کے اعتبار سے بالکل نیا ہونے کے علاوہ آج کے

عصری آگاہی سے بہت زیادہ میل کھاتا ہے۔ ان کے یہاں کرداروں کے پیش کرنے کا ڈھنگ بھی بڑا چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ آپ نے افسانے کو نئے زاویئے دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

مندرجہ بالا جدید دور کے افسانہ نگاروں کے علاوہ تامل ناڈو کے افسانوی ادب میں حبیب خاں سروشؔ داوؔدی، عزیزؔ تمنائی، دانش فرازی، راحؔی صدیقی، عبدالمتین ہوشؔ، رشید احمد فاروقی، مصباح اللہ ساحل رشید اور آنند مدھوکر (فرحتؔ کیفی) کی تخلیقات بھی "سفینہ"۔ "فانوس خیال"۔ "معیار ادب"۔ "مصحف"۔ "زندگی"۔ "پاکیزہ"۔ "مشعل"۔ "فلم دیش" "ساون"۔ "ادبی رپورٹ"۔ "اتحاد"۔ ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہوار جریدوں میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ متذکرہ بالا افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری کو تفریحی مشغلہ تصور کرتے ہوئے بہت ہلکے پھلکے افسانے (جو سطحی جذبوں سے مزین تھے) لکھے جن سے افسانوی فن کا فروغ ملا نہ زندگی۔ لیکن دانشؔ فرازی، ساحلؔ رشیدؔ، آنند مدھوکر (فرحتؔ کیفی) کے افسانوں میں انشائیہ پن بہت زیادہ نمایاں تھا اور کہیں کہیں ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں عصری آگہی کے واضح خدوخال بھی اجاگر ہوتے ہیں۔ تعجب اس بات کا ہے کہ شمال کے فکشن کے نقادوں کے علاوہ خود مدراس کے ارباب علم وفن نے یہاں کے بہترین افسانہ نگاروں کو اپنی تحریروں میں نظر انداز کرتے ہوئے کور ذہنی سے کام لیا ہے۔

افسانوی میدان سے ہٹ کر تامل ناڈو کے معدودے چند فن کاروں نے ناول نویسی کی طرف توجہ دی ہے جن میں مولانا فیضی صدیقی، رشید مدراسی، راز امتیاز، کے۔ آر۔ حسینی، علی اکبر آمبوری، علیم صبا نویدی کے نام قابل ذکر ہیں

رشید مدراسی نے تین چار ناول لکھے ان میں سے ایک ناول "ہیرو" مشورہ بک ڈپو دہلی سے شائع ہوا۔ کے آر حسینی کا ناول "ننگا ماحول" حیدرآباد میں طبع ہوا۔ مولانا فیضی صدیقی کے جاسوسی ناول (جن کا ذکر ان کے باب میں آئے گا) آج بھی اشاعت کے مرہون منت ہیں۔ مولف تذکرہ کا ناول "ادھورا پیار" آج کی فکر اور فنی اڑانوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی پستیٔ احساس کے ساتھ نجی لائبریری کی زینت بنا ہوا ہے۔ راز امتیاز کا ناول جو آدھے سے زیادہ مکمل ہو کر اپنے آخری موڑ کے انتظار میں ہے

من حیث المجموع تامل ناڈو کے فن کار کسی اعتبار سے بھی اردو علم و ادب کی دنیا میں

کبھی پیچھے نہیں رہے ہیں یہ اور بات ہے وہ شہرت کے افق کو چھو نہیں پاتے اور وہ وسائل اور سہولتیں بھی میسر نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اونچا اٹھا کر اپنی خداداد صلاحیتوں کو "دنیائے ادب" سے آشنا کر سکیں۔

شریف مدراسی

شاہ محمد صادق الحسینی چشتی القادری شریف الشعراء شریف[1] مدراسی کی صحیح تاریخ پیدائش کا پتہ آج تک کسی محقق نے نہیں لگایا۔ اندازاً آپ 1824ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ شریف مدراسی کے والد غلام محی الدین نحیف کو عربی فارسی زبانوں پر بھرپور قدرت حاصل تھی۔ فارسی صرف ونحو پر آپ کی کتاب "چار چمن قانون" ایک کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ شریف مدراسی بچپن ہی سے آزاد خیال اور روشن دماغ تھے۔

تامل ناڈو میں "شہر استاد" شریف مدراسی کی شاعرانہ عظمت وہی ہے جو دلی میں مرزا غالب کی تھی، غالب و شریف کا موازنہ کسی حد تک درست نہیں ہے چونکہ غالب ایک ایسا عظیم شاعر ہے جس نے وقت اور زمانے کے مزاج کو پہچانا غالب کی آفاقیت نے دنیا کے سارے مہذب و متمدن ممالک کو متاثر کیا ہے۔ سماج ہی نہیں بلکہ مذہبی عقائد یعنی مابعد الطبعیاتی مسائل تک اس کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ جس طرح غالب نے عام روش سے ہٹ کر اپنی شاعری کی بنیا درکھی اسی طرح شریف مدراسی کا آہنگ بھی اس دور کے ہم عصر شعراء کی آواز سے بالکل جداگانہ معلوم ہوتا ہے۔ شریف کے ذہن و فکر کی پرواز بہت اونچی ہے۔ شریف کی مشکل پسندی ان کے مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ شریف نے دیوان غالب کا بھرپور تتبع کر کے اگرچہ بڑا کارنامہ انجام نہ دیا ہو لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ شریف نے یہ جرأت اپنی افتاد طبع کے تقاضے سے مجبور ہو کر کی۔ شریف کے کلام کے مطالعہ

---

[1] ابن غلام محی الدین نحیف ... مؤلف چار چمن 1290ھ (1873ء)

سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھیں فارسی زبان، اس کے محاورات، الفاظ کی دروبست تراکیب و تلازم پر کسی قدر عبور حاصل تھا۔ شریف کی بعض غزلوں کا آہنگ تو بالکل غالب سے ملتا جلتا ہے۔ یہ مماثلت بعد مسافت کے باوجود شریف کے کمال فن، قادر الکلامی اور مہارت تامہ کی دلیل ہے۔

شریف مدراسی کی بلند پایہ شخصیت ایک ایسا سرچشمہ فیض تھی کہ جس سے تشنہ دامان ادب نے استفادہ کیا۔ شریف صوفی منش، خوددار، غیرت مند اور ایک نغزگو شاعر تھے۔ نواب عبدالرؤف خاں پرتو جیسے رئیس آپ کے حلقۂ تلمذ میں شامل تھے۔ اس فقیر بوریا نشین نے رشد و ہدایت ہی سے نہیں۔ فیضان علم و ادب سے بھی ایک عہد کو متاثر کیا۔

غنیمت ہے کہ شریف کا بہت مختصر کلام شائع ہوگیا ہے۔ اگرچہ اس کے نسخے نایاب ہیں۔ لیکن جو بھی محفوظ رہ گئے ہیں انھیں شعر و ادب کے سرمایہ میں گراں مایہ اضافہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ "گلزار شریف" 1875ء "حدیث شریف" 1884ء، "دیوان شریف" 1887ء "مثنوی شام غربت" 1889ء "شرف اردو" 1878ء اور "شریف القوانین" 1291ھ آپ کی چھ تصانیف منظر عام پر آچکی تھیں جو آج نایاب ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ شریف مدراسی کے کئی ایک شعری کتابچے منظر عام پر آکر شرف قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

باب السلام حصہ اول 1867ء میں (ڈیمائی سائز کے 55 صفحات پر مشتمل ہے

باب السلام حصہ دوم 1314ھ شریفہ پریس (ڈیمائی سائز 56 صفحات پر مشتمل ہے)۔ مدراس سے شائع ہوئیں۔ ان دونوں کتابچوں میں شریف مدراسی کا منقبتی کلام ملتا ہے۔

21 ستمبر 1904ء کو آپ کا انتقال ہوا

○ کہتا ہے سر کہ غیر کے در پر نہیں ہوں میں — پڑجاؤں ہر جگہ یہ وہ پتھر نہیں ہوں میں
چڑھ جاؤں منھ فرشتوں کے نشہ کی شکل آج — افسوس بزم یار کا ساغر نہیں ہوں میں
جس شعر میں ہو مدحت لب ہائے شکریں — کہتا ہے کب کہ قند مکرر نہیں ہوں میں
اف ری تعلیاں لب دندان یار کی — یعنی کہ لعل ہی نہیں، گوہر نہیں ہوں میں

کس وجہ خاکسار کا سر پھینکتے ہو دور
کیا سنگ آستاں کے برابر نہیں ہوں میں
شکرِ خدا کہ بندے سے آزاد ہوں شریف
مدراس میں فقیر ہوں نوکر نہیں ہوں میں

دلِ اہلِ محفل تپاں کر دیا — سلامی نے محشر عیاں کر دیا
قلم سے عیاں ہو گیا رازِ دل — اشاروں میں سب کچھ بیاں کر دیا
زہے جاں فزائی کہ تقدیر نے — زباں کو دلِ دوستاں کر دیا
تڑپتا ہے دل کوئی ساتھی نہیں — مقدر نے بے کارواں کر دیا
ہوائے سخن نے کھلائے یہ گل — مرے نامہ کو گلستاں کر دیا
وہ طاقت نہیں اور وہ قدرت نہیں — فلک نے یہ کچھ ناتواں کر دیا
تنکے تنکے کو ہے حاصل سر و ساماں میرا — کیا جنوں خیز ہے واللہ بیاباں میرا
تپش دل میں کلیجے سے لگا لیتے ہیں — راحتِ جان ہے دیوانوں کو دیواں میرا
عشق رخسار ہے شیرازہ جمعیتِ دل — کیا بگاڑے گی تری زلف پریشاں میرا
دلِ صد چاک ہوا تک نہیں آنے دیتا — ہے ہر اک کوچۂ کاکل میں نگہباں میرا
منہ پہ آ جاتا ہے پانی دمِ گریہ ہی ہی — آبرو بخش ہے ہر دیدۂ گریاں میرا
کہہ رہے ہیں وہ دکھا کر رخ و زلف و لبِ لعل
یہ حلب ہے یہ ختن ہے یہ بدخشاں میرا

ہر دل پہ ہے سکہ قدم اس رشکِ پری کا — ٹکسال کے باہر ہے چلن کبک دری کا
بھرتا ہوں دمِ گرم گہر ریز ہیں آنکھیں — عالم ہے لب و چشم میں خشکی و تری کا
ٹھنڈی رہے لاتی ہی رہے بو مرے گل کی — سچ کہتا ہوں پیچھا ہے نسیمِ سحری کا
میں چاند کی تشبیہ رخِ یار سے دیتا — دھبہ نہ لگا ہوتا اگر در بدری کا
جھک جھک گئی دی میں نے اگر بال سے تشبیہ
اللہ رے عالم تری نازک کمری کا

ہجر میں اور ہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے — بھوت بن کر مرا سایہ بھی ڈراتا ہے مجھے
میرے پہلو میں الٰہی دلِ وحشی تو نہیں — کون پھر اس کی گلی لیے جاتا ہے مجھے

ہوں میں وہ نخلِ جنوں خیز الٰہی تو بہ — باغبان وادیٔ وحشت میں لگاتا ہے مجھے
نیم جاں ہوں تپش دل ہے یہی پہلو میں — درد آٹھوں پہر اٹھ اٹھ کے رلاتا ہے مجھے

بھیس میں غیر کے اس بزم میں بیٹھا ہوں شریفؔ
آشنا جان کے اب کون اٹھاتا ہے مجھے

○ یہ کیا تپش میں جلوۂ تارِ نقاب ہے — رخ اُن کا ہے کہ بجلیوں میں آفتاب ہے
دھوکا ہے پتلیوں پہ غزالانِ مست کا — ہے چشمِ سرخ یار کے بحرِ شراب ہے
کچھ چشمِ تر میں رنگِ تمنا نہ جم سکا — پانی پہ کب کسی کو اقامت کی تاب ہے
لاکھوں نشے ہیں اور ہزاروں خمار ہیں — سو سو طرح سے خانۂ گیتی خراب ہے
ہے دل پذیر جلوۂ رعنائے حسنِ یار — طرزِ سکون ہم روشِ اضطراب ہے
آئینِ الفتِ بتِ رعنا ہے دیدنی — ناکامیاب کوئی، کوئی کامیاب ہے

خود منکر و نکیر سمجھ جائیں گے شریفؔ
واللہ کس کو تابِ سوال و جواب ہے

○ میں اگر مر بھی گیا مجوبِ جاناں ہی رہا — تیغ کی منت رہی، قاتل کا احسان ہی رہا
عشقِ رخ میرا اس کے کاکل سے نہ آیا کچھ خلل — عمر بھر کافر کی صحبت میں مسلماں ہی رہا
بزمِ جاناں میں رہی چل پھر سبو و جام کی — میں جرس کی شکل اس مجلس میں نالاں ہی رہا
تُو تو تُو مجھ کو بھی سکتہ ہو گیا اے آئینہ — میں تو میں خود وہ بھی اپنے رخ سے حیراں ہی رہا

وہ ادھر نکلے کہ یاں جامے سے باہر ہو گیا
اس کے آگے تیغ کی صورت میں عریاں ہی رہا

○ مصیبت میں ہے خنجر حوصلہ ہے تنگ قاتل کا — تڑپے دل میرے سینے کا نہ ہے سینہ مرے دل کا
چھپائے گا کبھی یہ خوں جو مجھ پہ جرم ویے دل کا — قیامت میں الٰہی میں ہوں اور دامان قاتل کا
قیامت لطف سے اس فتنۂ عالم کے برپا ہو — بنے گا حشر کا دامانِ گل کو ہاتھ سائل کا
کہاں وہ اسکی وہ طینت کہاں میں یہ سرشت اپنی — مقابل کسرِ نفسی نے کیا گل کو مرے گِل کا
زمینِ قصرِ جاناں کو دماغِ آسمانی ہے — سراپا پیش و پس ہے فرش نوری اس کی محفل کا
فلک کا سائباں روشن، ستاروں کی ہیں قندیلیں — لگن خورشیدِ تاباں کا ہے اکا ماہِ کامل کا
جلوں، روؤں، ملوں مٹی میں اور برباد ہو جاؤں — مرقع ہوں خطے میں باد و آب و آتش و گِل کا

شریفِ ناتواں پر اک نظر یا مرتضیٰ کیجئے!
پڑا ہوں پیچ میں عقدہ کرو حل میری مشکل کا

(گلدستۂ بزم سخن مدراس)

والطف سے اک دن لبِ جاناں نہیں دیکھا — میں نے کبھی اس غنچہ کو خنداں نہیں دیکھا
آنکھوں نے کبھی کوچۂ جاناں نہیں دیکھا — میرے گلِ نرگس نے گلستاں نہیں دیکھا
اے دست جنوں جامۂ تن میں ترے ہاتھوں — کچھ رشتۂ داماں و گریباں نہیں دیکھا
ٹھنڈا رہے غم ہے سبب آبادیٔ دل کا — اس میں تو کسی اور کو مہماں نہیں دیکھا
آلودگیٔ خاک نے رکھا مرا پردہ — عریاں ہوں کسی نے مجھے عریاں نہیں دیکھا
پھر حشر کی آمد کا بیاں کرتا ہے واعظ — شاید مرے فتنے کو خراماں نہیں دیکھا

ان آنکھوں کی سوگند کبھی روبرو اپنے
میں نے تو شریف ابر کو گریاں نہیں دیکھا

چڑھ کر کبھی اس کے دیکھنے کے قابل نہیں رہا — ایسا گھٹا کہ وہ مہِ کامل نہیں رہا
ہے لطف یہ دل ہی جو بن جائے دل کی بات — کب تک کہے کوئی کہ مرا دل نہیں رہا
دھبہ مرے لہو پہ نہ آیا الٰہی شکر — میں ننگِ دستِ و دامنِ قاتل نہیں رہا
ہم رشتۂ نقاب ہوئی ان کی تابِ حسن — دیکھا نظر نے جب کوئی حائل نہیں رہا
عارض کی ان کی کوچۂ کاکل سے راہ لی — ہندوستان میں کعبہ سے غافل نہیں رہا
او شمعِ بزم شب ترے جلووں کے سامنے — پروانہ ایک قابلِ محفل نہیں رہا

میں رہنِ بے دلی وہ اسد کی زباں شریف
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

معجزۂ امام حسینؓ کے چند بند

کام کرتی ہے مسیحا سدا میری زباں — قالبِ بندش بے جان میں آجاتی ہے جاں
میری تاثیر سے شرمندہ ہے آبِ حیواں — ملتا جلتا قمِ عیسیٰ سے ہے صاف اپنا بیاں

صاحب چرخ چہارم ہے مرا مرتبہ داں

مجھ سے اصحابِ چمن فیضِ سخن پاتے ہیں — سرو ہر مصرعۂ سنجیدہ سے جھک جاتے ہیں

بلبلیں مجھ سے انھیں باتوں میں شرماتے ہیں　　ورق گل مرے لکھنے کے لئے لاتے ہیں
شاخ نرگس کا قلم ہے پئے تحریر بیاں
داغ لالہ کی سویدا کی سیاہی آئی　　روشنائی یہ خدا میں نے یہ بہتر پائی
سرخیِ چہرۂ گل مجھ کو نہایت بھائی　　میرے ہر نقطے میں کس درجہ نہ ہو رعنائی
میرے نامہ کو جہاں کہتا ہے رشکِ بوستاں
کچھ زبان شوخ مرے روبرو سوسن کی نہیں　　قدر آگے مری تحریر کے گلشن کی نہیں
مہر میں تاب مرے معنیِ روشن کی نہیں　　صبح صادق میں صفائی مرے دامن کی نہیں
میں ہوں وہ پاک کفن جس کا ہے مداح جہاں

مخمس

چمن میں پھول ہے، بو پھول میں سخن میرا　　صدف ہے بحر میں، دُر سیپ میں دہن میرا
شریفِ عصر ہوں اشرف ہے سب میں فن میرا　　قلم کو زعم نہیں لنگ ہے چلن میرا
ہر ایک نقش کفِ پا ہے دیدنی تصویر
میں وہ نہیں ہوں کہ ہر مدعی سے ہٹ جاؤں　　نہیں وہ بحر کہ قطروں کے آگے گھٹ جاؤں
نہ وہ جری ہوں جو کم جرعتوں سے کٹ جاؤں　　نہ ایسا چشمہ جو کوزے میں میں سمٹ جاؤں
سخن کی مجھ کو ہے قدرت بفضلِ ربِ قدیر

رباعیات

کب لطف کے بدلے میں یہاں قہر نہیں　　حق بینی نگا ہوں میں کم از زہر نہیں
ہے اپنی ہی قدر میں ہر اک صرف شریف　　مدراس سا نا قدر کوئی شہر نہیں

مضمون کو شرف ہے جیسا ئی میری　　ہاں علم کے در تک ہے رسائی میری
بندہ جو علی مرتضیٰ کا ہوں شریف　　اقلیم سخن میں ہے خدائی میری

مداح شہنشاہ دو عالم ہوں میں　　جبرئیل کا ہم صفیر و ہمدم ہوں میں

کہتے ہیں اسی شرف سے مجھ کو شریف   کس بات میں اہل سخن سے کم ہوں میں

نعت

(۱)

فلک نے گر کہیں اس زار و مضطر کی طرف دیکھا   وہیں میں نے رسول اللہ کے گھر کی طرف دیکھا
رہا سینہ میں تاباں داغ عشق احمد مرسلؐ   الٹ کر میں نے کب خورشید محشر کی طرف دیکھا
فرشتوں نے نہ دیکھا تھا مرے اعمال نامہ کو   ادب سے نعت پیغمبر کے دفتر کی طرف دیکھا
رہا مر کر شریف زار صحرائے مدینہ میں   نہ جنت کی طرف دیکھا نہ کوثر کی طرف دیکھا

(۲)

حق نما ہے ہر طرف جلوہ رسول اللہ کا   طور پر وہ ایک پرتو تھا رسول اللہ کا
گنج مخفی سے ہوا ہے نور وحدت کا ظہور   سب اجالا ہے جہاں آرا رسول اللہ کا
نئے جہاں سے آئے واں پہنچے شب معراج میں   ہے خدا خود عاشق و شیدا رسول اللہ کا
یا الٰہی اس فقیر ناتواں پر رحم کر   ہے شریف زار اک بندا رسول اللہ کا

مسکینؔ مدراسی

حضرت سید شاہ عبدالغفار قادری و چشتی مسکینؔ مدراسی ویلور (شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے۔ آپ عربی، فارسی اور اردو کے جید عالم اور شاعر تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ عالم گجراتی سے ملتا ہے۔ آپ نے مولوی سید شاہ عبداللطیف قادری قطب ویلور سے ارادت وخلافت حاصل کی تھی۔ آپ نے اپنے روحانی رہبر سید شاہ عبداللطیف قادری قطب ویلور کی شان میں دو طویل مثنویاں "کہنہ مرغوب" اور "عیون المظاہر" (1313ھ اور 1323ھ) فارسی میں لکھیں 1316ھ میں آپ نے شرحِ من لگن کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ آپ کا ایک شعری مجموعہ (فارسی اور اردو غزلیں) بنام "دیوان مسکینؔ" (1924ء 1343ھ) میں منظر عام پر آچکا ہے۔ آپ کی تصانیف میں علم تصوف کی بہت زیادہ چاشنی ہے۔ آپ کا وصال بروز ہفتہ 28 مارچ 1908ء (24 سفر 1326ھ) ہوا آپ کا مزار مبارک دست گیر صاحب ساوی کے قبرستان میں واقع ہے۔

عشق کی منزل کا ہے یارو یہی رستا شروع
نقد ہستی کے تئیں اپنے گنوا دینا شروع

سامنا ہو جاوے گا جس وقت جاناں کا شروع
دیکھنا تیرا ہی تو ہو جاوے گا پردا شروع

وصل دلبر چاہتے ہو یا حیاتِ جاوداں
جیتے جی اس راہ میں لازم ہے مرجانا شروع

قصرِ دلبر تک رسائی خوب مسکینؔ ہوگئی
بن گیا تارِ نظر اس بام کا زینا شروع

وصف کرتا ہوں رقم اک شاہدِ مستور کا
عین انسانی ہے جلوہ اس رخ پر نور کا

بڑھ گیا رتبہ قلم کا شہپرِ جبرئیل سے
وہ اڑے سدرہ تلک اس کا ہے مقصد دور کا

نام مرسل ہے حقیقت میں وہی مرسل سمجھ
فرض ہے اک جاننا یاں آمر و مامور کا

جز مقید ہو نہیں سکتا ہے مطلق کا ظہور
دیکھنا لازم ہے ظلمت میں تماشا نور کا

ٹھنڈے سانسوں سے مرے گل ہوگئی محفل میں شمع
کام لیتے ہیں اسی سے مرہم کافور کا

چشم ساقی دیکھ کر مسکیںؔ پیا جام لطیف
ہے مدام آنکھوں میں نشہ دیدۂ مخمور کا

چاہے اگر کرے کوئی ذات خدا سے ربط　　لازم ہے اس کو پہلے کرے مصطفیٰ سے ربط
حاصل ہوا نتیجہ ہمیں حسن و عشق کا　　اک عمر بھر رہا ہمیں اہل ولا سے ربط
ہوتی نہیں رسائی مقام بقا تلک　　جب تک نہ ہو ولا تجھے اہل فنا سے ربط
ہوجائے کشف مسئلہ وحدۃ الوجود　　زاہد سے کام رکھے نہ اہل ریا سے ربط
کامل وہی فقیر ہے دونوں جہاں کے بیچ　　ہرگز رہے نہ اس کو کبھی اغنیا سے ربط
مسکیںؔ بتوں کے عشق میں گزری اک عمر بس
اب چاہیئے ضرور رسول خدا سے ربط

اے یار دیکھنا تو خدا سے جدا کو دیکھ　　اپنی خودی کو بھول کے خود میں خدا کو دیکھ
حاصل ہے وصل حق کا مسمیٰ کی دید میں　　منظور دیکھنا ہو تو بس مصطفیٰ کو دیکھ
پہلے تو آنکھ کیجئے پیدا بہ عشق حق　　آئینہ نبی میں جمال خدا کو دیکھ
مجموعۂ صفات الٰہی ہے یہ بشر　　انساں کی شکل ہی میں تو شان خدا کو دیکھ
پوچھے اگر وہ پردہ نشیں کا کوئی پتہ　　آنکھیں لڑا کے آنکھ سے اس مہ لقا کو دیکھ
بے پردہ عین پردۂ مسکیںؔ میں ہیں نہاں
چلمن اٹھا کے آنکھ سے اس باحیا کو دیکھ

عالم قدس جس کو کہتے ہیں　　عشق بازوں کی خاص بستی ہے
ہیں عجب عشق کے نرالے ڈھنگ　　جب میں روتا ہوں خلق ہنستی ہے
ہے وہ ارض و سما میں ایک ہی نور　　نام کی یہ بلند و پستی ہے
ایک ہی جانئے محیط و محاط　　یہی توحید و حق پرستی ہے
یہ شراب طہور اے مسکیںؔ
حلق میں زاہدوں کے پھنستی ہے

ٹھکانا ان کا بتلایا نہ کوئی　　خدا مجھ کو تو دکھلایا نہ کوئی
اٹھا کر آنکھ دیکھا شش جہت میں　　بجز میرے نظر آیا نہ کوئی
معمہ ہے عجب یہ عبد و رب کا　　بجز مرشد کے سمجھایا نہ کوئی
دل و جاں کھو دیا ایماں گنوایا　　کہیں اپنے سوا پایا نہ کوئی
جمال یار سے اکثر ہیں غافل
کہیں آئینہ ہاتھ آیا نہ کوئی

مبرور مدراسی

ابوسید محمد عبدالرحمٰن صدیقی قادری مبرور مدراسی مدراس میں پیدا ہوئے سنِ پیدائش معلوم نہ ہو سکا۔ آپ شہر مدراس کے مشہور نظم گو شاعر ابوسید محمد فضل الحسن منشی منظور صدیقی کے والد بزرگ تھے۔ آپ کا خاندان علم و ادب کا گہوارا رہا ہے۔ عربی فارسی اور اردو زبانیں آپ کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ آپ مدرسۂ اعظم مدراس میں فارسی اور اردو کے استاد تھے اور آخری عمر تک یہی فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ نے اردو غزل میں وہ جوہر دکھاتے ہیں جن کو اپنے دور کے اساتذۂ فن نے بہت سراہا ہے۔ بالخصوص آپ غیر منقوط کلام کہنے میں مہارتِ نامہ رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں "غیر منقوط کلام" کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا خدا جانے اس کا حشر کیا ہوا۔ بہر اعتبار آپ کی شاعری تامل ناڈ کے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ آپ کے دو مختصر سے کتابچے "قصائد رمضان" (مطبوعہ 1325 ھ) اور "نظم عروس" (مطبوعہ 1326 ھ) منظر عام پر آچکے ہیں اور یہ دونوں نسخے کتب خانۂ عام اہل اسلام مدراس میں موجود ہیں لیکن عام طور پر نایاب ہیں۔

آپ نے 29 اکتوبر 1914ء 1332 ھ کی صبح انتقال فرمایا۔

○ محشر میں جب کہ نامۂ اعمال بٹ گئے — کہہ کر خطا معاف وہ ہم سے لپٹ گئے
مبرور کی غزل جو سب احباب رٹ گئے — اعدا کی شعر خوانی کے دفتر الٹ گئے
کس درجہ سخت جاں یہ دلِ بے قرار ہے — اس سنگ دل کے پینچے کیا کیا الٹ گئے
ہو عذر بے خودی بھی تو کچھ لطف خیز ہو — پردہ اٹھا کے کیوں نہ انہیں سے لپٹ گئے
نکلا نہ پھر رقیب کے منہ سے کوئی سخن
مبرور تیرے نعرے کچھ ایسے ڈپٹ گئے

○ جگر اور دل طرفدار آپ کے روز جزا ٹھہرے — جنہیں ہم آشنا سمجھے وہی نا آشنا ٹھہرے
عدم سے جانب ہستی جو آکر حق نما ٹھہرے — کسی جا عکس ٹھہرے تو کسی جا آئینہ ٹھہرے

میں کشتۂ شوخی بے پردگی کا ہوں تو مرقد میں
بھلا کیا میرے منھ پر لے کفن پردا اتر ٹھہرے

شہیدانِ محبت دم بدم کاندھے بدلتے ہیں
نہ کیوں میرا جنازہ اس گلی میں جابجا ٹھہرے

غزل میں حضرتِ مبرور اثر اتنا تو ہو آخر
سخن فہموں کے دل میں درد لب پر مرحبا ٹھہرے

تھے عدم آئے عدم سے یار کے پانے کو ہم
سیرِ ہستی کر رہے ہیں اس سے مل جانے کو ہم

فیضِ صحبت کے مزے اٹھتے ہیں کیا کیا رات دن
دیکھ لیتے ہیں کہیں جب تیرے دیوانے کو ہم

دل ہے فانوس خیالِ یار میں آتش فشاں
رکھتے ہیں سینے میں مثلِ شمع پروانے کو ہم

جستجو میں ہیں کوئی ہمراز بھی ملتا نہیں
کون ہے کس کو سنائیں اپنے افسانے کو ہم

آئیں اے مبرور سجدہ کے لئے حور و ملک
جب صنم خانہ بنائیں دل کے کاشانے کو ہم

خدا کے روبرو لے دل وہ صورت ہونے والی ہے
قیامت ہے قیامت میں قیامت ہونے والی ہے

شہیدِ نازِ رشکِ حور ہوں احباب ہٹ جائیں
کہ مسجودِ ملائک میری تربت ہونے والی ہے

جلے گا رشک سے محشر میں کیا کیا تو نہ اے زاہد
گنہگاری مری منظورِ رحمت ہونے والی ہے

غزل گوئی امیر و داغ کو روتی ہے اے مبرور
پھر اب ہندوستاں میں تیری شہرت ہونے والی ہے

وہ جو مشتاق آپ اپنا تھا نمایاں ہو گیا
پیڑ پتے پھول پھل بوٹا گلستاں ہو گیا

بوئے گل نورِ سحر رنگِ شفق تابِ قمر
ہو گیا سب کچھ وہی جب اپنا خواہاں ہو گیا

بن کے آپ آئینہ، آپ آئینے میں آیا نظر
آپ ہی اپنے میں پنہاں اور نمایاں ہو گیا

مردمِ دیدہ کہیں ہے تو کہیں تارِ نظر
آپ ظاہر ہو کے آپ آنکھوں سے پنہاں ہو گیا

وہ کہیں معشوق ٹھہرا اور کہیں عاشق بنا
گل میں خنداں ہو گیا بلبل میں نالاں ہو گیا

ہے وہی ہر بھیس میں اور سب اسی کا ہے وجود
روحِ قدسی ہو گیا یا روحِ انساں ہو گیا

عندلیبِ خود سرا کیوں کیا ہوا تیرا وہ شور
نغمہ آرا اب تو مبرورِ غزل خواں ہو گیا

عاجزہ مدراسی

خاتون بی بی عاجزہ مدراسی ترچناپلی میں پیدا ہوئیں۔ عاجزہ کے والد سید محی الدین اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ عاجزہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت خود ان کے والد کے زیر نگرانی ہوتی بعد میں اردو، عربی اور فارسی کا درس مولانا محمد علی عاصی سے حاصل کیا اور شاعری پر بھی انھیں سے اصلاحیں لیں۔

عاجزہ نے بچپن ہی سے دینی اور مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی اس لئے ان کا زیادہ تر رجحان نعتیہ شاعری کی طرف تھا۔ اور طفلی ہی سے حضور اکرمؐ سے خاص محبت و عقیدت تھی۔ جس کا اظہار عاجزہ نے یوں کیا ہے۔

عشق ہے طفلی سے مجھ کو سرورِ عالم ترا
غم نہ تھا دنیا کا جب سے لگا ہے غم ترا

عاجزہ کی دیرینہ تمنا تھی کہ درِ رسول اکرمؐ پر حاضری دیں لیکن زندگی بھر اپنی غربت کی وجہ سے یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ اپنی اس ناکامی کا اظہار عاجزہ نے اس طرح کیا ہے۔

وصفِ دلبر سے دل کو تھی راحت — مدحِ سرور سے جاں کو تھی فرحت
ایک ساعت نہ تھا قرار مجھے — ذکرِ اقدس سے فکرِ مدحت سے
یادِ محبوب جب کہ ہوتی تھی — رکھ زمیں پر جبیں کو روتی تھی
اور کہتی تھی اے مرے حضرت — تم کہاں اور کہاں یہ بدقسمت
وائے! وہ دن کہاں کہ آؤں میں — سنگِ زینہ پہ سر جھکاؤں میں
رنجِ ہجراں میں یادِ وصلِ نبیؐ — باعثِ زندگی رہی میری
ہوتا تھا دردِ ہجر جب بسیار — لکھتی تھی شوقِ وصل کے اشعار

عاجزہ کی نعت گوئی کا یہ سلسلہ زندگی بھر جاری رہا۔ آخر میں اپنے فرزند سید عبدالسلام کے مشورے پر عاجزہ نے اپنا کلام "تحفۂ قبول" کے نام سے شائع کروایا۔

عاجزہ داغ اور امیر اور شریف مدراسی کی ہم عصر تھیں۔ آپ کے نعتیہ کلام پر مدراس کے عہد آفریں شہر استاد "شریف مدراسی نے قطعۂ تاریخ لکھا ہے۔

کیا خوب عاجزہ کا ہے دیوان نعتیہ — ہر ایک لفظ شامل حال رسول ہے
حسب الطلب شریف نے بے ساختہ کہا — سالِ خوش اس کا ذکر جمال رسول ہے

عاجزہ کی نعتیں پڑھنے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ عاجزہ کو زبان و بیان اور فن پر بھر پور قدرت حاصل تھی

عاجزہ کے اس نعتیہ مجموعے میں نعتوں کے علاوہ لوری نامہ، منقبت در شان غوث اعظم، سورۃ الحمد کا ترجمہ اور چند رباعیات بھی شامل ہیں۔ ان کی رباعیات میں سے چند ایک پیش ہیں۔

ہر طرح خدا سے دل لگانا اچھا — الفت سے سبھوں کے باز آنا اچھا
مَن عرف کے رمز کو سمجھ کر دل میں — معبود کو اپنے آپ پانا اچھا

شرک و بدعت سے بچا، یا مولا — دین کی راہ چلا، یا مولا
یاد تیری ہو ہمیشہ دل میں — ہے یہی میری دعا، یا مولا

دکھا دیدار اے رشک مسیحا — تڑپتا ہے دلِ بیمار میرا
منور کیوں نہ ہو دل، جب کہ رہبر — ہے عشق روئے پر انوار میرا

یادِ نبیؐ ہے ایماں میرا — روئے نبیؐ ہے قرآن میرا
مداح جب سے ہوئی شاہ دیں کی — ہے مدح گو، ہر ان میرا

جب پیمبر شافع محشر ہمارا ہو گیا — حشر کا کیا غم، شفاعت کا سہارا ہو گیا
تشنگیِ حشر کا کیا خوف ہم کو عاجزہ — جبکہ حامی ساقیِ کوثر ہمارا ہو گیا

انسؔت مدراسی

محمد مستعان علی بادشاہ انسؔت مدراسی کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی۔ آپ مولانا رحیم احمد فاروقی صاحب کے خسر تھے۔ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی پرورش مذہبی اور علمی ماحول میں ہوئی۔ فارسی، عربی اور اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ اردو شاعری آپ کو ورثے میں ملی تھی۔ اردو غزل کے ساتھ ساتھ نعت گوئی میں آپ نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ آپ کی شاعری کے سرمایہ سے اتنا ضرور اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے نعت گوئی کی صنف کو بہت اونچا اٹھایا ہے۔ مشکل سے مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرنا آپ کا وصف تھا۔ جن زمینوں میں آپ طبع آزمائی فرماتے تھے۔ ان زمینوں پر قدم رکھنے کی مجال کسی دوسرے کو نہیں ہوتی تھی۔ اکثر آپ کا کلام ذو قافیتین اور مختلف صنائع اور بدائع سے بھرا ہوا ہے۔ ابتدا میں آپ حضرت خواجہ شاہ محمد صادق الحسینی الچشتی القادری شریف الشعرا شریف مدراسی سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے تھے اور 1318ھ میں آپ کا پہلا نعتیہ مجموعہ "بہار جنت" طبع ہوکر نظارۂ خاص و عام ہوا۔ شریف مدراسی کے انتقال کے بعد آپ کا دوسرا نعتیہ مجموعہ "نظارۂ جنت" 1328ھ میں جناب حکیم سید شاہ محمد صبغۃ اللہ حسینی القادری بہادر نورؔ مدراسی کی اصلاح کے بعد شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ یہ دونوں مجموعے آج نایاب ہیں۔ آپ نے 1914ء/1333ھ میں بمقام مدراس وفات پائی۔

ہو شام سحر شاہ کا روضہ میرے آگے
اچھا نہیں جنت کا تماشا میرے آگے

زوار محمد کا بنا دے میرے مولا
کعبہ میرے آگے ہو مدینہ میرے آگے

ہے دل میں سمایا میرے وہ یوسف ثانی
ہر دم ہے وہی نورِ معلی میرے آگے

ہے وحدت و کثرت میں نمایاں وہی انسؔت
جلوہ سحر و شام ہے اس کا میرے آگے

○

دل میں ہے لکھوں نعت کے اشعار اور بھی
یعنی مری زباں ہو گہر بار اور بھی

انسؔت پہ ہو کرم کی نظر یا شہِ امم
لکھے غزل و نعت یہ دو چار اور بھی

شاکر وانمباڑی

شیخ عبدالقادر شاکر وانمباڑی کی شخصیت اور فن پر بہت سارے مضامین لکھے گئے لیکن کسی مضمون نگار نے ان کی سن ولادت کی تحقیق نہیں کی۔ لیکن عزیز تمنائی کے ایک مطبوعہ مضمون ایک گمنام شاعر" (1961ء) سے پتہ چلتا ہے کہ شاکر وانمباڑی شمالی آرکاٹ کے ضلع وانمباڑی کے ایک متمول لبّے خاندان میں 1850 اور 1860ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ ان کے جدّ امجد کو مذہبی علوم و مسائل سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ تاجر پیشہ ہونے کے باوجود شعر و ادب سے بھی ان کی دلی وابستگی تھی کچھ ایسے ہی اردو پرور ماحول میں شاکر وانمباڑی نے آنکھ کھولی اور دینی مدارس میں ابتدائی تعلیم کے مدارج طے کئے بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ خداداد صلاحیت طبیعت میں موجود تھی۔ اردو شاعری کی ہر صنف میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ زندگی بھر داغ اسکول سے وابستہ رہے۔ داغ کی معاملہ بندی، محاورات کے استعمال، زبان و بیان کی رعنائی کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ اگر ہم ان کو داغِ دکن کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ ایک کامیاب تاجر ہی نہیں بلکہ ایک باکمال صوفی بھی تھے۔ اور مولانا عبدالوہاب قدس سرہ بانی باقیات الصالحات کے خلیفہ بھی تھے۔ آپ نے وانمباڑی میں خانقاہِ قادریہ کے نام سے پالار ندی کے کنارے ایک خانقاہ بھی قائم کی تھی۔ جو آج بھی بوسیدہ حالت میں موجود ہے آپ کی مادری زبان تامل ہونے کے باوجود اردو شاعری میں وہ معرکے سر کئے ہیں جن کا اعتراف داغ دہلوی، امیر مینائی، جلال لکھنوی جیسے اساتذہ نے کیا ہے۔ آپ کی مثنوی گلزار شاکر۔ قصہ چندر بدن مہیار، انکشاف ذات و ادراک حقائق، مسائل تصوف و اسرار و سلوک و معرفت کے نہایت موثر اظہار کا نمونہ ہے

دیوان شاکر (مطبوعہ بخشی پریس کلکتہ 1896ء)، مثنوی نازِ شاکر (مطبع گلزار حسینی بمبئی 1897ء)، چمنستان شاکر (مطبع مفید عام آگرہ 1908ء) گلدستہ شاکر (مطبع گلزار حسینی بمبئی 1908ء)، تحفۂ شاکر (مطبع گلزار حسینی

بمبئی 1909ء)، حدیقۂ شاکر (مطبع گلزار حسینی بمبئی 1909ء) صحیفۂ ذکر اللہ (مطبع شاہ الحمید مدراس 1921ء) ان تصانیف کے مطالعہ سے شاکر وانمباڑی کے تبحر علمی، کمال فن اور فکری اپج کی سمتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آج ان کی متذکرہ بالا تصانیف مدراس کی کسی لائبریری میں موجود نہیں ہیں

جولائی 1923ء میں مدراس کے علم و ادب کا یہ روشن ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ کر رہ گیا۔ ان کے شاگردوں میں افسر آمبوری، طاہر آمبوری اور ماہر وانمباڑی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

چھیڑا محفل میں اسے یہ میری نادانی ہوئی
وہ بھی شرمندہ ہوا مجھ کو پشیمانی ہوئی

ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے جلوہ یار کا
روکش عالم سے اپنی چشم عرفانی ہوئی

چشم تر سے حال پوچھو طالب دیدار کا
مدتوں گھٹ گھٹ کے دل میں آرزو پانی ہوئی

نور برساتا ہے تیرے روئے روشن کا خیال
جس سے دل کی منزل تاریک نورانی ہوئی

داورِ محشر کے آگے دفترِ عصیاں کھلا
کیا کہوں شاکر قیامت کی پشیمانی ہوئی

نہ ہو جا محوِ آئینہ سراپا دیکھنے والے
ادھر بھی ایک نظر او حسن اپنا دیکھنے والے

تمہارے دیکھنے والے ہوئے خود دید کے قابل
چرا کر لے گئے آنکھوں میں جلوا دیکھنے والے

لگا کر دیکھ تو مژگاں کا پردہ دیکھتا ہے گر
نظر جل جائے گی داغ تمنا دیکھنے والے

نہیں اس جلوہ گہ میں ماسوا کا ہوش اے شاکر
ہوئے ہیں کس قدر محو تماشا دیکھنے والے

• مضامین وصف کمر باندھتے ہیں
مگر ہم بھی عنقا کے پر باندھتے ہیں

مسافر کو درکار زاد سفر ہے
گلوں کے بھی دامن میں زر باندھتے ہیں

اگر رو سکے چشم گریاں کے مانند
تو ہم شرط اے ابر تر باندھتے ہیں

غزل سن کے شاکر کی سب پہ کھلے گا
یہ مضمون اہل ہنر باندھتے ہیں

• تلخ غم سے زندگانی کیوں نہ ہو
جان نذرِ ناتوانی کیوں نہ ہو

حسن یوسف تیرے آگے ماند ہے
نقش اول، نقش ثانی کیوں نہ ہو

ملتا جلتا ہے شفق سے رنگ مئے
رنگ مینا آسمانی کیوں نہ ہو

طبع شاکر کرنے کئے گوہر نثار
خامہ محوِ دُرفشانی کیوں نہ ہو

خطیب قادر بادشاہ وانمباڑی

خطیب قادر بادشاہ وانمباڑی (ضلع شمالی آرکاٹ) کے رہنے والے تھے۔ یہ شہر 1901ء میں ضلع سیلم میں شامل تھا۔ بادشاہ کا خاندان علم وادب کی روشنی سے منور تھا۔ چنانچہ ان کے چھوٹے بھائی مولوی احمد حسین ایم۔اے۔بی۔ایل اعلیٰ حضرت نظام دکن کی سرکار میں معتمد پیشی کے معزز عہدے پر تین ہزار روپے تنخواہ پر مامور تھے۔ نظام حیدر آباد کی خدمت میں تقریباً بیس سال تک اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ بادشاہ کے والد خطیب حاجی محمد قاسم بہت بڑے تاجر پارچہ جات تھے۔ حالانکہ ان کا آبائی پیشہ خطابت وقضاوت اور تعلیم وتدریس تھا۔ حاجی محمد قاسم نے اپنے آبائی پیشہ سے قطع تعلق کر کے 1858ء میں گڈ نگ کلی مدراس میں پارچہ جات کا تجارتی مرکز قائم کیا محمد قاسم تجارت کے نشیب وفراز سے خوب واقف تھے تجارت میں بڑی مہارت اور تجربہ تھا۔ بادشاہ جب سنِ شعور کو پہنچے ان کا رجحان بھی تجارت کی طرف ہوا۔ ساہوکار الحاج قادر محی الدین صاحب کے پارچہ کوٹھی میں چند سال تک شریک رہے۔ اس کے بعد نیل کی خرید کے سلسلے میں جب قادر محی الدین کڑپہ گئے۔ ان کے ہمراہ بادشاہ بھی بہ سلسلہ تجارت کڑپہ میں فروکش ہوئے۔ ساہوکار الحاج قادر محی الدین صاحب کو بادشاہ وانمباڑی پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے لین دین اور کاروبار کا سارا بوجھ بادشاہ کے سر پر ڈالا۔ بادشاہ کو حق المحنت کے طور پر سالانہ کمیشن ملا کرتا تھا۔ 30 سال تک وہ اس کام پر مامور رہے۔ 1897ء میں بادشاہ نے قادر محی الدین صاحب سے الگ ہو کر مختصر پیمانے پر کپڑوں کی تجارت کا آغاز کیا اور رفتہ رفتہ ترقی کے مراحل طے کر کے اس مقام تک پہنچے کہ بادشاہ کا شمار بھی مدراس کے اہل ثروت لوگوں میں ہونے لگا۔

بادشاہ کو ابتدا ہی سے شعر کہنے کا ذوق تھا۔ چونکہ بادشاہ کے دور میں وانمباڑی میں کئی قادر الکلام شعراء موجود تھے۔ ماحول ادبی وعلمی سرگرمیوں سے ہمیشہ ہنگامہ آرا رہتا تھا۔ ابتدا میں زمانے کے رواج کے مطابق بادشاہ نے بھی غزل کہی۔ آخر میں

انتقال سے کچھ سال پہلے محبت رسولؐ جب دل پر غالب آئی تو انھوں نے نعت گوئی کا شیوہ اختیار کیا 25 اگست 1906ء میں بادشاہ نے اپنی اہلیہ اور نسبتی ہمشیرہ زادہ (اہلیہ کے بھانجے) کے ساتھ سفر حرمین اختیار کیا۔ سفر کے تاثرات کو بادشاہ وقتاً فوقتاً "مخبر دکن" کو بھیج دیتے تھے۔ بادشاہ کا یہ سفرنامہ بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ بادشاہ جب سفر حج میں تھے اس وقت ان کے والد خطیب حاجی محمد قاسم کا انتقال ہوگیا سفر حرمین کی واپسی کے بعد بادشاہ کا دل معاملات دنیاوی سے اکتا گیا۔ ہر وقت گنبد خضرا کی لو لگی رہتی تھی بادشاہ کی یہ خواہش تھی کہ دوبارہ روضۂ اقدس کی زیارت کا شرف نصیب ہو لیکن ضعف اور بڑھاپا مانع رہا چنانچہ وہ اس تمنا کو لئے دنیا سے اٹھ گئے۔

بادشاہ کا کلام سلاست و سادگی کا آئینہ ہے انھوں نے کبھی تکلف نہیں پیدا کیا بادشاہ حتی الامکان مبالغہ آرائی سے احتراز کرتے تھے تخیل کی بوقلمونی اور فکر کی موشگافیوں سے ان کی سیدھی سادی طبیعت ہمیشہ گریز کرتی تھی خصوصاً شاعری میں کرتب بازی اور دورازکار تخیل کی پرواز سے ہمیشہ دامن بچاتے رہے۔

بادشاہ کا کلام "پیام عاشق" قنوج۔ "پیام یار" لکھنؤ۔ "دامن بہار" آگرہ کے علاوہ مقامی پرچوں میں بیرونی اساتذہ کے پہلو بہ پہلو بالالتزام شائع ہوتا رہا۔

بادشاہ کی حسب ذیل تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں جن کے تمام ترنسخے آج نایاب ہیں

1۔ دیوان بادشاہ 1831ء احمد پریس، مدراس
2۔ یادگار بادشاہ 1891ء احمد پریس، مدراس فارسی کلام اور اردو کلام
3۔ جوہر خیال 1901ء فردوس پریس، مدراس
4۔ سفر حجاز (سفرنامہ حجاز) 1926ء نامی پریس، مدراس
5۔ گلزار بادشاہ
6۔ نعت خیر البشر۔ بادشاہ۔ مرتب۔ خطیب محمد عبدالرشید
7۔ مدح پیغمبرالہٰ 1924ء مرتب۔ خطیب محمد عبدالرشید
8۔ واقعات عالم 1962ء مرتب۔ خطیب محمد عبدالرشید نامی پریس، مدراس
9۔ معارف بادشاہ شاہ محمد عبدالرحمن فاروقی

آپ نے 27 مارچ 1923ء 1333ھ کو وفات پائی۔

محمد اسمٰعیل سیٹھ مغموم

محمد اسمٰعیل سیٹھ مغموم 1856ء میں کچھ بمبئی میں پیدا ہوئے اور مدراس میں سکونت پذیر رہے۔ آپ کی طرح آپ کے آباء و اجداد تاجر تھے۔ گجراتی آپ کی مادری زبان تھی اس کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق دامن گیر تھا۔ شاعری کی ابتدا ارفرضی عشق سے ہوئی۔ خیالی معشوق کے فراق میں کوہ و بیاباں کی خاک چھانی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہے ایماں گوپاموی شاکر مدراسی، بیخود مدراسی کی صحبتوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ شمال کے شعراء اکبر الہ آبادی اور رضا علی وحشت کلکتوی سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ آخری عمر میں خطیب قادر بادشاہ بادشاہ وانمباڑی کی وجہ سے آپ کی شاعری میں ایک نئی تحریک پیدا ہوئی جس کی وجہ سے آپ خیالی معشوق کو طلاق دے کر حمد و نعت کی طرف مائل ہوئے۔

آپ مدراس کے مشہور اور بڑے تاجر تھے۔ تجارتی مصروفیات کے باوجود آپ نے ذوق شعر سے گریز اختیار نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ نے بڑی خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کی۔ مدراس میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں آپ کے کارہائے نمایاں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

آپ 1918ء میں کلکتہ گئے تو وہاں آپ کے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد ہوا اس مشاعرے کی روداد اور سفر کے تمام تر حالات آپ نے اپنی تصنیف "ارمغان کلکتہ" میں قلمبند کئے ہیں۔ ارمغان کلکتہ کے علاوہ آپ کا ایک شعری مجموعہ "کلیاتِ مغموم" 1930ء میں شائع ہو کر ارباب فکر و فن سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس مجموعہ پر رضا علی بیگ وحشت کلکتوی، ایماں گوپاموی اور شاطر مدراسی نے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔

آپ بڑے منکسر المزاج اور سادگی پسند شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا جن میں زکریا سیٹھ متین، ابوالمقبول محمود وانمباڑی

محمد عبدالستار مشیر ویلوری، منشی فخرالدین الفتؔ مدراسی اور اسمٰعیل سیٹھ جاؔنی (ساکن کوچن) کے نام قابل ذکر ہیں۔

آپ نے 31 اگست 1929ء بروز چہارشنبہ رات دس بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔

نہ ہوا ایک گھڑی بھی لبِ دریا تمنا — کشتیٔ عمر کا ملاح نہ سیکھا تمنا
خورشید کی طرح ہو کے تاباں — سائے کی طرح گذر گئے ہم
دل کو کدورتوں کا نہ مخزن بنایئے — آلودہ دل نہ کیجیے گرد و غبار سے
مل مل کے آستانِ پیمبر پہ بار بار — لوحِ جبین سے بخت کا لکھا مٹایئے
وجود قطرہ کہاں؟ مل گیا جو دریا میں — ترا پتہ ملے اپنے سے ہو جو بے خبری
دولت سے رذیل اور بگڑ جاتے ہیں — بھر جائے جو کیسہ تو اکڑ جاتے ہیں
بڑھتا ہے غرور، عمر جب بڑھتی ہے — پھل پختہ جو ہو جائیں تو سڑ جاتے ہیں

تجمل حسین خان ایمآن گوپاموی

محمد تجمل حسین خان ایمآن اگرچہ سرزمین تامل ناڈو کے نہیں تھے لیکن ان کی ذہنی نشوونما اور علمی و ادبی خدوخال کو اجاگر کرنے میں تامل ناڈو کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ایمآن نے یہیں اپنی قابلیت و صلاحیت کا پرچم لہرایا۔ ایمان کی شہرت کا سورج بھی اسی افق سے طلوع ہوا۔ ایمآں بمقام گوپامو 1860ء 1277 ھ میں پیدا ہوئے۔

ایمآں کا خاندان پہلے سے نواب انورالدین خاں کے زمانے میں یہاں آچکا تھا۔ نواب انورالدین خاں جو مضافات لکھنؤ کے ایک مقام گوپامو کے رہنے والے تھے۔ کرناٹک کی صوبہ داری کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پھر ان کی قدردانی حوصلہ افزائی اور اقربا پروری کی وجہ سے انورالدین خاں کے خاندان کا ہر فرد مدراس کا رخ کرنے لگا۔

مولانا ایمآں کے والد حافظ ولی احمد کے انتقال کے بعد ایمآں غالباً اقتصادی اور معاشی پریشانیوں کا شکار ہو گئے ہوں گے۔ اس وقت ان کی عمر بھی یہی کوئی سولہ سال تھی۔ نوابینِ آرکاٹ کی اقربا پروری اور قدردانی کی شہرت ایمآن نے گوپامو میں سنی ہوگی اور اس کے علاوہ چچا نواب رفعت الملک بہادر ردامادنواب اعظم جاہ بہادر، پرنس آف آرکاٹ) مدراس میں تھے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر ایمآن اپنی والدہ نیاز فاطمہ کے ساتھ حیدرآباد ہوتے ہوئے 1297 ھ میں مدراس آئے

اس دور میں نوابینِ آرکاٹ کی علم دوستی اور قدردانی کا یہ عالم تھا کہ اہل علم وفن کے لئے خزانے لٹائے جاتے تھے۔ مولانا ابوالجلال ندوی نے ایک بار لکھا تھا کہ اہل علم جب مدراس کی طرف رجوع کرتے تو شمال کے ارباب علم وفن خاص طور سے یہ تاکید فرماتے تھے کہ مدراس جانے کے بعد اپنی زبان پر قابو رکھنا ایسا نہ ہو کہ وہاں کے اہلِ علم کے آگے ہمارا بھرم کھل جائے۔

ایمآں نے جب یہاں کے علمی و ادبی ماحول کا رنگ دیکھا تو علم وفن کے تعلق سے اپنے اندر ایک کمی محسوس کی۔ چنانچہ ایمآں نے مدراس آنے کے بعد

اس وقت کے جید علماء، اہل نظر، اہل دل، قاضی الملک مفتی بدرالدولہ، مولانا طراز شں خاں، مولانا عبدالباقی، مولانا سید محمد مکی، مولوی غلام دست گیر ہمت اور مولانا الحاج عبدالوہاب (بانی مدرسہ باقیات صالحات) سے استفادہ کے سلسلے کو شروع کیا اور ان ہی سے علم حدیث کی تکمیل فرماتے ہوئے بیعت و خلافت کا بھی شرف حاصل کیا۔

مولانا ایماں کی علمی ادبی اور دینی قابلیت سے متاثر ہو کر نواب انتظام الملک بہادر پرنس آف آرکاٹ نے اپنی صاحب زادی سے ان کا بیاہ کیا۔ اس وقت ایمان کی عمر ۲۳ سال کی تھی نواب انتظام الملک کی دامادی کا یہ اثر ہوا کہ ایماں فکر معاش سے آزاد ہوگئے اور نہایت یکسوئی اور طمانیت قلب کے ساتھ علمی اور ادبی خدمات کی طرف ہمہ تن معروف ہوتے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سید ضامن علی جلال لکھنوی کا سارے ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا۔ ایماں نے بھی اصلاح سخن کے سلسلہ میں حضرت جلال کو منتخب کیا۔ ابتدا میں خطوط کے ذریعے اصلاح کا سلسلہ جاری رہا پھر ایماں کئی مرتبہ لکھنو اور رامپور جا کر استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

ایماں کی شاعری کا مقام بہ اعتبار زبان و فن اونچا ہے۔ ان کی تخلیقات کے غائرانہ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایماں نے جلال و داغ کے لہجے کا بیک وقت اثر قبول کیا ہے۔ ایماں کے ہاں رعایت لفظی، صنائع و بدائع اور محاورات کا صحیح استعمال ملتا ہے۔ ایماں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہر صنف میں ان کی صلاحیت و استعداد کا جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔ ایماں چونکہ ایک جید عالم شعلہ بیان مقرر اور السنۂ مشرقیہ کے ماہر تھے۔ ان کی تخلیقات میں تغزل کی لطافت کے ساتھ ساتھ فکر و نظر اور شدت احساس کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ ایماں کا حلقۂ تلامذہ بھی نہایت وسیع تھا۔ ایماں معاشی ضروریات سے بے نیاز تھے۔ ایمان نے اپنے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر غزل کا پورا پورا حق ادا کیا لیکن آخری عمر میں آپ کی ساری توجہ نعت گوئی کی طرف مبذول ہوگئی۔ ایماں اخلاقی اعتبار سے درویش صفت اور فقیر مشرب تھے۔ تبحر علمی کے باوجود ایماں کی انا کبھی نخوت سے

ملوث نہیں ہوتی۔ طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ تواضع وضعداری اور خوش اخلاقی کی خصوصیات ان کی طبیعت میں اس طرح مجتمع تھیں کہ ملنے والا دل سے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ایماںؔ نے طویل عمر پائی 1359 ھ میں 82 سال کی عمر میں آپ نے انتقال فرمایا۔

ان کی نرینہ اولاد میں محبوب باشاہ محبوب بقید حیات ہیں آپ بھی ایک شاعر کی حیثیت سے مدراس کے ادبی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

• شوخی نئی سیکھی ہے ادا اور ہی کچھ ہے
اب وہ صنمِ ماہ نما اور ہی کچھ ہے

آغاز محبت ہے اگر جان کی جوکھم
انجام ترے چاہنے کا اور ہی کچھ ہے

میں ظلم سے نالاں وہ مرے نالوں سے بیزار
شکوہ میرا اور ان کا گلہ اور ہی کچھ ہے

وہ زہر تو بیمار محبت کو نہ دیں گے
اس درد کی کہتے ہیں دوا اور ہی کچھ ہے

دو ٹھوکروں میں پار ہوا دونوں جہاں سے
ایماںؔ مری لغزشِ پا اور ہی کچھ ہے

• وہ تو جھلک دکھا کے پس پردہ ہٹ گئے
ہم بے خودی میں دوڑ کے پٹ سے لپٹ گئے

کچھ اپنے دل کے ساتھ تو کچھ اپنی جان کے ساتھ
جتنے دیئے تھے داغ وہ ان سب میں بٹ گئے

خنجر بکف گزر گئے اپنی گلی سے تم
کچھ یہ بھی ہے خبر کہ گلے کتنے کٹ گئے

ایماںؔ بعد مرگ جو مٹی نہ توں نے دی
دل کے گڑھے بھی گور کے ساتھ اپنے پٹ گئے

ایماںؔ گوپاموی کی دو غیر مطبوعہ رباعیات

• احباب میں بھی رنگ بدی کا پایا!
بس نام ہی نام دوستی کا پایا
سب میں رہے اور سب سے ملے ہم ایماںؔ
ہم نے تو کسی کو نہ کسی کا پایا

• افکار سے آرام سبھی چھوٹ گیا
ایسے صدمے سہے کہ جی چھوٹ گیا
اس بزم میں کیا پڑھ کے سناؤں ایماںؔ
مدت ہوئی شغلِ شاعری چھوٹ گیا

پرتو مدراسی

نواب عبدالرؤف خان بہادر پرتو (خورشید احمد خاں کے فرزند اور ہز ہائنس نواب عظیم جاہ ہفتم پرنس آف آرکاٹ کے نواسے) بمقام مدراس 1865ء 1282ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہارس ہائی اسکول اور فارسی کی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کی۔ آپ ایک زمانے تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ 1919ء میں حکومت نے آپ کو پانچ سو روپے پنشن سے نوازا۔ آپ ایک بڑے رئیس کے نواسے تھے اس لئے شہر مدراس میں بہت زیادہ آپ کی عزت تھی جس کا زندہ ثبوت آپ کے نام سے منسوب کی گئی ایک گلی (پرتو اسٹریٹ) ہے۔

پرتو مذہباً سنی مسلمان تھے لیکن ابتدا میں مذہب کے معاملے میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ آخرش 1915ء میں آپ نے الحاج سید شاہ حسین محرم رح میلاپوری (المتوفی 1928ء) کے دست مبارک پر بیعت کی جس کی وجہ سے وہ روحانی طور پر بہت زیادہ مطمئن ہوئے۔

آپ شریف مدراسی کے حلقۂ فیض سے وابستہ تھے۔ شہر استاد کی طرح آپ نے بھی غالب کی زمینوں میں غزلیں کہیں۔ آپ کا ادبی ذوق نہایت شستہ اور اونچا تھا، آپ کی تخلیقات میں وہی خصوصیت پائی جاتی ہے جو شریف کے کلام میں ملتی ہے۔ لیکن غزل کو خلعت فاخرہ سے نوازا۔ پرتو کے عہد میں اگرچہ نوابیت کا منصب شاہانہ طمطراق کا حامل نہیں تھا مگر شکوہ خسروانہ کی جھلک آپ کے کردار سے نمایاں تھی۔ زبان کی لطافت، زور تخیل آپ کے کلام کی قابل ذکر خصوصیات ہیں۔

آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

1۔ کلیات پرتو 1308ھ، 2۔ دیوان پرتو 3۔ مثنوی حرز جان 4۔ نغمۂ پرتو 1903ء 5۔ نظم دلچسپ 6۔ نظم دلفریب 1920ء 7۔ گلدستۂ پرتو 1301ھ 8۔ راہ نجات و زاد راہ پرتو 9۔ دیوان فارسی 1890ء 10۔ گلدستۂ اصفہان پرتو

آپ نے یکم دسمبر 1926ء کو وفات پائی اور احاطہ مسجد والاجاہی مدراس میں

دفن کئے گئے۔

شکستہ نوشتہ ہے تقدیر کا — بہت پاؤں ٹوٹا بھی تدبیر کا
تری خاک پا رنگ لانے لگی — ملا خاک میں نام اکسیر کا
مرے ہوش بالکل ہرن ہو گئے — جنوں بڑھ گیا چشم بے پیر کا
نظر میں ہے پرتو کی وہ مہرباں — ہے سادہ ورق صفحہ تصویر کا

تجھے پردہ مجھے وحشت ہی سہی — تری اس پردے میں شہرت ہی سہی
تیری محفل میں چلے ذکر مرا — مجھ سے اعدا کو عداوت ہی سہی
جان ہم دیتے ہیں تم بوسہ نہ دیں — یہ عداوت وہ محبت ہی سہی
ظلم کرنا ہی جو تیری خو ہے — صدمے سہنا میری عادت ہی سہی

دل کے بہلانے کو پرتو شب ہجر
اپنے آغوش میں حسرت ہی سہی

انیس عیش جو ہوتے ہیں یار غم بھی ہوتے ہیں — شریک بزم عشرت شامل ماتم بھی ہوتے ہیں
نہیں ہے باعث رنج و الم اپنی پریشانی — خوشی یہ ہے شبیہہ زلف جاناں ہم بھی ہوتے ہیں
ہوائے چشمۂ خورشید میں کیا ذکر پانی کا — کہیں ساقی شرابی طالب زمزم بھی ہوتے ہیں
جو غش آتا ہے حسن روئے روشن دیکھ کر مجھ کو — صفائی دیکھئے قرآں کے سورے دم بھی ہوتے ہیں

صفائی کیا دکھاتی ہے نتیجہ دیکھیں اے پرتو
جمال آئینہ رویاں پہ حیراں ہم بھی ہوتے ہیں

(عروج خیال 1912ء)

بس ہو چکی نماز مصلّا اٹھائیے — اے شیخ وہ شراب کا شیشہ اٹھائیے
آخر کچھ انتہا بھی بھلا ابتدا کی ہے — کب تک کسی کا غمزۂ بیجا اٹھائیے
مدت ہوئی کہ راگ کی محفل جمی نہیں — مطرب ستار لیجئے، طبلا اٹھائیے
چلتے ہو کس خیال میں ٹھوکر کا خوف ہے — پاؤں میں آرہا ہے دوپٹا اٹھائیے

اللہ کا ہے شکر کہ مہمان یار ہو
پرتو درود پڑھ کے نوالا اٹھائیے

مولوی ابوالکرم محمد عبدالقدوس ضوؔ

حضرت مولوی محمد عبد القدوس ضوؔ مدراسی عرف خواجہ ہدایت علی شاہ چشتی القادری بمقام مدراس 5 رمضان 1281 ھ (یکم فروری 1865 ء) بروز پنجشنبہ پیدا ہوئے۔

شریف مدراسی کے معتبر اور اہم شاگردوں میں آپ کا نام بھی ہمیشہ سرفہرست رہے گا آپ نے بھی اپنے استاد کی طرح اردو شاعری میں غالبؔ کے طرز اسلوب کو اپنایا اور غالبؔ کی بے شمار زمینوں میں کامیاب غزلیں لکھیں۔ زبان و بیان پر کافی قدرت حاصل تھی۔ اپنے استادِ محترم کی بہت زیادہ قدر اور احترام کرتے تھے اور ان کی تعریف یوں کرتے تھے۔ ؎

ہے میسر شرف طبع خدا داد مجھے ۔۔۔ میں جو شاگرد شریف الشعراء ہوں ضوؔ

1309 ھ میں آپ کا مجموعہ کلام "دیوان ضوؔ" شائع ہو چکا ہے۔

شریف مدراسی اور شاطرؔ مدراسی کی طرح ضوؔ مدراسی نے بھی اردو غزل کی صنف میں نت نئے تجربے کئے اور اس صنف کو نیا رنگ روپ نئی تب و تاب اور نئی فکری توانائی سے آراستہ کیا۔ اردو غزل کے معماروں میں آپ کا نام بھی ہمیشہ روشن اور تابندہ رہے گا۔

4 جمادی الاول 1365 ھ (7 اپریل 1949 ء) بروز یکشنبہ آپ جاں بحق ہوئے اور ان کی تدفین قبرستان خاندان پا چھا ساہوکار میں عمل میں آئی۔

○

غضب ہے وہ بت دشمنِ جان نکلا ۔۔۔ مرے دل کا یا رب نہ ارمان نکلا
دمِ نزع سودائے زلفِ صنم میں ۔۔۔ جو نکلا ہے دم تو پریشان نکلا
جگر کھا رہا ہے مرا کس مزے سے ۔۔۔ غمِ یار بھی ظرف مہمان نکلا
کہوں عشق کی کیا میں خانہ خرابی ۔۔۔ جہاں یہ گیا کر کے ویران نکلا
فقط تیرے مژگان و ابرو میں قاتل ۔۔۔ مرے قتل کرنے کا سامان نکلا

لیا کھینچ زلفوں سے سودائے رخ نے
مرا کام اے ضو یہ آسان نکلا

خالی جو یار سے مرا آغوش ہو گیا | آنکھوں سے صاف نور بھی روپوش ہو گیا
وہ پوچھتے ہیں حال مری بند ہے زبان | آئے وہ ہوش میں جو میں بے ہوش ہو گیا
روشن ہے صبح و شام چراغ سخن مرا | کہتا ہے کون ضو کو کہ خاموش ہو گیا

تیغ کی منت نہ اے خونخوار کھینچ | مجھ پہ ابرو کی ترے تلوار کھینچ
کچھ بڑھا کر ہاتھ اے آہ رسا | ایک دن تو دامن عیار کھینچ
ہاتھ کٹ جائیں گے اے مانی نہ تو | شکل تیغ ابروئے خمدار کھینچ
سخت تر ہے انتظار یار ضو | درد سر ہے بس نہ اتنا یار کھینچ

نام بھی جوش جنوں کا نہ رہا میرے بعد | ہوا ویران بیابان بلا میرے بعد
کون کہلائے گا ظالم کی نظر کا کشتہ | کون ہوگا ہدف تیر جفا میرے بعد
سرخرو خار بیاباں نہ رہیں گے پھر یوں | کوئی آئے گا نہ پھر آبلہ پا میرے بعد
کس سے اے ابر اتر جائے گا تیرا پانی | کون روئے گا مری طرح بھلا میرے بعد

اک دن تو سوئے عاشق شوریدہ حال دیکھ | یہ اضطراب دیکھ یہ جوش ملال دیکھ
بے تابیوں سے ہے دل آئینہ آب آب | اے شوخ اپنے چہرے کی تاب جمال دیکھ
اے ضو کچھ اور حالت مدراس ہو گئی | باقی نہیں وہ مجمع اہل کمال دیکھ

اک روز بھی ممنون تمنا نہ ہوئے ہم | ہم صحبت بزم بت رعنا نہ ہوئے ہم
کب پاؤں نہیں بادیہ گردی میں ہمارے | بیتاب کب آوارۂ صحرا نہ ہوئے ہم
آرام سے کس روز رہے ارض و سما میں | اس دور میں کس دن تہ و بالا نہ ہوئے ہم
ہنگامہ قیامت کا نہ جب تک کہ ہو اگرم | قائل ترے اے وعدۂ فردا نہ ہوئے ہم

کس روز غم فرقتِ سفاک میں اے صنو
آوارہ و سرگشتہ و رسوا نہ ہوئے ہم

○

دیوانے ہیں تمہارے رخ جانفزا کے لوگ   ہیں سلسلے میں آپ کے زلف رسا کے لوگ
ہر اک کو رشتہ داریٔ زلفِ دراز ہے   بندے ہیں سارے اک صنم دلربا کے لوگ
خالی مجھے نظر نہیں آتی کوئی جگہ   رہتے ہیں ہائے زیرِ زمیں کس بلا کے لوگ
بیماریٔ فراق کا لگّا لگا رہا   دن رات دیکھتے ہی رہے مجھ کو آ کے لوگ
مدراسِ نیک اساس میں صنو کس کو کہتے ہیں
دریافت غیر شہروں سے کرتے ہیں آ کے لوگ

○

جوشِ وحشت ہے یہ لے بت میرے ویرانے کے پاس   ڈر کے قیس آتا نہیں خود تیرے دیوانے کے پاس
سرفرازی موجبِ پستی ہے آخر دیکھئے   آ کے سر شیشہ کے جھک جاتے ہیں پیمانے کے پاس
ہو گیا سکتہ مجھے جلوہ بتوں کا دیکھ کر   تھی عجب قدرت خدا کی آج بت خانے کے پاس
ملتجی رہتا ہے اس سے رسم و راہ زلف کا   ہے دل صد چاک بھی میرا ترے شانے کے پاس
جوشِ وحشت نے کیا آباد پھر زنداں کو صنو
ہو رہا ہے بیڑیوں کا شور دیوانے کے پاس

○

منظور صدیقی

ابو محمد فضل القیوم شریف صدیقی المدنی القادری ابن میرور صدیقی بمقام مدراس 18 68 ء کو پیدا ہوئے۔

آپ بڑے زود گو شاعر تھے، گھنٹوں میں سیکڑوں شعر بے ساختہ کہہ دیتے تھے، آپ کا خاص موضوع نعت گوئی تھا۔ نعت ہی کو آپ نے سب کچھ سمجھا اور اس کا حق بھی ادا کیا۔ فارسی، اردو اور انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا زندگی بھر علم و ادب کی خدمت کی درس و تدریس کے مشغلے کو اپنایا۔ سیکڑوں طلباء اپنے پیچھے چھوڑے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد مع خاندان پاکستان گئے اور وہیں 196 0 ء آپ کا انتقال ہوا۔

ستم ہیں اے ستم ایجاد کیا کیا — کریں تجھ سے تری فریاد کیا کیا
ترے سودائی کو جوش جنوں ہے — ہوئے ہیں دشت سب آباد کیا کیا
نہ نقشہ کھینچ سکا تیری کمر کا — خجل ہیں مانی و بہزاد کیا کیا
نکلتا ہے غبار دل کسی کا — کسی کی خاک ہے برباد کیا کیا
یہاں ہر رنگ میں نیرنگ آرا — ہے آتش آب و خاک و باد کیا کیا

سوئے مدراس اے منظور صد شکر
چلے ویلور سے ہم شاد کیا کیا

مائلؔ مدراسی

ڈاکٹر ممتاز حسین مائلؔ مدراسی مدراس میں پیدا ہوئے۔

مائلؔ مدراسی داغؔ دہلوی کے ہمعصر تھے۔ داغؔ اور مائلؔ میں ہمیشہ نوک جھونک رہتی تھی۔ اہل زبان کو جو اپنی زبان، لہجہ اور زور بیان پر فخر تھا اسے مائلؔ پسند نہیں کرتے تھے۔ سرزمین مدراس سے متعلق ہونے کے باوجود مائلؔ نے وہ زبان اختیار کی جو شمال کے ارباب قلم کے لئے مایہ ناز تھی۔ داغؔ نے جب یہ کہا ؎

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہدو — کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

تو مائلؔ نے داغؔ کے شعر کا یوں جواب دیا ؎

سخن کا بڑا جن کو دعویٰ ہے مائلؔ — انھیں بھی تو آئی زباں آتے آتے

حضرت مائلؔ کا کلام، فن اور زبان کی رعنائیوں کا ایک حسین امتزاج ہے۔ کلام میں بے ساختگی، سلاست اور روانی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مائلؔ نے شعوری یا لاشعوری طور پر داغؔ ہی کے لہجہ کو اپنایا ہے۔ مائلؔ کے خیالات میں تنوع اور جدت بھی پائی جاتی ہے۔

○

نکیرین تم جا کے حوروں کو بھیجو — نئے گھر میں تنہا ہم آئے ہوتے ہیں
اگرچہ وہ بے پردہ آئے ہوتے ہیں — چھپانے کی چیزیں چھپائے ہوتے ہیں
میرا دل ہے قرباں، آنکھوں پہ میری — وہ جب سے نظر میں سمائے ہوتے ہیں

○

حکیم سید شاہ محمد صبغت اللہ حسینی القادری نور مدراسی

حکیم سید شاہ محمد صبغت اللہ حسینی القادری نورؔ مدراسی 28 رمضان 1869ء 1286ھ بمقام میلاپور مدراس میں پیدا ہوتے۔ آپ کے والد حکیم سید شاہ اسمٰعیل میلاپوری شہر مدراس کے مشہور حکیم تھے۔ نورؔ مدراسی کا شمار ان کے والد کی طرح وقت کے ممتاز حکیموں میں ہوتا تھا آپ کو فن طبابت کے علاوہ فن کشتی پر بھی اچھا خاصا ملکہ حاصل تھا۔ آپ بیک وقت عربی، فارسی اور اردو کے بہترین استاد تھے۔ مدراس کے مختلف مدارس میں دینیات کے استاد کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ کا مرتب کردہ رسالہ دینیات "نورالاسلام" ایک عرصہ دراز تک مدراس کے اردو مدارس میں داخل نصاب تھا نورؔ مدراسی ایک فکری شاعر تھے۔ ابتدا میں شمال کے مختلف اساتذہ کو کلام دکھاتے رہے بعد میں مستقل طور پر شمشاد دہلوی کے شاگرد ہوگئے۔ آپ کا رجحان زیادہ تر نعت کی طرف تھا۔ نعت گوئی میں آپ نے وہ نت نئے پھول کھلائے جن کی خوشبو سے آج بھی مدراس کے اکثر احباب کے دل و دماغ معطر و منور ہیں۔ مرثیہ گوئی میں آپ نے بڑے عہد آفریں نقوش چھوڑے ہیں آپ کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی نے اپنوں میں شمار کیا تھا۔ مشاعروں میں کلام پڑھنے کا انداز اتنا دامن کشِ دل ہوتا تھا کہ مشاعروں میں ایک سماں سا بندھ جاتا تھا۔ افسوس ہے کہ آپ کا کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہ آسکا۔ لیکن آپ کے لکھے ہوئے کئی قصائد مدراس کی خواتین میں مقبول ہیں۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ عبدالعزیز عادلؔ عبدالغنی خاں حائلؔ، اور رائلؔ مدراسی، انستؔ مدراسی آپ کے حلقہ تلامذہ میں سے تھے۔

1933ء 1352ھ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

○

تڑپتا ہے دل ناشاد کیا کیا — ستاتی ہے تمہاری یاد کیا کیا
نہ بسنے پائی پھر اس دل کی بستی — ہوئے اجڑے دیار آباد کیا کیا
جب آتے اک نئی شانِ ستم سے — ستم گر ہیں ستم ایجاد کیا کیا

جو کھینچی تیغ قاتل نے تو مجھ کو　　　اجل نے دی مبارکباد کیا کیا
میں اپنی سخت جانی سے ہوں نادم　　　رکا ہے خنجر جلاد کیا کیا
ترے در سے ہوا نے جب اڑائی　　　مری مٹی ہوئی برباد کیا کیا
خدا سے کرتے ہیں نوؔر ان کا شکوہ
بتوں سے کر چکے فریاد کیا کیا

○

مرا دل پھیر دیں ان سے تو ایسا ہو نہیں سکتا　　　غضب یہ ہے کہ مجھ سے بھی تقاضا ہو نہیں سکتا
مزا کیا اے مسیحا دل سے دردِ عشق جب کم ہو　　　وہی بیمار اچھا ہے جو اچھا ہو نہیں سکتا
کوئی پردہ نشیں خلوت سرائے دل میں بیٹھا ہے　　　خیالِ غیر سے کہہ دو کہ پردا ہو نہیں سکتا
اٹھاتے کیوں نہیں میرے عدو کو اپنی محفل سے　　　تم ایسا کر نہیں سکتے کہ ایسا ہو نہیں سکتا
حسینانِ جہاں اے نوؔر میرے دیکھے بھالے ہیں
وہ صورت ہو نہیں سکتی وہ نقشہ ہو نہیں سکتا

○

(معراجِ خیال 1914ء)

اثیم ترپاتوری

سید سلیمان حسینی الحسنی القادری اثیمؔ ترپاتوری 1286ھ ترپاتور (شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے۔ حضرت وجاہت (مدیر "کمال" دہلی) کو کلام دکھاتے تھے 1949ء سے 1911ء کے درمیان آپ کا کلام "جلوہ یار" میرٹھ اور "کمال" دہلی میں بالالتزام شائع ہوتا رہا۔ آپ کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو فارسی، عربی اور اردو زبانوں پر بھرپور قدرت حاصل تھی۔ ترپاتور میں آپ مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

1369ھ میں آپ راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

دل میں کھٹک تو درد ہمارے جگر میں ہے — شوخی غضب کی آپ کے تیرِ نظر میں ہے
سودا کسی کی زلف کا جس دن سے سر میں ہے — تاریک دو جہان ہماری نظر میں ہے
مسکن پذیر دل میں ہے ارمانِ وصلِ یار — اس میہماں کو دیکھئے کس اجڑے گھر میں ہے
سرخی نہیں ہے پان کی دندانِ یار پر — کانِ عقیق چشمۂ آبِ گہر میں ہے
آتے ہیں اس ادا سے شبِ وصل وہ اثیمؔ — شمشیر ہاتھ میں ہے تو خنجر کمر میں ہے

"جلوۂ یار" میرٹھ 1911ء

میں فرقت میں کیا ناتواں ہو گیا — تماشا ہے پیر و جواں ہو گیا
نشاں اس کا ڈھونڈے سے ملتا نہیں — مرا دل بھی کیا لامکاں ہو گیا
تری کج ادائی نے مارا مجھے — مرا کام نامہرباں ہو گیا

نگہ شوخیوں پہ اڑی رہ گئی — مرے دل میں برچھی گڑی رہ گئی
اترتی نہیں دل سے تصویرِ یار — یہ مورت حرم میں جڑی رہ گئی
ادا نے ہی مجھے مار ڈالا اثیمؔ — قضا دیکھتی منہ کھڑی رہ گئی

رباعیات

ہستی کا تری رازمرے عزوجل ۔۔۔ کیا ہوگا اشارات وکنایات سے حل
دعویٰ تری معرفت کا کیا کوئی کرے ۔۔۔ جب معترف عجز ہے عقل اول

واجب کے وجود پہ ہے، ممکن موقوف ۔۔۔ بے ذات کوئی صفت نہیں ہے موصوف
مخلوق ہے موجودگیٔ رب کی دلیل ۔۔۔ نقطے کا پتہ دیتی ہے ہستیٔ حروف

پردے پردے میں نہ یوں دعویٔ یکتائی کر ۔۔۔ بے حجابانہ نکل انجمن آرائی کر
تو مری جان پہ کر جور باندازۂ ظرف ۔۔۔ ہائے اس طرح نہ توہینِ شکیبائی کر
عام جلوہ ہے ترا، عام ہے تیری رحمت ۔۔۔ مرحمت کور کو بھی سرمۂ بینائی کر
قلبِ صافی ہے ترا، منزلِ لیلیٰ غافل ۔۔۔ تو شب و روز نہ یوں بادیہ پیمائی کر
اپنے دامن کو بنا سیرگہِ اہلِ نظر ۔۔۔ دل کے ناسور کو محوِ چمن آرائی کر
شادمانی سے بدل دے اثرِ رنجِ فراق ۔۔۔ دیدۂ دل کو چراغِ شبِ تنہائی کر
تیرے سینے میں بھی مستور ہیں اسرارِ بقا ۔۔۔ دل کو وارستۂ احسانِ مسیحائی کر
تابکے اپنی حقیقت سے تجھے بے خبری ۔۔۔ چشمِ غافل کو ذرا محوِ شناسائی کر
اہلِ محفل کو دکھا رنگ کمالِ وحدت ۔۔۔ ذرّہ ذرّہ سے عیاں جلوۂ سینائی کر

محفلِ یار میں پانا ہے اگر بار اثیمؔ
اس کی چوکھٹ پہ ابھی ناصیہ فرسائی کر

علّام ویلوری

مولانا مولوی مفتی سید عبدالعلام، علّام ویلوری مدرسہ لطیفیہ کے فارغ اور فن خطاطی کے ماہر، ویلور کے عوام کے ہردلعزیز شاعر تھے۔ حضرت فائی ترپاتوری کے خاص الخاص مشیر بھی تھے۔ فن کتابت آپ نے حضرت فانی سے سیکھی تھی اور اس فن میں آپ نے جو جوہر دکھائے ہیں وہ آج بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ محمد حسین چیدہ کے سفرنامہ "حرمین الشریفین" میں آپ نے اپنے فن خوش نویسی کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ آپ بڑے آزاد منش بزرگ تھے۔ ترپاتور اور ویلور کے "گردہ" کے لئے محرم کے ایام میں فی البدیہہ اشعار لکھنے میں بہت طاق تھے۔ اس وجہ سے بھی ویلور کے عوام میں وہ بہت مشہور اور مقبول رہے ہیں۔

آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ "اعجازِ کلام" (1304ھ) منظرِ عام پر آچکا ہے۔

○

گردوں پہ میرا اخترِ فکر رسا ہے آج — دل میں مرے بھرا ہوا نور و ضیا ہے آج
ظلمت کا رنگ پیش نظر ہٹ گیا ہے آج — دفتر خدائی کا مرے آگے کھلا ہے آج

پروین خوشہ چیں مرے خرمن کا بن گیا
خورشید صاف گل ترے گلشن کا بن گیا

میرے سوائے عکس نبیؐ کون اب اٹھائے — اور دل کے آئینہ کو مصفّا بنا کے لائے
جب قوتِ مصوری میری وہ دیکھ پائے — بہزاد کیوں نہ میرے مرقع سے رشک کھائے

○

فضل اللہ طاہر آمبوری

فضل اللہ طاہر آمبوری آمبور میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی۔ اور آپ نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ درس و تدریس میں گزارا۔ آپ پہلے حضرت محوی صدیقی لکھنوی سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے رہے اور بعد میں علامہ شاکر نائطی کی طرف رجوع ہوئے آپ طبعی طور پر غزل کی طرف زیادہ مائل تھے شاعری میں فارسی تراکیب اور بندشوں کو بہت زیادہ پسند کرتے۔ آخری عمر میں آپ پر جمود سا چھا گیا تھا۔ ہوسکتا ہے آپ نے فقدان فرصت اور غم روزگاری کی وجہ سے شاعری سے گریز ہی کو مناسب سمجھا ہو۔

○

اے خدا! مجھ کو عطا دیدۂ بینا کر دے — مردمِ چشم کو تو ہمسر موسیٰ کر دے
زنگ دل کے لئے ہوتا ہے یہی اک صیقل — جوہرِ عشق اس آئینے میں پیدا کر دے
تیری نظروں میں اگر جرم ہے یہ ذوق طلب — داغِ دل ہی کو مرے شعلۂ سینا کر دے

○

وہ آرہے ہیں برق تجلی لئے ہوئے — ہر جنبش نظر ہے تماشا لئے ہوئے
اپنے نیاز سجدہ میں ہوں ناز سے قریب — میری جبیں ہے عرش معلی لئے ہوئے
طاہر بہار بھی تو نہیں باعث نشاط — ہر داغ لالہ ہے غم دنیا لئے ہوئے

○

سعد مدراسی

سعدالدین سعدؔ 1870ء 1287ھ بمقام مدراس پیدا ہوئے۔ آپ مدراس کے نائط خاندان کے رکن تھے۔ علوم متداولہ سے واقف تھے۔ آپ بھی ابتدا میں شریف مدراسی کے شاگرد تھے بعد میں امیرؔ مینائی کے شاگرد ہوئے۔ سعدؔ فن خطاطی میں بھی ماہر تھے۔ آپ اکثر نعت ہی کہتے تھے۔ انھیں فن تاریخ میں خاص کمال تھا۔ سعدالدین سعدؔ کی ایک مثنوی "مثنوی سعدؔ" 1325ھ سے پہلے مطبع نامی مدراس میں چھپی تھی جو آج نایاب ہے
آپ کا انتقال 1369ھ میں ہوا۔

مر گئے ہم پہنچ کے یثرب میں   ہو گیا وصل میں وصال اپنا

راز ترچناپلوی

عبدالغفور رازؔ ترچناپلوی کے اہم ترین شاعروں رعاجزؔ، غلام مصطفیٰ مرغوبؔ[1]، فرحتؔ، ابن الدین امینؔ (المتوفی 1933ء) سید غلام رسول سیفؔ، شاہ منعم اللہ منعمؔ، عارف سہروردی، قادر حسین شہیرؔ، قمر الدین منیرؔ (المتوفی 1950ء)) میں سے ایک ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت ترچناپلی کے مذہبی اور دنیاوی ماحول میں ہوئی۔ پتہ نہیں کن حالات کے تحت مدراس آئے اور برسوں مدراس کے کئی کارپوریشن اسکولوں میں مدرس رہے۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مشکل سے مشکل زمینوں میں شعر کہنے کے عادی تھے۔ اردو شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔

آپ 1870ء میں ترچناپلی میں پیدا ہوئے اور 1938ء میں آپ نے مدراس میں وفات پائی، احاطۂ بیوستان کی درگاہ میں مدفون ہیں۔

رات باقی ہے ابھی یاں سے نہ جالے شمع رو — صبح ہونے دے گجر کہئیے اذاں ہونے تو دے
بوسۂ لب کا فقط اے رازؔ تو پایا مزا — یار کمسن ہے ابھی عجز بیاں ہونے تو دے

---

[1] مصنف چمنستان مرغوب مطبوعہ 1877ء

فانؔی ترپاتوری

حضرت فانؔی ترپاتوری (شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم وتربیت علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔ اگرچہ آپ زیادہ معروف نہیں تھے۔ لیکن آپ کے تبحر علمی، ادبی استعداد اور ادراک فن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے ماہر تھے اور لسانی باریکیوں سے کما حقہٗ آگاہ تھے۔ تمام عمر درس وتدریس میں گذری غزل میں غالبؔ کے آہنگ کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے اسی آہنگ میں آپ نے بھی غزلیں کہنے کی کوشش کی۔ بہت کم گو تھے۔ آپ کی شاعری کا سرمایہ پتہ نہیں کس کے پاس محفوظ ہے؟

○

طائر سدرہ کو فکر بال و پر بے سود ہے شہپر جبرئیل استقبال کو موجود ہے
عام ہے دستور روتے بیٹھنا تقدیر کو توڑکر تو پھینک دے تقدیر کی زنجیر کو
حال اور ماضی کی لایعنی کہانی ہو چکی تو نے دیکھی ہے جو دنیا وہ پرانی ہو چکی

○

اس دَور میں دیکھتا نہیں کوئی بشر تقویٰ کہ تقدّس و شرافت کی تہر
درکار ہے کچھ عزت و توقیر اگر زر چاہیے زر چاہیے زر چاہیے زر

○

برگشتگیٔ بخت کی تقدیر عبث فریاد جفائے فلکِ پیر عبث
جب تک کہ لیا نہ جائے تدبیر سے کام بیجا گلۂ خوبیٔ تقدیر عبث

○

اپنے کردار سے جو شرمائے کبھی یوں نخوت و کبر سے گھبرائے کبھی
انسان اگر عیوب اپنے دیکھے بکھ عیب کسی میں نہ نظر آئے کبھی

○

گوہر مدراسی

مولوی محمد منور حسین گوہر مدراسی 1873ء 1288ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم اپنے ابا حضور سے حاصل کی آپ۔ مدراس یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں جونیر لکچرر (اسلامک) کے عہدے پر مامور ہوئے 1930ء میں وظیفہ یاب ہوئے اس اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ملازمت کے دوران آپ نے جو تحقیقی کارنامہ انجام دیا وہ آج ہمارے سامنے "سخن ورانِ بلند فکر" جلد اول 1936ء اور جلد دوم 1953ء (جنوبی ہند اور دکن میں فارسی اور اردو شعراء کا تذکرہ) کے روپ میں موجود ہے۔ آپ نے فارسی غزلیات کا ایک مجموعہ "مخزنِ سعادت" شائع کیا جس کے نسخے آج بالکل نایاب ہیں 1931ء میں آپ کا شعری مجموعہ "گوہر آبدار" منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ کی تخلیقات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری قدیم روایات کی پاسداری اور کلاسیکی قدروں سے آراستہ ہے۔ آپ اپنی آخری عمر میں حیدرآباد گئے اور وہیں بروز ہفتہ ربیع الاول 1361ھ 14 اپریل 1941ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

حال ہی میں آپ کا ایک مجموعہ "باغ رنگین" نظر سے گزرا جس میں انھوں نے سلطان دکن کی مدح میں قصائد لکھے ہیں جس کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔

○

جس میں سودائے محبت ہے وہ سر اچھا ہے
عشق کا داغ ہو جس میں وہ جگر اچھا ہے

تم بھی ہو پردہ نشین یہ بھی ہے پردے کا مکان
میرے دل میں رہو لے جان یہ گھر اچھا ہے

حسن والے ہیں زمانے میں ہزاروں لیکن
سب حسینوں سے مرا رشک قمر اچھا ہے

دل میں گھر کر گیا اور مجھ کو خبر تک نہ ہوئی
لاکھ تیروں سے ترا تیر نظر اچھا ہے

کبھی بھولے سے خبر لی نہ فلک نے گوہر
اس پہ یہ ناز کہ نالوں میں اثر اچھا ہے

ساتھ اس حور کے خلوت میں صبا بھی آئی — جو کہ ہے وصل کی دشمن وہ ادا بھی آئی
کام عاشق کا کیا ان کی ادا نے پورا — وہ جو آئے تو دبے پاؤں قضا بھی آئی
دل سے اپنے نہ مٹا نقش وفا ہاں نہ مٹا — گو بہت یاد مجھے تیری جفا بھی آئی
شور نالوں کا شب ہجر، فلک پر پہنچا — عرش تک جا کے مری آہِ رسا بھی آئی

روز دم بھرتے ہو دن رات بتوں کا گوہر
سچ کہو تم کو کبھی یادِ خدا بھی آئی

حسیں ہے مہ جبیں ہے نازنیں ہے — کہیں اس حور کا ثانی نہیں ہے
یہ کیا بیداد اے چرخ ستم گر — کہیں معشوق ہے عاشق کہیں ہے
دماغ اپنا نہ ہو کیوں کر معطر — مجھے سودائے زلف عنبریں ہے
اگر برقع کی ہے تم کو ضرورت — مرا دامن ہے میری آستیں ہے

چھپاؤں کیوں نہ راز عشق گوہر
مرا معشوق اک پردہ نشیں ہے

دل میں تری الفت کی ادھر جلوہ گری ہے — سینے میں ادھر جلوۂ داغ جگری ہے
اے چرخ نہ دل توڑ مرا سنگ جفا سے — یہ جام وہ ہے جس میں مئے عشق بھری ہے
اس چشم فسوں ساز میں ہیں لاکھوں ادائیں — کیا مست ہے کیا شوخ ہے کیا ناز بھری ہے
اس گل کو اڑا کر نہیں لاتی ہے مرے پاس — روٹھی ہوئی کیوں مجھ سے نسیم سحری ہے

حوریں بھی جسے دیکھ کے لیتی ہیں بلائیں
گوہر مرا معشوق وہی رشک پری ہے

سید شاہ محمد عبدالرحمٰن کمالؔ

حضرت پیر مولانا مولوی شیخ المشائخ حکیم سید شاہ محمد عبدالرحمٰن قادری چشتی و شاذلی کمالؔ آرکاٹی 7 مئی 1876ء 1275ھ کو بمقام آرکاٹ پیدا ہوئے نہ جانے کن حالات کے تحت کب اور کیوں مدراس آئے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا بہرکیف آپ اپنے وقت کے بہت عظیم بزرگ صوفی تھے۔ نوابین آرکاٹ کے دم توڑتے ہوئے دور میں آپکے علم و فن کی بہت دور دور تک مہک اور روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ آپ نہ صرف اپنے دور کے جدید عالم اور قادر الکلام شاعر تھے بلکہ آپ سچے عاشقِ سرورِ دو عالمؐ بھی تھے آپ کی شاعری سے بذاتِ خود آپ کی رسول اکرمؐ سے پرنور اور والہانہ محبت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی نعتوں میں تصوف کی نورانی ست رنگ چھوٹ انگڑائیاں لیتی ہوئی عقیدتوں کے آسمانوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ آپکے نعتیہ کلام کا ایک کتابچہ "تصریفات کمالؔ" 1951ء منظرِ عام پر آچکا ہے جسے حضرت موصوف کے عقیدتمند جناب بشیرالدین احمد ابن محی الدین احمد صاحب مرحوم، جاگیردار و انعام دار پولاعلاقہ پونیری ہلال پریس مدراس 5 سے شائع کیا تھا۔

10 جون 1951ء 1370ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

وہ نبیوں میں سب سے سوا بن کے آیا
محمدؐ رسولِ خدا بن کے آیا

وہ تھا زیبِ ذاتِ الٰہی میں چھپ کر
وہاں سے یہاں حق نما بن کے آیا

تھا منظور دکھلانا جلوہ خدا کا
لیا روپ خود مصطفٰے ہی کے آیا

یہ ہے مظہرِ ذاتِ احمد مقرر
کہ خود منتہی منتہا بن کے آیا

شریعت کی پوشاک دے کر جہاں کو
طریقت میں حق کی ادا بن کے آیا

کمالؔ اس کی رنگت کا دیکھا تماشا
ہر ایک رنگ میں جا بجا بن کے آیا

ٹھکانہ میرا پیارے، کوچۂ گرداب میں رہتا
یہ بندہ روضۂ اطہر کے آب و تاب میں رہتا

زمیں تھوڑی مدینہ کی میسر گرچہ ہو جاتی
حقیقت یہ کہ میرا نام بھی احباب میں رہتا

نظرِ الطاف کی پڑ جاتی مجھ پہ یا رسول اللہ
نہ ہرگز میں کبھی دنیا کے پیچ و تاب میں رہتا

اسی حکمِ نوازش نے مجھے پابند کر ڈالا
کمالؔ اس رازداری کے کہاں آداب میں رہتا

شاطر مدراسی

شمس العلماء لسان الحکمت نواب عبدالرحمٰن خاں بہادر شاطر مدراسی فرزند خان بہادر نواب عبدالمغنی خان امیر 1877ء 1294ھ بمقام مدراس پیدا ہوئے۔ نواب عبدالمغنی خان امیر[1] فارسی اور عربی کے بہترین عالم اور شاعر تھے۔ مغنی خان امیر کے تین فرزند محمد منور خان گوہر، عبدالقادر اختر اور عبدالرحمٰن خان شاطر ہیں گوہر اور شاطر کی ادبی خدمات کو جنوبی ہند کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکی۔ گوہر کی نثری خدمات جہاں مدراس کے قدیم شعراء سے ملاقات کراتی ہیں وہاں شاطر کی شعری اڑانیں ہمیں ان کی فکر کی آسمانی وسعتوں تک لے جاتی ہیں خصوصاً قصیدہ "اعجاز عشق" (مطبوعہ 1904 کے مطالعے کے بعد یہ بات یقین کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ آج تک اردو ادب کی تاریخ میں اس قسم کے انوکھے انداز کا "قصیدہ" نہیں پیش ہوا ہے۔ شاطر کا یہ شعری کارنامہ اردو ادب کی بارگاہ میں ایک عظیم ترین اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

شاطر مدراسی وہ خوش نصیب شاعر ہیں جنہیں علم و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا اور ساتھ ہی انھیں حضرت الحاج مولانا مولوی سید شاہ حسین محرم قادری چشتی جیسا شیخ اور شریف الشعراء حضرت صادق الحسینی شریف مدراسی جیسا شہرِ استادؔ رہ نمائی کے لئے نصیب ہوا تھا۔

حضرت شاطر اپنے شیخ کی تعریف میں رقمطراز ہیں بچپن میں کچھ مذہبی شکوک پیدا ہوئے اور علوم حکمت و فلسفہ کا شوق ساتھ لائے چنانچہ میں نے علم کلام اور یونانیوں، انگریزوں، ہندوؤں سب کا فلسفہ پڑھا اور برسوں غور کیا لیکن مجھے پھر بھی اطمینان نہیں ہوا آخر بمصداق

عشق می دارم و امید کہ ایں فن شریف
چوں ہنر ہائے دگر موجب حرماں نشود

تصوف کی طرف مائل ہوا۔ مدتوں کے غور و فکر اور بحث و مباحث کے بعد مرشد حق

---

[1] نظم دلچسپِ امیر۔ مرتب گوہر مدراسی

آگاہ طریقت پناہ جان و دل وسیلتنا فی الدارین حضرت مولانا مولوی سید شاہ حسین قادری محرم کے دست مبارک پر بیعت کی اور پیر و مرشد نے مجھے دہریت و مادیت کے تاریک غاروں سے بچاکر صراط مستقیم توحید کی راہ دکھائی"

اور اپنے استاد حضرت شریف مدراسی کے تعلق سے اپنے اشعار میں جگہ جگہ اپنے فیض یاب ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

شاطر بڑے دقیقہ رس اور نغز گو تھے۔ فلسفۂ حیات آپ کا خاص موضوع تھا۔ علت و معلول کی پیچیدگیوں سے واقف تھے۔ زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس دور میں جبکہ تامل ناڈو میں امیر، داغ اور جلال کے مکاتیب خیال کے علمبرداروں کی گرم بازاری تھی۔ شاطر نے اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی اور قصیدہ کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور قصیدہ "اعجاز عشق" لکھا۔ یہ قصیدہ شاطر نے اپنے شیخ حضرت الحاج سید شاہ حسین قادری محرم میلاپوری کی شان میں تخلیق کیا تھا) اس قصیدے نے مولانا حالی، علامہ اقبال جیسے مشاہیر وقت سے خراج تحسین حاصل کیا۔

شاطر نے تفنن طبع کے پیش نظر شاعری نہیں کی۔ آپ کے سامنے ایک مقصد تھا، ایک عظیم آدرش، چنانچہ آپ نے اپنے بلند مقصد کی تکمیل اور ذوق کی تسکین کے لئے ایک نیا اسلوب اختیار کیا یہ اس دور کی بات ہے کہ جب ترقی پسند تحریک وجود میں نہیں آئی تھی اور شاطر نے اردو ادب کو ایک انقلابی تصور دیا۔ معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا، میرے خیال میں فکری شاعری کی بنیاد خصوصاً تامل ناڈو میں شاطر ہی نے ڈالی اور تنوع خیالات سے اس دور کے ارباب قلم کو متاثر کیا۔ کلام میں جدت کے ساتھ رچاؤ اور لہجے کا وقار پایا جاتا ہے۔

شاطر کی شعری استعداد، فکری اور فنی شگافیوں کا اعتراف مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، شاد عظیم آبادی، اکبر الہ آبادی، عبدالحلیم شرر، مولوی ذکا اللہ دہلوی، جلال لکھنوی، نذیر احمد دہلوی نے کیا ہے اور قصیدہ "اعجاز عشق" کو اپنے دور کا "کارنامۂ دانش" کہا ہے۔

شاطر الفاظ کے صحیح مصرف سے واقف تھے اسی لئے ان کی تخلیقات میں الفاظ کی بندش تراکیب کی جلوہ طرازی، عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاطر نے بھی موجودہ دور کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر مثنوی کہی ہے۔ شاطر کا تصور حیات معاشرے

کے ردعمل کے طور پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ شاطر کا بے ساختہ لہجہ دل کو چھو لیتا ہے اور آپ کی تخلیقات میں گداختگی کے وہ عناصر پائے جاتے ہیں جو ہمیں صرف میر تقی میر کے ہاں ملتے ہیں۔ شاطر نے معاشرے میں پیدا ہونے والے مذموم، دل شکن اور روح فرسا حالات کی عکاسی اپنے قصیدے میں بڑی چابکدستی اور فنکارانہ انداز میں کی ہے۔ آپ کے انداز میں دردمندی بھی ہے اور زیر لب تبسم کا شفق بھی۔ شاطر ہر لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ان کی شخصیت، فن اور تخلیقات کا مبسوط تجزیہ کیا جائے۔

شاطر مدراسی کی حسب ذیل تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

1۔ "اعجاز عشق" 2۔ ضمیمہ اعجاز عشق 3۔ گلدستۂ شاطر 4۔ احسان عشق 5۔ ضمیمہ احسان عشق 6۔ چار جوہر۔

شاطر نے 10 ربیع الاول 1382ھ مطابق 17 مارچ 1943ء میں وفات پائی اور کرشنا پیٹ، مدراس کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

کبھی جو خواب میں محبوب جلوہ فرما ہو
نظر کا تار رگِ دیدۂ زلیخا ہو

فلک کے سنگِ حوادث کا پھر اُسے کیا ڈر
خدا کے سایہ کا جس سرزمیں پہ سایا ہو

محبوس دیکھے جو پھر شمس کو تو پھر ہم جانیں
نظر فروز جو تیرا رُخِ دِل آرا ہو

اب اور کیا ہو ترقی زبانِ اردو کی
وہ تیرا شکر ادا کر سکے جو گویا ہو

فدا ہو تو سئے وحدت پہ صورتِ یوسف
غلط ہے اس کو اگر ہمسری کا دعویٰ ہو

دکن امیدوں کا کعبہ بنا ہے لے دہلی
اب اس کے بعد نہ تحویلِ قبلۂ اعلا ہو

یہ حسن اس پہ شجاعت یہ ہے خدا کی شان
کہ صید افگن شیران غزالِ رعنا ہو

نہیں خدا کی یہ قدرت تو کیا ہے لے دہری
کہ ایک شخص ہو حاتم ہو رستم ہو کسریٰ ہو

تمام ہند سے لی میں نے داد لے شاطر
بجا ہے مجھ کو اگر شاعری کا دعویٰ ہو

رندوں کے دل کی ہے تجھ کو خبر
کیوں تیر ملامت کو کماں میں جوڑا

واعظ کبھی موم ہے وہ گا ہے پتھر
واعظ پک کر جگر ہوا ہے پھوڑا

کل پی نہ سکے ذکر قیامت پر اشک
توڑی سو بار اگرچہ توبہ لیکن

بھر بھر کے آج پی رہے ہیں ساغر
صد شکر کہ ہم نے نہ کوئی دل توڑا

غلام علی نائطی صاحب

مولوی غلام علی نائطی صاحب (فرزند نواب احتشام الدولہ مرحوم) 1878ء 1295ھ بمقام مدراس پیدا ہوئے۔ آپ اہلِ نائطہ سے تھے۔ امیر مینائی، داغ دہلوی اور جلال لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کی ذہنی، علمی تربیت اور نشو و نما شہر مدراس کے عالمانہ اور فاضلانہ ماحول میں ہوئی۔ اپنے اساتذہ داغ دہلوی اور جلال لکھنوی سے بے حد متاثر رہے یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کا انداز بیان اور خاص خاص ترکیبوں کی پھلجھڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کا رجحان زیادہ تر نعت کی طرف تھا۔ زندگی کا زیادہ تر حصہ عشقِ رسولؐ میں گزرا تھا۔ آپ کی اکثر نعتوں میں آپ کی نبیؐ اکرم سے بے پناہ عقیدت اور والہانہ محبت کے نقوش روشن ہیں۔

آپ کے مجموعہ کلامؐ کلیات صاحبؐ" مطبوعہ 1972ء (اردو اکیڈمی حیدر آباد) کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے شاعری میں بڑے انوکھے تجربے کئے ہیں۔ غزل کی صنعت کو بھی آپ نے نئی زمین اور نئے آسمان دیتے ہوئے فکری صلاحیتوں کو اونچا اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

شرارِ آہ کا اپنی ظہور تھا کہ نہ تھا ــــــ کلیم اس کی گواہوں میں طور تھا کہ نہ تھا
ہمارا نالۂ دل مکاں میں کیوں پڑا ــــــ مسافر سفر راہ دور تھا کہ نہ تھا
قصور نالۂ دل کا نہیں ہے کچھ صاحبؔ ــــــ کہ لامکاں کا جو رستہ ہے دور تھا کہ نہ تھا

تیغ کھینچے ہوئے جب قاتل دوراں نکلا ــــــ سر بکف مجمع عاشق سرِ میدان نکلا
قیس و فرہاد قدم لینے کو آئے بڑھ کر ــــــ تیرا وحشی جو سوئے کوہ و بیاباں نکلا
شب کو تو دیر میں دن کو ہے حرم میں صاحبؔ ــــــ گبر کا گبر مسلماں کا مسلماں نکلا

اس طرح کی بہت ساری غزلیں آپ کے مجموعہ میں مل جاتی ہیں ان غزلوں سے آپ کی مضمون آفرینی، قادر الکلامی، فکری پرواز اور احساسات میں نئی فضا سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کا انتقال 1957ء میں ہوا۔

ؐ حضرت کاوش بدری کی نجی لائبریری میں یہ مجموعہ محفوظ ہے۔

فہیم آمبوری

محمد عبدالعزیز فہیم آمبوری بمقام آمبور (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ آپ نہایت خوش فکر شاعر تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے آپ کی مادری زبان اردو نہیں تھی لیکن آپ نے اردو زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ آپ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے خوش بیان مقرر بھی تھے۔ زبان اور اردو شاعری سے آپ کا گہرا تعلق دیکھ کر اپنے دور کے ارباب قلم نے آپ کو فصیح اللسان کا خطاب دیا تھا۔ آپ نے تامل ناڈو کے کئی عظیم مشاعروں کی صدارت بھی کی تھی۔ ابتداء میں آپ حضرت خواجہ عشرت لکھنوی کے حلقۂ تلامذہ سے وابستہ تھے پھر بعد میں مولانا ناطق گلاوٹھی سے مستفیض ہوتے۔ آپ کے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ "گلزار فہیم" 1960ء میں چھپ چکا ہے۔ آپ کے یہاں بھی صالح روایات کے نقوش کئی جگہ ملتے ہیں اور آپ کی شاعری تکلف بے جا اور تصنع سے بالکل پاک ہے۔ زبان کے نشیب و فراز کا بہت خیال رکھتے تھے۔ تحت میں کلام پڑھنے کا انداز جادو کا کام کرتا تھا۔ یہ اس دور کی خصوصیت ہے کہ مشاعرے میں ترنم کو نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آپ کی تخلیقات آپ کی افتاد طبع کی آئینہ دار ہیں۔

1943ء میں ایک جاں گسل حادثہ کا شکار ہو کر آپ نے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔

○

ہے زبان قاصر مری مرحوم کے حالات میں
سادگی کو دخل تھا واللہ اس کی ذات میں

عقدہ ہائے زندگی کو خضر کیا جانے فہیم
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں

○

صمیم آمبوری

سید یعقوب صمیم آمبوری بھی آمبور کے کہنہ مشق شاعروں میں سے تھے۔ فہیم آمبوری کے ہم عصر ہونے کے باوجود آپ کی غزل کا لہجہ ذرا الجھا ہوا تھا۔ حضرت برتر حیدر آبادی کے حلقۂ تلامذہ میں سے تھے۔ سنا ہے کہ حضرت صمیم کے کلام کی اصلاح کے وقت حضرت برتر حیدر آبادی بے ساختہ داد دے کر آپ کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی فرماتے تھے۔ آپ کا کلام بھی چھپ چکا ہے۔ لیکن نایاب ہے۔ آپ کی تاریخ پیدائش اور وفات کا بھی کوئی ہلکا سا نقش کہیں نہیں ملتا۔

○

نہ چھوڑے گی پیچھا یہ گردش ہماری — ہوئی ہے ازل ہی سے بندش ہماری
مسرت کہا جب سے عاشق ہوئے ہم — نہ پوری ہوئی کوئی خواہش ہماری
جو قسمت میں ہوگا وہ ہو کے رہے گا — یہ بے سود ہے ساری کوشش ہماری
صمیم آج رونا اگر ہے تو یہ ہے — رہی آہ ناکام کوشش ہماری

○

قدیر آمبوری

بلی محمد ابراہیم قدیر آمبوری بمقام آمبور (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے. آپ کو بھی اردو شاعری کے تمام تر اصناف پر قدرت حاصل تھی. آپ کا شعری مجموعہ "چراغِ مجلس" 1919ء 1337ھ میں شائع ہو چکا ہے. آپ روحی آمبوری اور فہیم آمبوری کے ہم عصر تھے. حضرت تجمل جلال پوری کے شاگرد تھے. آپ کی دو مثنویاں "فروغِ دل" اور "گلزارِ رحمت" 1921ء سے قبل منظرِ عام پر آچکی ہیں. اس کے علاوہ حرب تامل پر بھی آپ کا ایک رسالہ بنام "سخاوت نامہ" 1916ء میں چھپ چکا ہے آپ کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں چلتا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں آپ نثر کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ذریعہ بنانے والے اولین فن کاروں میں سے ایک ہیں۔ آپ نے جو طبع زاد کہانیاں لکھی تھیں وہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئی تھیں مگر افسوس ہے کہ اس کا ایک بھی نسخہ کسی کتب خانے میں آج موجود نہیں ہے۔ بقول حضرت راز امتیاز صاحب تامل ناڈو میں اردو کہانیوں کی سب سے پہلے بنیاد آپ نے ہی رکھی تھی۔

شرر آلندوری

مولانا محمد عبدالمجید شرر آلندوری 1884ء میں بمقام آلندور (مدراس) پیدا ہوئے۔ کوشش کے باوجود آپ کے متعلق معلومات نہ دستیاب ہوسکیں جن کے پس منظر میں آپ کی شخصیت کے ابتدائی حالات کا جائزہ لے سکیں۔ تقریباً ستائیس سال پہلے حضرت دانش فرازی نے آپ کے علمی، ادبی، فکری اور صحافتی سفر کا مکمل جائزہ دیتے ہوئے ایک کتاب بنام "نقش دوام" تالیف کی تھی جو آج بھی ایک پروفیسر[1] کے صندوق میں محبوس ہے۔ کاش یہ نسخہ میرے ہاتھ آجاتا اور میں مولانا شرر آلندوری کے فن اور شخصیت کا بھرپور جائزہ لینے میں کامیاب ہوجاتا۔

مولانا تامل ناڈو کے بہترین صحافی تھے۔ مدراس سے شائع ہونے والے جریدے "قومی رپورٹ" کے مدیر تھے۔ آپ کے صحافتی کارنامے آج بھی مدراس کی عظیم ہستیوں کے دل و دماغ پر منقش ہیں آپ ایک بہترین صحافی ہونے کے علاوہ بڑے اچھے مقرر بھی تھے آپ کے مراسم مہاتما گاندھی، محمد علی جناح اور اس وقت کے عظیم سیاست دانوں سے بہت گہرے تھے۔ جنگ آزادی میں ایک بار جیل بھی گئے۔

1923ء کے اواخر میں کناڈا میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد تھا جس میں مولانا بھی خاص طور پر مدعو تھے۔ اجلاس کے دوران ہی دل کا سخت دورا پڑا اور بیماری کی حالت میں مدراس لائے گئے اور 4، جنوری 1984ء کو مدراس میں انتقال فرمایا۔

مولانا کے دو فرزند اختر آلندوری اور نشتر آلندوری شاعر کی حیثیت سے مدراس کے ادبی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اختر آلندوری نے بہت سارے اردو ڈرامے لکھے اور اسٹیج کئے ہیں۔

آپ اردو غزل کی طرف کم اور نظموں کی طرف بہت زیادہ مائل تھے۔ آپ کی معرکتہ الآرا نظمیں قومی رپورٹ" میں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

---

[1] پروفیسر حامد حسین صدیقی فرزند مولانا محمد حسین محوی صدیقی۔

عباس علی عباسؔ

حضرت عباس علی عباسؔ مرحوم 4 ربیع الثانی 1313 ھ کو بمقام مدراس پیدا ہوئے آپ کے آبا و اجداد شیراز کے رہنے والے تھے۔ سب سے پہلے آپ کے جداعلیٰ آقا مرزا غلام نبی شیرازی مرحوم محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ چونکہ ان دنوں دہلی فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن گئی تھی اس لیئے غلام نبی شیرازی نے دکن کا رخ کیا اور ایک طویل سفر کے بعد میسور آئے۔ میسور میں حیدر علی نے آپ کی بڑی قدر کی بعد میں ٹیپو سلطان کی ناقدردانی نے آپ کو مدراس تشریف لانے پر مجبور کیا مدراس پہنچ کر آپ نواب محمد علی والاجاہ کے تیسرے بیٹے نواب سیف الملک بہادر کے یہاں مہمان رہے۔ ان دنوں مدراس کے گورنر نے آپ کو معلم فارسی مقرر کیا۔ انہی دنوں موصوف کے بیٹے مرزا غلام عباس علی صاحب کے یہاں ایک بیٹا ہوا جس کا نام محمد علی صاحب نے مرزا عابد علی حسین رکھا۔ 1303 ء میں مرزا عابد حسین کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے اپنے باپ کے نام پر مرزا غلام عباس علی رکھا۔

حضرت عباس علی عباسؔ بیک وقت جنوب کے باکمال شاعر اور عالم تھے۔ آپ کو مختلف زبانوں پر بھرپور دسترس حاصل تھی آپ کی طبیعت میں شاعری کی فطری خصوصیات موجود تھیں۔ قادر الکلام شاعر تھے آپ کی شاعری ایسی تھی کہ اس نے مدراس کے باہر کے ادیبوں کو بھی متاثر کیا۔ آپ کے آبا و اجداد نواب محمد علی خاں کے بیٹے نواب سیف الملک بہادر کے دور میں بڑے منصب پر فائز تھے۔ حضرت عباس علی عباسؔ نے مدرسۂ اعظم، مدراس میں تعلیم حاصل کی، خان بہادر علی دوست خان سعید اور مولوی رضا حسین مہکری سے عربی صرف و نحو اور حدیث کا درس لیا۔ میر عنایت حسین موسوی اور میر مہدی حسین موسوی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ اعظم سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایف اے میں داخلہ لیا اس میں بھی کامیاب ہوئے اور مدرسۂ اعظم ہی میں آپ کو مدرس کی جگہ ملی عمر کا بیشتر حصہ اس میں صرف کیا وظیفہ یاب ہوکر Women's Chri-stain College میں لیکچرر ہوئے۔ وہاں سولہ سال اردو کی خدمت انجام دی۔

آپ کو ممتاز استاد سخن اور فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے ہم عصر حضرت ضامن علی جلال لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ جلال لکھنوی زبان کے معاملہ میں بہت سخت گیر تھے یہی بات حضرت عباس میں بھی پائی جاتی ہے۔ صاف زبان، فصاحت و بلاغت ، رعایت لفظی اور محاوروں کے برجستہ استعمال کا بے حد خیال رکھتے تھے اور خود اعتمادی اتنی تھی کہ وہ خود کہتے ہیں۔

سنی ہیں یوں تو نواسنجیاں عنا دل کی　　زبان کرے کوئی پیدا مری زباں کی طرح

آپ کا مجموعہ کلام "فردوس تخیل" پروفیسر حیدر علی خاں حیدر کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ "فردوس تخیل" میں مختلف اصناف سخن کے جواہر پارے موجود ہیں۔ اس کے مطالعہ سے خصوصاً لکھنؤ کے اس دور کی زبان، لہجہ اور اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جب کہ حضرت جلال لکھنوی اور ان کے ہمنواؤں نے اردو زبان و ادب کی نوک پلک درست کرنے میں اپنی علمی اور ادبی استعداد کو صرف کیا تھا۔

○

وہ آتے ہیں جو کبھی مرگ ناگہاں کی طرح　　پھڑکنے لگتا ہے دل مرغ نیم جاں کی طرح

ہزار نقل کریں برگ گل یہ کیا حاصل　　اڑائیں کس طرح لعل لب بتاں کی طرح

وہ ان کی تیز نگہ پہلے دل میں کھپتی ہے　　جگر کے پار نکلتی ہے پھر سناں کی طرح

ہیں پیر ایسے کہ پیری نظر نہیں آتی
غزل بھی کہتے ہیں عباس نوجواں کی طرح

○

جگر کے خون کو عاشق شراب سمجھے ہیں　　گزک کے شوق میں دل کو کباب سمجھے ہیں

ہوا کی ہلکی سی جنبش میں ٹوٹ جائے گی　　ہم اپنی زندگی مثل حباب سمجھے ہیں

زبان اردو سے سوداائیوں کو کیا نسبت　　کلام میر کو ہم لاجواب سمجھے ہیں

یہ خون ناحق بلبل کی ہے سزا عباس
کشید کر کے جو گل کو گلاب سمجھے ہیں

○

ابوبکر نظمی

مولانا ابوبکر نظمی مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ نے عربی اور فارسی کی مکمل تعلیم ہدایت اللہ اور آغا شوستری سے حاصل کی۔ مدرسۂ محمدی دیوان صاحب باغ میں دستار بندی سے سرفراز ہونے کے بعد اسی مدرسہ میں عربی اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ طالب علمی کے دور سے ہی شعر گوئی کا اعلیٰ ذوق آپ میں موجود تھا۔ ابتدائی دور میں ناظرؔ تخلص کرتے تھے اور بعد میں علامہ محوی صدیقی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر آپ نے تخلص نظمیؔ اختیار کیا۔ آپ کے تبحر علمی کا شہرہ دور افتادہ مقامات میں بھی تھا۔ آپ نے اردو شاعری کی تمام تر اصناف کو سینے سے لگایا بالخصوص رباعی آپ کی پسندیدہ صنف تھی۔ اس صنف کو آپ نے زندگی بھر چاہا۔ آپ کی دو تصانیف "خطباتِ نظمیؔ" (عربی میں) اور "مرقومِ نظمیؔ" (اردو غزل اور رباعیات کا مجموعہ اشاعت 1386 ھ) منظر عام پر آکر ارباب علم و فن سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آپ بھی حضرت شاطرؔ مدراسی کے شیخ حضرت الحاج مولانا مولوی سید شاہ حسین چشتی قادری محرمؔ سے بیعت تھے۔

آپ نے 4 دسمبر 1967ء بروز منگل داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

پاسِ ناموسِ محبت نظر انداز نہ ہو
اے جنوں جامہ دری پردہ درِ راز نہ ہو

نوچ ڈالے مرے صیاد نے پر یہ کہہ کر
وہ قفس میں کبھی زحمت کشِ پرواز نہ ہو

دردِ پنہاں ہے قیامت کا مرے نالوں میں
کوئی بے درد یہی گوش برآواز نہ ہو

دیکھ ہوتا ہے بُرا، بادِ فنا کا جھونکا
صورتِ شعلۂ جوالہ سرافراز نہ ہو

شیوۂ حسن پرستی تو یہی ہے نظمیؔ
سر بہ سجدہ نہ ہوں جب تک حرمِ ناز نہ ہو

اے سوزِ ہجر میری آہوں کا جو دھواں ہے
اک آسماں گویا بالائے آسماں ہے

کیوں سجدہ ریزیوں میں مصروف اک جہاں ہے
یہ گوشۂ حرم ہے یا تیرا آستاں ہے

اے عشق کوئی حد ہے بے اعتمادیوں کی
میں دل سے بدگماں ہوں دل مجھ سے بدگماں ہے

تیرا عتاب، مرگِ دیوانۂ محبت
ہاں زندگی ہے اس کی تو جس پہ مہرباں ہے

مسجد سے اٹھ کے نظمیؔ بیٹھا ہے میکدے میں
کل بندۂ خدا تھا اب بندۂ مغاں ہے

شاداں وشارمی

عبدالقدس شاداںؔ وشارمی بمقام وشارم (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے آپ اُن بزرگ ارباب سخن میں سے تھے جنھیں صالح روایات، وضع داری اور خوش اخلاقی کا مجسمہ کہا جاسکتا ہے خصوصاً وشارم جیسے ماحول میں جہاں تامل زبان کا رواج ہو اردو کا پرچم بلند رکھنا حضرت شاداںؔ کی اولوالعزمی اور اردو سے گہری وابستگی کا ثبوت ہے۔ حضرت شاداںؔ نے اردو کا ایک ماحول پیدا کیا اور انہیں کے فیض کا نتیجہ ہے کہ وشارم میں اردو کا چلن عام ہوا۔

حضرت شاداںؔ گو بلند پایہ شاعر نہیں تھے لیکن غزل گوئی کی حد تک روایات، زبان، محاورات اور الفاظ کے استعمال میں بڑے پابند تھے۔ حضرت امیرؔ مینائی سے بڑی گہری عقیدت تھی اور ان کے سیکڑوں اشعار وردِ زبان تھے۔

حضرت شاداںؔ نے کبھی صرف صنف غزل کو اپنایا اور آخری عمر تک وفاداری بشرطِ استواری کا ثبوت دیتے رہے۔ جنوبی ہندوستان کے مشہور صحافی، شاعر اور ادیب حضرت شررؔ آلندری مدیر "قومی رپورٹ" مدراس کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ استاد کا اتنا احترام دل میں تھا کہ استاد کے انتقال کے بعد انھیں یاد کرکے بے ساختہ آنسو بہایا کرتے تھے۔ حضرت شاداںؔ حق گو اور حق پسند تھے۔ آپ کی وضع یادگار سلف تھی آپ کا سلوک خلوص سے لبریز تھا۔ نوجوان شعراء کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور جسے جوہر قابل سمجھتے تھے خواہ وہ عمر میں چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام بھی مرتب ہوچکا ہے اور آپ کے فرزند کے پاس آج بھی محفوظ ہے۔ کاش وہ دن جلد آئے کہ آپ کی تخلیقات کا مجموعہ منظر عام پر آئے تاکہ آپ کے زاویۂ فکر کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

○

دل میں ہے درد لب پہ زاری ہے کب غمِ عشق اختیاری ہے
اڑ رہا ہوں غبار بن کر اوج پر میری خاکساری ہے

کروٹیں بے سبب نہیں آتیں　　کچھ نہ کچھ وجہِ بے قراری ہے
تیرا عاشق کہاں سنبھالا لے　　تیغِ ابرو کا زخم کاری ہے
مغفرت کا سبب بنی شاؔداں
واہ کیا قدرِ خاکساری ہے

فانوسِ خیال (مطبوعہ)

○

سر میں سودائے محبت چاہئے　　دل میں درد و سوزِ الفت چاہئے
چاہئے دوزخ میں جنت چاہئے　　رنج میں انسان کو راحت چاہئے
توڑ ڈالا خواہشاتِ نفس نے　　کعبۂ دل کی مرمت چاہئے
شرمِ عصیاں سے بہا شاؔداں تو اشک　　مغفرت کی کوئی صورت چاہئے

○

شجاعؔ مدراسی

عبدالغنی شجاعؔ مدراسی اندازاً 1885 ء اور 1890 ء کے درمیان مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلیمی پس منظر صفر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۔۔ اساتذہ کی صحبتوں میں رہ کر آپ میں شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ لمحوں میں نعتوں کا ڈھیر لگا دیتے تھے۔ مدراس کے ماحول میں عوامی شاعر کی حیثیت سے بہت زیادہ مقبول و معروف تھے۔ برنیش کمار شادؔ کی طرح آپ نے بھی اپنی زندگی کو شراب کی بوتل میں اتار دیا تھا۔ اکثر احباب آپ کو شراب پلا کر آپ سے حمد و نعت لکھواتے تھے۔ آپ سرشاری کے عالم میں اتنی عمدہ نعتیں کہہ جاتے تھے کہ مدراس کے قادر الکلام شاعر بھی حیران رہ جاتے تھے۔ قصائد کی صنف میں آپ اپنے استاد شیداؔ مدراسی سے بھی دو قدم آگے نکل چکے تھے 1930ء میں آپ نے ایک طویل مثنوی "مثنوی کولم شریف" (صحابی رسولؐ حضرت تمیم انصاریؓ کی حالت زندگی کا جائزہ، جو کولم شریف میں مدفون ہیں) لکھی جو مدراس کے ادبی ماحول میں بے حد مشہور ہوئی۔ جس کے نسخے آج بالکل نایاب ہیں۔

انتقال کے وقت آپ کی عمر 75 سال کی تھی اندازاً آپ کا انتقال 1961 ء میں ہوا

میرے آقا، میرے مولا میرے رہبر والی ... قبر کے مجھ کو عذابوں سے چھڑانا ہوگا
میں ہوں عاشق ترے محبوب کا اے ربِّ کریم ... غم ہے کیا، دشمنِ جاں سارا زمانہ ہوگا
ہے یہ میلادِ نبی، جائے ادب ہے لوگو ... نام احمدؐ جو سنیں سر کو جھکانا ہوگا

روزِ محشر یہ کہوں گا اے شجاعؔ میں روکر
کملی والے مجھے کملی میں چھپانا ہوگا

وہ ماہِ عرب احمدِ مکی مدنی ہے ... گلزارِ خدائی کا وہ سرو چمنی ہے
معراج میں جب دیکھے ملک کہتے تھے باہم ... کیا حسن کا انسان یہ اللہ غنی ہے
کب روئے مصفا کی صفت ہو سکے ہم سے ... یہ نور کی تصویر ہے، پر نور نبی ہے
رفتار کے قربان تو گفتار کے صدقے ... امی ہے لقب جس کا وہ شیریں سخنی ہے
عرضی میں لکھوں، چل کے پڑھوں روضے پہ جاکر ... مدت سے شجاعؔ بات یہ اس دل میں ٹھنی ہے

علامہ محوی صدیقی

محمد حسین محوی صدیقی 1888ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے لیکن آپ نے اپنی زندگی کا بہت سارا حصہ مدراس میں گزارا تھا آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد مدرسہ نظامیہ لکھنؤ سے فارسی اور مدرسۃ احمدیہ سے عربی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے ابا حضور حافظ حسین نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم کے اصرار پر بھوپال تشریف لے گئے کم عمری ہی سے آپ میں شعروشاعری کا فطری ذوق تھا 1910ء میں آپ نے حضرت شوق قدوائی لکھنؤ کی شاگردی اختیار کی۔ حضرت شوق کی وفات (1925ء) تک آپ نے صلاح و مشورہ کا سلسلہ جاری رکھا۔

1914ء میں علامہ محوی صدیقی کی ملاقات بابائے اردو مولوی عبدالحق سے انجمن ترقی اردو لکھنؤ کے ایک جلسہ میں ہوئی۔ اس ملاقات نے علامہ محوی کو بابائے اردو کے بہت قریب تر کر دیا اور انہیں کی ایما پر اورنگ آباد گئے اور موصوف کی انگریزی اور اردو لغات کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا جس کا اعتراف خود بابائے اردو نے اپنے دیباچہ میں کیا ہے۔

1930ء میں بابائے اردو کے ہی اصرار پر مولانا محوی صدیقی مدراس تشریف لائے اور جمالیہ عربک کالج میں عربی زبان وعلوم کے استاد مقرر ہوئے۔ ایک سال اس عربک کالج میں کام کرنے کے بعد مدراس یونیورسٹی کے اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لکچرار بنے اور یہیں سے 1949ء میں وظیفہ یاب ہوتے مدراس یونیورسٹی سے سبک دوش ہونے کے بعد میل و شارم (شمالی آرکاٹ) کا رخ کیا۔

شمالی ہند اور جنوبی ہند کے متعدد رسائل میں آپ کی تخلیقات پڑھنے کے بعد یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ آپ کی ہستی ہندوستان کی ان بلند پایہ ہستیوں میں تھی جنھوں نے اردو کے شعری اور تنقیدی ادب کو اپنے فکر و فہم اور تلاش و جستجو کی نئی روشنی عطا کی۔

اردو نثر کے علاوہ آپ کی شعری خدمات بھی تمل ناڈو کے اردو ماحول میں قابل ذکر ہے۔ آپ نے اپنے پیچھے شاگردوں کی ایک بڑی فوج چھوڑی جن میں مولانا مولوی ابوبکر نظمی، مولانا مولوی کمالی ویلوری، مولانا مولوی جعفر حسین فیضی صدیقی، بدر جمالی، سعداللہ

ممتاز، مولوی حافظ باقوی رائی چوتی، راجی صدیقی، عبداللہ شرقی وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں۔ آپ زندگی بھر زیادہ سے زیادہ شاگرد بنانے اور ان کی شعری صلاحیتوں کی نوک پلک درست کرنے میں کوشاں رہے۔ اسی شوق کے تحت علامہ محوی اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ وہ مدراس کے شعری ادب کے قطب ہیں۔ لیکن اب جبکہ میں (مولف تذکرہ) بیسویں صدی کے اواخر میں تمل ناڈو کے شعری افق کا بھرپور جائزہ لیتا ہوں تو میرے سامنے علامہ شاکر نائطی کی اعلیٰ جلیل القدر متبرک ہستی مدراس کی علمی، ادبی، شعری اور فکری وسعتوں میں چاروں طرف پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے اگر میں علامہ شاکر نائطی کو قطبِ علم وادب کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔

مولانا مولوی عبدالسلام کمالی ویلوری سے میری حالیہ ملاقات (18 نومبر 1986ء) میں اس بات کا انکشاف ہوا کہ مدراس کے اکثر شعرا اس لئے علامہ محوی کی شاگردی اختیار کرنے کو باعث فخر سمجھتے تھے کہ وہ اہل زبان ہیں۔

علامہ نے 1952ء میں میل وشارم (شمالی آرکاٹ) سے دو ماہناموں "الاشاعت" اور "معیار ادب" کا بھی اجرا کیا تھا ان ماہناموں کے ذریعے محوی نے اپنی بہترین صلاحیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ان دونوں رسائل میں بہت جاندار، وقیع اور معلومات انگیز مضامین جگہ پاتے تھے۔ خصوصاً مولانا ابوالجلال ندوی کی شمولیت نے ان جریدوں کی ترقی اور بقا میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

"معیار ادب" کے چند ایک شماروں میں علامہ محوی کی اصلاحوں پر مبنی ایک خاص کالم (زیر نگرانی سعداللہ ممتاز) پیش کیا گیا تھا۔ اس کالم میں جگہ پانے والے شعراء کا کلام علامہ کی اصلاحوں سے مزین ہوتا تھا۔ ان اصلاحوں سے علامہ کا شعری روایات سے لگاؤ اور زبان وبیان کے پیچ وخم سے گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی مدراس میں آپ کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں 1952ء کے آخر میں آپ بھوپال گئے اور وہیں 19 نومبر 1975ء کو سپرد خاک ہوئے۔

آپ نے جو کتابیں مرتب ومدون کیں ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ یہ تمام کتابیں مدراس یونیورسٹی نے خاص اہتمام سے شائع کی ہیں۔

"دیوان امیر محمدیؒ" بیدار دہلوی 1935ء "ترجمہ واقعات اظفریؒ"۔ دیوان اظفری

1936ء۔ انور نامہ (کلیات ابجدی) ـــــ مودت نامہ اور مثنویاں۔ شرح تحفۃ العراقین۔ کلمات شعرا سرخوش 1951ء۔

○

یہ احسان آپ کا ہے یا جنونِ فتنہ ساماں کا ــ کہ ہے اک ہاتھ میں دل ایک میں ٹکڑا گریباں کا
کھلا رہنے دے آج اے پاسباں در اپنے زنداں کا ــ کہ ہے میرے لئے بے تاب ہر ذرہ بیاباں کا
سلام ایسی جوانی پر، سلام اس زندگانی پر ــ نہ جس میں زور دریا کا نہ جس میں شور طوفاں کا
وہ برقِ طور دنیا پہ ہے روشن جس کا افسانہ ــ کوئی شعلہ نہ ہو میرے ہی دل داغ سوزاں کا

چمن کی یاد فکرِ آشیاں، رنجِ قفس محو ہی
وہی ہے ولولہ پھر بھی مری طبعِ غزل خواں کا

○

محمد فخرالدین الفتؔ مدراسی

منشی محمد فخرالدین الفتؔ مدراسی 1889ء میں بمقام مدراس پیدا ہوئے۔ آپ ایک غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے اردو فارسی کے علاوہ تامل، گجراتی اور انگریزی زبان سے بھی واقف تھے۔ اردو شاعری میں اسمٰعیل سیٹھ مغموم سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ آپ مدراس کے ایک مشاق شاعر ہونے کے علاوہ مخمس نویسی کے بھی ماہر تھے۔ آپ کے کلام کا رنگ قدیم تھا۔ زبان نہایت لطیف، صاف و شستہ تھی۔ آپ کو ابتذال سے سخت نفرت تھی۔ فارسی ترکیبوں سے کلام بہت زیادہ آراستہ تھا۔ غزل میں صنائع و بدائع مثلاً تشبیہات و استعارات سے گریز کرتے تھے۔ غزلیات کے ساتھ ساتھ آپ کی طبیعت بہت زیادہ نظموں کی طرف مائل تھی۔ اکثر انگریزی نظموں کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ اور آپ کی منظوم تخلیقات شمال کے مقتدر رسائل "پیامِ یار" (لکھنؤ) "جلوۂ یار" (میرٹھ) میں شائع ہوتی تھیں۔ آپ کے کلام میں کہیں کہیں تصوف کی جلوہ سامانیاں بھی موجود ہیں۔ آپ نے اکبرؔ الٰہ آبادی کے رنگ میں بھی رباعیات کہنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن آپ کی یہ رباعیات اکبرؔ الٰہ آبادی کے مہذب، سنجیدہ افق کو نہ چھو سکیں۔

○

کیا شباب آیا کہ شوخی سادگی پر چھا گئی
اب مزاجِ یار کا پہچاننا دشوار ہے

جب میں نے کہا، تم نے کبھی مجھ کو کیا یاد
وہ ہنس کے لگے کہنے کرے میری بلا یاد

ہمیں اے آسماں کیوں دیکھتا ہے خشمگیں ہوکر
ابھی نشو و نما پائی ہے پیوندِ زمیں ہوکر

یہ رفعت کیا ہے انجم کی مری پرواز سے آگے
جو چاہوں شاخِ سدرہ پر بنا لوں آشیاں اپنا

○

اے جلوۂ مجاز دکھا بڑھ کے شوخیاں
آگاہ کر دے اپنی حقیقت سے تو مجھے

الفتؔ یہ لطف دیکھیے وہ بھی تھا ساتھ ساتھ
جس کی تمام عمر رہی جستجو مجھے

○

بیخودؔ مدراسی

افسرالشعراء محمد انصرالدین بیخودؔ مدراس میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے والدِ بزرگوار مولانا مولوی غلام علی تبسمؔ سے حاصل کی۔ تبسمؔ مدراس کے مشہور رئیس اور باکمال شاعر و ادیب تھے۔ ابتدا میں مولانا ایمانؔ گوپاموی کی رہنمائی میں اردو نظم و نثر کے نشیب و فراز کی آگہی حاصل کی۔ فنِ شعر میں حکیم ضامن علی جلالؔ لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل رہا۔ شاعری کی طرف آپ کا طبعی رجحان اور ذوق وراثت میں تھا۔ لطیفؔ آرکاٹی سے آپ کا سلسلہ ملتا ہے جو جنوب کے صاحبِ دیوان شاعر اور بہترین طنز گو تھے۔ حضرت بیخودؔ نے شاعری کے تعلق سے لطیفؔ کے لہجے کے اثر کو قبول نہیں کیا۔ چونکہ بیخودؔ کا مزاج سنجیدہ تھا۔ انھوں نے وہی راستہ اختیار کیا جو ان کی طبیعت سے ملتا تھا۔ بیخودؔ ایک طویل عرصے تک صیغۂ تعلیمات سے منسلک رہے شاعری کے علاوہ اردو نثر سے بھی آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ جنوبی ہند کے کئی رسائل کی ادارت کی اور کئی سال تک اردو ممتحن کی خدمات انجام دیتے رہے اور تصانیف و تالیفات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آپ نے اسکول کے نصاب کے لئے کئی مفید کتابیں مرتب کی ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن پر آپ کو بھرپور عبور حاصل رہا۔ رباعیات، قطعات، مسدس، مخمس، مستزاد اور ترجیع بند آپ کی قادر الکلامی کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ بیخودؔ نے کافی طویل عمر پائی 85 سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ بیخودؔ نے سنگلاخ زمینوں میں بڑی روانی اور سلاست کے ساتھ غزل کہی ہے کہیں تصنع اور بناوٹ کی چھاپ نظر نہیں آتی ہفت روزہ پاکیزہ، مدراس میں آپ کا نمونہ کلام موجود ہے۔

آپ کی مشہور تصانیف "مخزنِ بیخودی"۔ "میخانۂ خلد"۔ "رباعیات بیخودؔ"۔ اور "توشۂ آخرت" ہیں لیکن یہ تمام تر کتابیں آج بالکل نایاب ہیں۔

ہزار تڑپی نہ ٹھہری مگر جواب میں برق ۔۔۔ بڑھی نہ اس دلِ مضطر سے اضطراب میں برق

لچک رہی ہے کمر یوں کسی کی زلفوں میں ۔۔۔ نہ چمکی ہوگی کبھی اس طرح سحاب میں برق

جدھر کو آنکھ اٹھی بس ادھر کو آگ لگی ۔۔۔ کہاں سے گر پڑی اس چشمِ نیم خواب میں برق

بزم میں یاد مری آئی تو غیروں سے کہا — دیکھنا کوئی تڑپتا پسِ دیوار بھی ہے
چشم میگوں کا اشارہ ہے غضب اے ساقی — بے خبر بزم میں زاہد بھی ہے میخوار بھی ہے

مجھے بھی دے کوئی مست شراب، جامِ شراب — کہ ہے غذا مری سیخ و کباب، جامِ شراب
چھپا نہ شیشہ بغل میں نہ داب، جامِ شراب — تو شیخ رندوں میں پی بے حجاب، جامِ شراب
دماغ عرش بریں پر ہے اب تو مستوں کا — فلک ہے شیشۂ مئے آفتاب، جامِ شراب
وہ بادہ کش ہوں کہ محشر میں کیا عجب بیخود
پکارتا اٹھوں، جامِ شراب، جامِ شراب

(مطبوعہ "سفینہ" سہ ماہی گورنمنٹ محمڈن کالج، جنوری 1969ء)

رشکِ خورشید ہے یہ داغ اپنا — اے فلک رکھ لے تو چراغ اپنا
مئے الفت سے تیرے اے ساقی — بھر گیا عمر کا ایاغ اپنا
کیا اٹھائیں کسی کے نازدا دا — اب وہ دل ہے نہ وہ دماغ اپنا
یوں ہوئے گم تلاش میں اس کی — نہ ملا ہم کو بھی سراغ اپنا
غم فراغت سے تیرا دل میں رہے — اس سے ممکن نہیں فراغ اپنا
دل کا ہو یا جگر کا اے بیخود — وہ بھی داغ اپنا یہ بھی داغ اپنا

مقبولؔ آمبوری

مقبولؔ آمبوری 1890ء میں بمقام آمبور پیدا ہوئے مقبول آمبوری کا تعلق بھی علامہ محویؔ صدیقی لکھنوی سے تھا۔ علامہ محویؔ مدراس کے قیام کے دوران روز بروز اپنے شاگردوں کی فہرست کو طول دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور مدراسیوں کے سامنے یہ غلط دعویٰ بھی کر رہے تھے کہ "مدراس میں اردو زبان ان کی وجہ سے پھولی پھلی" مولانا محمد حسین محویؔ مدراس یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے یونیورسٹی میں اپنی service کے دوران آپ نے تامل ناڈو کے قدیم شعراء پر مضامین لکھے تھے اور یہ مضامین اردو سہ ماہی علی گڑھ کے جریدے میں سر فہرست شائع بھی ہوئے تھے ان مضامین کی روشنی میں مولانا کا یہ دعویٰ سراسر غلط بیانی پر محمول ہے۔ اس دعوے کی دلیل میں ایک بھری بزم میں حضرت فہیم آمبوری نے فی البدیہہ شعر کہا تھا۔ ؎

مدراسیوں میں نکلے اردو زبان والے
اب کیا کریں گے دعویٰ ہندوستان والے

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔

مقبولؔ آمبوری جیسے بہت سے شاعر علامہ محویؔ صدیقی کی استادی گرفت سے نہ بچ سکے۔ مقبولؔ کو نظم و غزل دونوں اصناف سخن پر دسترس حاصل تھی اس کے علاوہ آپ نے قومی و مذہبی نظموں سے بھی اپنے ذوق کی تسکین کی صورت پیدا کی۔ تقسیم ہند سے پہلے سیاسی ہنگاموں کا بھی آپ نے ساتھ دیا۔ پتہ نہیں آپ کے کلام کا کیا حشر ہوا خیر جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہی غنیمت ہے۔

آپ نے 20 جنوری 1958ء کو انتقال فرمایا۔

تیرے بیمارِ محبت کو دوا سے کیا غرض! ○ مرنے والا جو ہو خود اس کو قضا سے کیا غرض
آسمانِ فتنہ پرور کو اے قلبِ مضطرب ○ تیرے ارمانوں سے تیرے مدعا سے کیا غرض
توبہ کر لی ہے جہاں میں آج جس میخوار نے ○ پھر اسے برسات کی کالی گھٹا سے کیا غرض
داغِ دل روشن ہوئے شمعِ فروزاں کی طرح ○ پھر بھلا مقبولؔ ہم کو رہ نما سے کیا غرض

آسی ترپاتوری

حکیم سید عباس آسی ترپاتوری 1891ء میں کشنگری (شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے آپ کے والد فن طب کے ماہر تھے۔ آپ نے بھی ترپاتور آکر مطب کھولا اور اسی کو ذریعۂ معاش بنایا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مدرسۂ احمدیہ سے اور فارسی، عربی کی تعلیم حضرت فانی ترپاتوری سے حاصل کی۔

حضرت مولانا حکیم سید عباس آسی ترپاتوری بڑے خوش فکر، نغز گو اور وضع دار شاعر تھے۔ حضرت نوح ناروی سے شرف تلمذ حاصل تھا لیکن آپ کے کلام کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نوح سے وابستہ ہونے کے باوجود آپ نے اپنے لئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ آپ کی تخلیقات میں کہیں نوح کے آہنگ اور لہجہ کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ اس کا سبب یہی ہے کہ مولانا شاکر نائطی کی طرح حضرت آسی ترپاتوری بھی غالب کے پرستاروں میں سے تھے۔ آپ کا لہجہ تمام ہم عصروں میں اپنی ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ داغ کی زبان اور غالب کے فکر کے امتزاج سے جو تیسری چیز پیدا ہوسکتی ہے وہی حضرت آسی کا آہنگ ہے کردار کے اعتبار سے بھی ایسی معزز، مقدس اور نیک طینت ہستی میری نگاہوں سے بہت کم گزری ہے۔ عجز کا یہ عالم کہ ہمیشہ سب سے جھک کر ملتے تھے۔ سربلندی کی وہ شان کہ بڑے بڑے رئیس آپ کی بارگاہ میں باریاب ہونے کو باعث فخر سمجھتے تھے، لباس، رہن سہن اور معاشرتی آداب سب سے وضع داری کی شان پائی جاتی تھی۔ صالح روایات کا دل سے احترام کرتے تھے۔ آپ کی تخلیقات دراصل آپ کی پرکشش آئینہ دار ہیں۔

مجھے جہاں تک علم ہے حضرت آسی نے صرف صنف غزل کے دامن کو تھاما بلکہ وفاداری بہ شرط استواری کے پیش نظر غزل ہی کے بت خانے میں 23 اپریل 1966ء میں جان دی اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ترپاتور میں ہی آپ مدفون ہیں۔

وہ سامنے ہیں مگر دیکھنے کی آس نہیں — وہاں نقاب نہیں ہے یہاں حواس نہیں
یہ دام اور کے آگے بچھائیے جا کر — ہمارا طائرِ دل صیدِ التباس نہیں
خیالِ قامتِ ساقی و چشمِ ساقی سے — ہماری بزم میں شیشہ نہیں گلاس نہیں
نظر ہو نیچی نہ کیوں التفاتِ پیہم پر — وہ دل ملا ہے کہ احسان ناشناس نہیں
تمام حلقۂ بیرونِ در ہیں اے آسی
حریمِ ناز میں گنجائشِ حواس نہیں

—○—

دیدۂ گریاں مرے رونے سے باز آئیں گے کیا — ان سے بہتر شرحِ غم احباب فرمائیں گے کیا
اے خرد تو ہی بتا ہم تجھ پہ اترائیں گے کیا — بے جنونِ عشق اپنے ہاتھ وہ آئیں گے کیا
عرضِ مطلب پر مری کھل کر وہ فرمائیں گے کیا — اک مجسم خامشی بن کر نہ رہ جائیں گے کیا
ہے تکلف ہی تکلف گویا اپنا حالِ زار — کہتے ہیں ہم کو نہ پائیں گے تو مر جائیں گے کیا
جیسے جیسے اپنے دامن کی ہوا دیتے ہیں وہ — کہتے ہیں بے ہوش ہم بھی ہوش میں آئیں گے کیا
ہم کہ ہیں مشکل پسند و صبر کوش و سخت جاں — وعدۂ صبر آزما سے ان کے گھبرائیں گے کیا
بے خودی سے لاگ انھیں آسی تو اچھا یوں ہی
پا کے وہ بے خود مجھے نزدیک ہو جائیں گے کیا

—○—

متاعِ صبر رعنائی نے لے لی — رہی باقی تو انگڑائی نے لے لی
نہ آئے ابر اب صحرا کی جانب — یہ خدمت آبلہ پائی نے لے لی
ابھی تھا دیر آمادہ ہی کوئی — مری جاں خوفِ رسوائی نے لے لی
تری چپ کو جو دیکھا بات کرتے — خموشی تابِ گویائی نے لے لی
یہ سننے کے لئے تیار رہئے — کہ پربت کی جگہ رائی نے لے لی
تھی ان کے واسطے آسی یقیناً
جو صورت بھی جبیں سائی نے لے لی

—○—

مجھ کو پہونچا نہیں گزند کوئی — جس پہ تڑپا نہ دردمند کوئی
تیری انگڑائی کا جواب نہیں — اک ادا اور دل پسند کوئی
نہ جلے آہ سرد مہری سے — دل ہے کیا دانہ سپند کوئی
یوں مچلتے ہیں ان کے سامنے اشک — جس طرح طفلِ ارجمند کوئی
چھیڑ دے ذکر ساغرے واعظ — بحث ہو جائے سودمند کوئی
جب کسے جاتے ہیں ہمارے پر — دیکھ لیتا ہے بند بند کوئی
سب کی سب بے اثر ہیں اے ناصح — اثر انگیز بھی ہے پند کوئی
شاعری اور جناب آسی کی
اعتراض اور ہوشمند کوئی

ہائے یہ دل چارہ گر کا شکوہ سنج — اب اسے ہے زخم بھر جانے کا رنج
جو ازل سے ہے تمہاری مدح سنج — وہ زبان اور شکوہ ہائے درد و رنج
کس سے پوچھیں عشق سے یا حسن سے — انگلیاں کاٹیں کہ کاٹا تھا ترنج
عشق سا دیکھا نہ میں نے جلد باز — حسن سا پایا نہ میں نے زود رنج
ان کا آئین رنج دو اور لو مزہ
مسلک آسی مرنجان و مرنج

حیات و موت کے دریا کا یہ اتار چڑھاؤ — اور اس میں ایک سبک سیر اپنے دل کی ناؤ
دیارِ عشق میں معیارِ انتخاب ہے گھاؤ — کہ زخم خوردہ دلوں کے سوا ہوا نہ چناؤ
دل نزار پہ روکے ہیں تیغ ناز کے وار — جو تم کہو! جو کیا ہم نے اور کوئی بچاؤ
جو مجھ سے کھنچتے رہے ان سے میں ذرا نہ کھنچا — کہ وجہ قطعِ محبت نہ ہو کہیں یہ کھنچاؤ
رہِ وفا و محبت میں یہ سلوک اس کا — سرِ نیاز سے وہ پائے ناز کا برتاؤ
اگرچہ جان چھڑکتی ہے حسن پر شبنم — ہماری آنکھ کا ہوتا ہے گرم یہ چھڑکاؤ
رہینِ منتِ معمارِ عشق ہے دنیا — نہ ہوتا یہ تو نہ ہوتا کوئی بناؤ چناؤ
یہ خود تلاطمِ دریا ہے اور خود ساحل — دل نزار سی دیکھی ہے کس نے کوئی ناؤ

ہماری فطرتِ ایذا پسند کا غم، غم
ترے مزاجِ ستم پیشہ کا سبھاؤ سبھاؤ
کسی کے بحرِ کرم کی عطائے بے پایاں
ہماری آنکھ سے قطراتِ اشک کا یہ لگاؤ
کچھ اس طرح سے جبینِ نیاز رکھ آسیؔ
کہ پائے ناز پہ ان کے نہ پڑنے پائے دباؤ

ناقابلِ علاج کہاں دل کا درد تھا
سچ تو یہ ہے کہ اس میں ذرا دل ہی سرد تھا
ہوتا جو ہوش کوچۂ لیلیٰ نہ چھوڑتا
دیوانہ قیس تھا کہ بیاباں نورد تھا
رکھا انھوں نے آکے جہاں ہاتھ نبض پر
جھوٹی تھی یہ خبر کہ مرا جسم سرد تھا
دیکھا اٹھائے اٹھ نہ سکا بوالہوس سے یہ
آخر تمہارا نازِ طلبگار مرد تھا
تھی جلوہ گاہِ ناز میں ہر رنگ کی کشش
مرکز مگر نگاہ کا اک روئے زرد تھا
آسیؔ اٹھی جو اس کے تصور میں یہ نگاہ
چھایا ہوا تمام پہ اک حسنِ فرد تھا

خرد سکتے میں عالم دم بخود تھا ہوشیاری کا
اٹھایا پردہ دستِ عشق کے دل کی غماری کا
تبسم غنچۂ دل کے لبوں پر کھیل جاتا ہے
تمہاری یاد بھی جھونکا ہے کیا بادِ بہاری کا
جگر خوں ہو گیا لیکن نہ آیا داغ دامن پر
تماشا کیا کرے کوئی مری سینہ فگاری کا
دیا ہے درد اگر تو نے تو دے طاقت تڑپنے کی
یہ میرا ضعف کیوں ردِّ عمل ہو بے قراری کا
کیا انکار جس نے میرے آگے سجدہ کرنے سے
وہ لوہا مانتا ہے آج میری خاکساری کا
تکلف ہے جو ان کے التفاتِ ناز میں آسیؔ
سمجھتا ہوں اسے میں ایک پردہ دوستداری کا

بوتل ہے کسی کی تو ہے پیمانہ کسی کا
ورنہ نہیں اے مے کشو میخانہ کسی کا
تقویمِ کہن ہو گیا جب قصۂ مجنوں
مشہور ہوا خلق میں افسانہ کسی کا
آجائے وہیں بال مرے شیشۂ دل میں
اک بال بھی ٹوٹے جو اگر شانہ کسی کا
سنتا ہوں کہ وہ شوخ جلاتا ہے خطِ شوق
ایسا نہ جلائے کوئی پروانہ کسی کا

یوں تو ہر اک حسیں ہے اچھا کہیں جسے
ایسا نہیں ہے کوئی بھی مجھ سا کہیں جسے

کیوں اپنے دل میں اپنی ہی صورت نظر نہ آئے
بیٹھا ہے چھپکے آئینہ سیما کہیں جسے

ہاں تیری جلوہ گاہ سے وابستہ ہے فقط
ارباب دید ذوق تماشا کہیں جسے

کیا پوچھتے ہو خوں شدگی اس کی ہمدمو!
رکھتے ہیں دل وہ لالۂ صحرا کہیں جسے

آسیؔ کسی کی مست نگاہی میں دیکھئے
وہ کیفیت کہ نشۂ صہبا کہیں جسے

غیر سے عہدِ وفا تو نے ستمگر باندھا
ہم نے اپنے دل بیتاب پہ پتھر باندھا

چرخ سے میں نے کئے سارے مظالم منسوب
صرف الطاف کا سہرا ہی ترے سر باندھا

دل کی یہ ہٹ کہ چلیں سر سے کفن باندھ کے ہم
ان کی یہ ضد کہ نہ باندھیں گے نہ خنجر باندھا

میں نے مانا کہ مسیحا ہو زمانے بھر کے
تم نے مرہم بھی مرے زخم جگر پر باندھا

ایسی ہی مجھ سے جو نفرت ہے تو لے در سے ترے
یہ لپیٹا یہ کیا گول یہ بستر باندھا

جیسے جیسے پرِ پرواز میں جنبش دیکھی
ویسے ویسے مرے صیاد نے کس کر باندھا

باوجود اتنی نزاکت کے کسی نے آسیؔ
صرف میرے لئے میرے لئے خنجر باندھا

خون سے رنگین ترا دامن کہیں گلچیں نہ ہو
تو نے جو غنچے چُنے ان میں دلِ غمگیں نہ ہو

ذکر میرے التہابِ داغِ دل کا اور وہ
حُسنِ عالم سوز کی یہ بھی کہیں تحسیں نہ ہو

تجھ کو سنگِ آستاں ہی سے نہ اٹھوا دے کہیں
دیکھ اپنا جرمِ سجدہ اس قدر سنگیں نہ ہو

پھیر لیتے ہیں وہ صورت مجھ کو آسیؔ دیکھ کر
اس طرح کوئی جہاں میں صاحبِ تمکیں نہ ہو

شاکر مدراسی

امیر التجار محمد عبدالشکور بادشاہ بہادر شاکر مدراسی مدراس کے ایک متمول اور مخیر تاجر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خاندان کے دوسرے افراد کی طرح شاکر کو بھی علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ اور ان کا شمار اس دور کے نغز گو شعراء میں ہوتا تھا۔ شاکر مدراسی نے شہر مدراس کی سماجی، علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں اہم رول ادا کیا۔ آپ مدراس میں حکومت ترکی کے نمائندہ اور سفیر بھی تھے۔

1309 ھ میں آپ کا دیوان بنام "نغمۂ آرزو" منظر عام پر آچکا ہے۔ جس کا ایک نسخہ کتب خانۂ عام اہل اسلام، والاجاہ روڈ، مدراس میں موجود ہے۔

○

رہی نہ وصل میں پکا اور رات تو باقی　　ابھی تو ان سے بہت سی ہے گفتگو باقی
بجھے گی تشنگیٔ تیغِ جنگ جو کیونکر　　مرے بدن میں ذرا بھی نہیں لہو باقی
نہ باغباں کو ہو صیاد سے گلہ کیونکر　　نہیں چمن میں کوئی مرغ خوش گلو باقی
اگرچہ چارہ گروں نے بہت سی کی تدبیر　　مگر ہے جوشِ جنوں کا وہی غلو باقی

○

جو کوئی روبرو مرے غمناک ہو گیا　　دل میرا پانی پانی جگر چاک ہو گیا
سر کارِ عشق سے ہوا حاصل ملال و غم　　دل بیچ کر میں صاحب املاک ہو گیا
جوشِ فروغِ حسن ہے کوچہ میں یار کے　　کیا نخل طور پر خس و خاشاک ہو گیا
قسمت نے کس مزے سے ٹھکانے لگا دیا　　کوچہ کی ملے صنم میں ترے خاک ہو گیا

شاکر کی اب کے دیکھئے بنتی ہے کس طرح
مسکن تو میرا کوچۂ سفاک ہو گیا

○

محمد عبدالعلی آسیؔ مدراسی

آسیؔ مدراسی مدراس میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ پتہ نہیں کن حالات کی بنا پر وہ لکھنؤ گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ عمر بھر لکھنؤ میں مقیم رہتے کے باوجود آپ نے اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ مدراسی لکھا ہے۔ آپ لکھنؤ میں مطبع اصح المطابع لکھنؤ کے مالک تھے۔ ایک کتابچے "مرقعۂ نگارین"[1] میں اشاعت کی تاریخ 1312ھ لکھی ہے جو خود آپ کے مطبع میں طبع ہوا تھا۔

نیر اعظم خوش نویس منشی محمد شمس الدین لکھنوی کی خوش نویسی کی تعریف میں آپ نے لکھا ہے۔

○

جانفزا تحریر ہے یا دلربا تطہیر ہے — نور کی تصویر ہے یا شمس کی تنویر ہے
سلسلہ سطروں کا موج بحر ہے یا سلک در — رشتۂ تار نظر یا جادۂ تسخیر ہے
فکر تھی اک سال کی آسیؔ مگر آئے دو سال — سال اول خوب آیا خوبیٔ تطہیر ہے
1312ھ
اس سے عمدہ کلک گوہر سلک نے سال دوم — لکھ دیا عمدہ جلی کیا نور کی تحریر ہے
1312ھ

آپ کا کلام نایاب ہے۔

---

[1] اس کتاب کا ایک نسخہ کاتب محمد یعقوب، مالک ماڈل آرٹ پریس کے پاس موجود ہے۔

ساغر مدراسی

منشی محمد عبدالکریم ساغر مدراسی دراصل مدراس کے رہنے والے تھے۔ اردو منشی کی حیثیت سے آمبور گئے۔ اور یہیں شباب کے ذریں لمحات گزارے۔ مشاعروں میں حصہ لیا اور آخر آمبور ہی کی سرزمین میں سپرد خاک ہوئے۔ آپ کا میلان طبع بھی صنف غزل کی طرف زیادہ تھا۔ غزل میں روایات کے پابند تھے لیکن آپ کے کلام میں بے ساختگی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ آپ کی غزلیں اِدھر اُدھر رسائل میں بکھری پڑی ہیں لیکن آج تک کسی نے ان کے کلام کو یکجا کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ اور افسوس ہے کہ خود ان کی اولاد نے بھی اس طرف توجہ نہیں دی۔

آپ 1951ء میں جاں بحق ہوگئے۔

دل شیدا ہوا جاتا ہے بسمل روئے جاناں کا
جبیں کا ابروئے خمدار کا زلف پریشاں کا

خدا سے مانگتا ہوں شربت دیدار لے ساغر
نہیں معلوم تشنہ کب سے ہوں میں روئے جاناں کا

روحی آمبوری

محمد عزیزالدین روحی کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں حضرت شیخ احمد فقیہہ رحمۃ اللہ علیہ سات گڑھ سے ملتا ہے جنھیں نواب آف آرکاٹ کی جانب سے علاقہ سات گڑھ میں منصب قضاوت عطا ہوا تھا۔ فقیہہ موصوف نواب سات گڑھ کے نائب کے خاص مصاحبوں میں تھے۔ نواب کی جانب سے مناسب جاگیر کے علاوہ مسجد نواب دریاخاں اور مسجد نواب نعمت علی خاں کی تولیت بھی عطا ہوئی۔ شیخ موصوف کا مزار آج بھی مسجد دیوان صاحب نواح سات گڑھ میں واقع ہے جو اب غیر آباد ہے۔ محمد عزیزالدین روحی 1310ھ 1892ء میں بمقام سات گڑھ (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا غیاث الدین مرحوم اور حضرت مولانا قاضی قادر محی الدین اطہر سے حاصل کی 1910 میں آپ کے والد بزرگوار محمد رفیع الدین نے تقسیم جاگیر کے متعلق خاندانی مقدمہ بازی سے تنگ آکر سات گڑھ سے ہجرت کرتے ہوئے شہر آمبور میں مستقل سکونت اختیار کی اور یہاں ایک مسجد کی امامت پر مامور ہو گئے۔ آمبور آنے کے بعد روحی آمبوری نے مظہر العلوم مدرسہ میں چند سال تعلیم پائی اور پھر اسلامیہ ہائی اسکول وانمباڑی میں دو تین سال پڑھنے کے بعد 1910ء میں دوبارہ مدرسہ مظہر العلوم میں بحیثیت مدرس مقرر ہوئے 1912ء میں آپ نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ چھوٹے پیمانے پر پان کی تجارت بھی شروع کی۔

کم عمری ہی سے شاعری کا ذوق تھا۔ ابتدا میں خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا تلمذ حاصل رہا۔ 1934ء جولائی میں "بزم سخن" آمبور کے مشاعرے میں مولانا محوی صدیقی سے ملاقات ہوئی ایک دو دن کی پر لطف ادبی صحبت سے بے حد متاثر ہو کر ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ علامہ محوی صدیقی سے ملنے سے پہلے آپ کا تخلص روح تھا۔ ملاقات کے بعد محوی کی اتباع میں اپنا تخلص روحی رکھا۔ آپ کا مجموعہ کلام "ریاضِ روح و نغمۂ روحی" 1938ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ اس مجموعہ میں حمد، نعت، مخمس، اردو غزل، فارسی غزل، قومی ترانے، مسدس، رباعیات، قطعات شامل ہیں۔

آپ کی صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی۔ اندازاً 1949ء میں آپ نے

داعی اجل کو لبیک کہا۔

ہر روز انتظار ہے خط کے جواب کا ۔۔۔ یہ آپ کا سکوت ہے باعث عذاب کا
آئے ہو نزع میں تو اٹھا دو نقاب کو ۔۔۔ اے میری جان یہ نہیں موقع حجاب کا
اتنا نہ کر غرور جوانی پہ بے وفا ۔۔۔ دو دن کا میہماں ہے زمانہ شباب کا

تو کمر یہ کناں شمع سحر کس کے لئے ہے ۔۔۔ یہ سوز جگر، دیدۂ تر کس کے لئے ہے
کہتے ہو ترے قتل کا ساماں نہیں کچھ بھی ۔۔۔ خنجر یہ بھلا زیب کمر کس کے لئے ہے
رو تی نہیں تاثیر دعاؤں میں تمہاری ۔۔۔ پھر آہ و بکا آٹھوں پہر کس کے لئے ہے

منوّر آرکاٹی

سراج السالکین شمس العارفین حضرت سلطان منوّر علی شاہ قادری اپنے وقت کے بڑے بلند پایہ صوفی، جیّد عالم تھے۔ 1971ء میں آپ کے شعری مجموعہ "بہارِ منوّر" کی دوسری جلد خود ان کے فرزند رفیق علی شاہ قادری نے ہمدرد پریس مدراس سے شائع فرمائی۔ اس شعری مجموعہ سے حضرت منوّر کی شعری بلند پائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ حمد، نعت، قصیدہ، منقبت وغیرہ کے اصناف سے منوّر اور مزّین ہے اس مجموعہ کے آسماں سے تصوف کی جو نورنگ پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں وہ ہمارے دل و دماغ کو ایک نئی تازگی اور توانائی عطا کرتی ہیں۔ اس مجموعہ سے کہیں پتہ نہیں چلتا کہ منوّر علی شاہ قادری کی ولادت اور مقام پیدائش کیا ہے؟ ہاں اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان منور علی شاہ قادری آخری عمر میں رانی پیٹ ضلع شمالی آرکاٹ میں سکونت پذیر تھے۔ اور یہیں وصال پایا اور آرکاٹ میں مدفون ہوئے۔

لینا ادب سے نام ہے احمد کے نور کا ‏ صلِ علیٰ درود پڑھو سب حضور کا
خورشید حشر گرم رہے جب حساب کو ‏ دفتر بغل میں ہوگا ہمارے قصور کا
چمکیں گی سر پہ بجلیاں رحمت کی دیکھنا ‏ بادل رہے گا سر پہ محمدؐ کے نور کا

زاہد دوانہ ہوگیا اپنی نماز کا ‏ ملتا ہے کب پتہ اسے راز و نیاز کا
جنت دکھا رہا ہے ہمیشہ وہ ہاتھ میں ‏ پتلا بنا رہے گا وہ اپنے ہی راز کا

یہ مجموعہ ڈیمائی سائز کے 208 صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور دعائیہ اشعار پر ختم ہوتا ہے۔ کوشش کے باوجود حضرت منوّر علی شاہ قادری کے حالات زندگی معلوم نہ ہوسکے۔

حضرت غلام حسین دلیل مدورئی

حضرت غلام حسین دلیل 1894ء میں مدورے کے ایک مشہور و معروف مقام قاضی محلہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک نہایت شریف متمول ذی علم اور بااثر خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کے دادا گورنمنٹ پلیڈر تھے۔ حکومت اور عوام میں ان کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ دلیل کا تعلق قاضی گھرانے سے تھا جس کی وجہ سے ان کی شہرت اور جاہ و حشمت بہت زیادہ تھی۔ اس خاندان کے سبھی افراد بڑے ذی علم تھے۔ خود دلیل کے والد بزرگوار حضرت محمد ابراہیم ذابح بڑے درجے کے عالم باعمل اور اچھے شاعر تھے دلیل نے عربی اور فارسی علوم کی تعلیم خود اپنے ابا حضور سے حاصل کی۔ دلیل نے 1911ء میں یونین کرسچین ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد مدورا کے کلکٹریٹ میں بحیثیت کلرک ملازمت اختیار کی پھر کچھ دنوں کے بعد یونین کرسچین ہائی اسکول میں اردو منشی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان دنوں تدریس زبان و ادب کی بہت زیادہ خدمات انھوں نے انجام دیں۔ چند سال بعد خوش قسمتی سے امریکن کالج مدورا میں اردو لکچرر کے عہدے پر بھی فائز ہو گئے۔ 1956ء میں یہاں سے ریٹائر ہو کر مدراس آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ قیام مدراس کے دوران انھوں نے کچھ دنوں کے لئے نیو کالج مدراس میں اردو لکچرر کے فرائض انجام دیئے پھر اس عہدے سے سبکدوش ہونے کے ڈیڑھ سال کے بعد مسلسل علالت کا شکار ہو کر 12 اگست 1975ء میں اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔

حضرت دلیل ایک اچھے خوش فکر شاعر تھے۔ آپ کی طویل نظم "کائنات" بڑی معرکہ کی نظم ہے جس میں دلیل نے اپنے مشاہدات اور تجربات اور معلومات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ یہ نظم زبان و بیان، تخیل، مشاہدہ، تجربہ کی بھرپور خصوصیات کی حامل ہے دلیل کا رجحان زیادہ تر نظم کی طرف تھا لیکن زمانے کے چلن کے مطابق آپ نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ آپ کی غزلیں بھی خاص انفرادیت کی آئینہ دار ہیں۔ آپ فارسی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں سے واقف تھے۔ ان تینوں زبانوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا آپ عصری

رجحانات سے بھی غافل نہیں تھے۔ اسی لئے ان کے یہاں فکر و نظر کا وہ امتزاج ملتا ہے جو ہر طرح توجہ کے قابل ہے۔ کلام کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دلیل، اقبال کے لہجے سے زیادہ متاثر تھے اور موضوعاتی نظموں کے سلسلے میں دلیل نے اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے۔

آپ بڑے مخلص اور ملنسار تھے، طبیعت میں انتہا درجے کی انکساری تھی، وضع دار تھے آخر دم تک اپنی وضع داری کو نبھایا۔ دلیل بے حد نفاست پسند تھے۔ خوش سلیقگی آپ کا شعار تھا، بلند اخلاق اور وسیع النظر تھے۔ آپ کے کردار کے محاسن آپ کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ دلیل کی شخصیت میں بڑی محبوبیت پائی جاتی تھی۔ دلیل کا لہجہ خاصا جانا پہچانا ہے۔ مشاعروں میں بہت کم حصہ لیتے تھے لیکن خاموشی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کو اپنا فریضہ اولین سمجھا۔

○

میں گرد راہ کشتۂ عجز و نیاز تھا — البتہ دل کو رحمت باری پہ ناز تھا
نغمہ جو خام تھا، نہیں الہام کا قصور — بگڑا ہوا مگر مری فطرت کا ساز تھا
بخشش کے بعد اتنا گنا ہوں کا تھا اثر — پہونچا تو باب خلد بریں نیم باز تھا
حاصل ہوا نہ معرفت نفس کو کمال — اب بھی میں ایک راز ہوں پہلے بھی راز تھا

تسلیم کے سہارے گزرتے ہیں دن دلیل
کب میرا دل نہ وقف غم جاں گداز تھا

○

یہ زمیں کیا ہے آسماں کیا ہے — تیرے ہوتے ہوتے جہاں کیا ہے
تیری آہوں سے بدگماں ہوں میں — آتش عشق میں دھواں کیا ہے
لذت سوزش فراق نہ پوچھ — میں نہیں جانتا فغاں کیا ہے
نذر آتش ہوا چمن سارا — یہ تجھے فکر آشیاں کیا ہے

اس کے در کے سوا دلیل کہیں
اور بھی کوئی آستاں کیا ہے

○

○

حقیقت میں پنہاں بہشت بریں ہے
نہ ہے آسماں پہ نہ زیرِ زمیں ہے
حوادث میں ساماں ہیں زندگی کے
یونہی گردشِ آسمان و زمیں ہے
یہ مانا کہ نوری ہے دل جسمِ خاکی
طبیعت کو میں کیا کروں آتشیں ہے
خرد رہ گئی آستاں سے لپٹ کر
محبت مگر ہمکنارِ مکیں ہے
دلیلِ عشق سے اس کی قیمت نہ دیکھو
مرا دل خریدارِ جانِ آفریں ہے

-○

خموشی

کھڑا ہوا لبِ ساحل ہوں میں سرِ مغرب
عجیب ایک خموشی جہاں پہ ہے غالب
فلک نے وقت سے پہلے بہت بصد عجلت
اڑا رکھی ہے زمانے پہ چادرِ ظلمت
سماں ہے حسرت و حرماں کا سارے عالم میں
شفق بھی آج سیہ پوش ہے کسی غم میں
فلک نہیں ہے گھٹاؤں کا شامیانہ ہے
خبر نہیں کہاں خورشید کا ٹھکانا ہے
جو سامنے ہے سمندر رہے ایک نقشۂ آب
نہیں ہے ایک خطِ موج بھی بصفحۂ آب
نہ شور ابر کا کوئی نہ بجلیوں کی چمک
گلوں میں بند ہے آتی نہیں چمن سے مہک
یہاں ستون کی مانند سب کھڑے ہیں شجر
یہاں طیور بھی گل کی طرح ہیں چپ یکسر
یہاں خموش ہیں بحر و بر، آسماں خاموش
میرے خیال میں ہے آج کل جہاں خاموش

فلک کے پردے پہ رنگِ سیاہ ہیں بادل
سکوں گرفتہ ہیں ان میں نہیں کوئی ہلچل
ہے ہم زبان یہاں میری خود فراموشی
سیاہی شام کی حیرت فزا، یہ خاموشی
مری نظر میں یہ ملکِ عدم کا منظر ہے
کہ دید جس کی مجھے جیتے جی میسر ہے
خیال ہوتا ہے پہلے ظہورِ خلقت سے
سکوت ہی کے ازل میں تھے ہر طرف جلوے
کسی طرح کی صدا کا یہاں نہیں ہے گذر
مگر یہ شعر نمایاں ہے لوحِ فطرت پر
نہیں سکوت تو آواز کا وجود نہ ہو
خدا نہ ہو تو کسی شئے کی ہست و بود نہ ہو

۱

• مجھے ہے ڈر کہ سخن کی بلند پروازی
کہیں کرے نہ حقیقت کی میری غمازی
فقیر میں ہوں مجھے شاعری سے کیا مطلب
مرا ہے میرا کام زمانے میں صرف دلسازی

۲

• فقیروں کی ہے فطرت دل نوازی
محبت جاں نثاری، کارسازی
مگر آزاد ہیں دونوں جہاں سے
ہے اُن کے دل کا جوہر بے نیازی

۳

• نمودِ غیر سے ثابت ہوا تھا اپنا وجود
خودی عیاں ہوی اپنی تو غیر تھا مفقود
کھلی ہے چشمِ حقیقت تو دیکھا کیا ہوں
نہیں ہے ذاتِ خدا کے سوا کوئی موجود

۴

• جب تک ہے تری آنکھ گرفتارِ مجاز
آئیں گے نظر تجھ کو نشیب و فراز
ہے دیدۂ حق میں تو نظر آئے تجھے
انصافِ الٰہی و مساوات کے راز

احساس

کہا شبنم کسی نے چشم گل میں دیکھ کر پانی
صدا آئی نہیں ہم ہیں کسی مظلوم کے آنسو
دبایا زخم گل کو میں نے جب کہ خون نہ نکلا
یہ قدرت دیکھ کر دل ہو گیا حیرت سے بے قابو
کہیں دیکھا سراپا میں نے دودِ آہ ہے سنبل
کہیں شوریدہ حالی سے گریباں چاک ہے شبو
کہا چلّا کے لالہ نے مرا خونیں کفن دیکھو
تہی پیمانہ ہوں لیکن سلگتا ہے مرا پہلو
جلانا ہے مجھے داغ جگر ہوں زخم سرتاپا
نکلتی ہے یہ میری جان! تم سمجھے کہ ہے خوشبو
رہا ہوں کشتۂ تیغِ ستم میں اک مدت تک
مری حسرت زدہ آنکھوں سے جاری ہو گئے آنسو
یہ پوچھا میں نے پھولوں سے چمن میں یوں حسیں ہو کر
ہماری طرح کیوں ہو مبتلائے دردوغم ہر سو
کہا نرگس نے کیفیت مری پوچھو نہ گلشن کی
سدا رکھتا ہے مجھ کو محوِ حیرت حسن کا جادو
ہوا سوسن کی جانب میں مخاطب تو کہا اس نے
حقیقت سے نہیں آگاہ کیا انساں ہو کر تو
ہماری پوچھتا کیا ہے درو دیوار کے دل ہیں
کئی پتھر ہیں جو تیغ جفا سے نیم بسمل ہیں

مولانا ضیاالدین آمانی پلی کنڈاوی

مفتیٔ اعظم، استاذ العلماء، شیخ الملت حضرت علامہ مولانا ضیا الدین امانی پلی کنڈاوی (شمالی آرکاٹ) 1893ء میں پیدا ہوئے۔ باقیات صالحات مدرسہ میں عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آپ کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر علوم عقلیہ کی طرف تھا اس لئے حکمت، منطق اور فلسفہ میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ اسی دارالعلوم میں درس و تدریس کی خدمات پر مامور ہوئے۔ برسوں اس دارالعلوم میں خدمات انجام دینے کے بعد جامعہ منبع الانوار لال پیٹ (شمالی آرکاٹ) کی ترقی و توسیع کی خاطر یہاں کے پرنسپل مقرر ہوئے اور آخری عمر تک اسی دارالعلوم سے منسلک رہے۔

مولانا امانی کو بیک وقت کئی زبانوں پر ملکہ حاصل تھا۔ آپ میں تنقیدی شعور بھی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ایک زمانے میں جب حضرت امیر مینائی پر حضرت داغ مرحوم کے شاگردوں (مولانا ناطق گلاوٹھوی وغیرہ) نے اعتراضات کرکے شعر و ادب میں تہلکہ مچا دیا تھا تو مولانا امانی کی سنجیدہ تنقید نگاری نے معترضین کو خاموش اور شعری ادب میں پھیلے ہوئے انتشار کو دور کردیا تھا۔ آپ کے مدلل اور معرکۃ الآرا مضامین "نیرنگ خیال"، "ادبی دنیا"، "ریاض الاخبار"، "جلوۂ یار"، "مصحف" وغیرہ میں بالالتزام شائع ہوتے تھے۔

مولانا غالباً 1951ء کے اواخر میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات "پیغمبر کی زندگی" کے نام سے شاہنامے کی طرز پر آسان "عام فہم" اور پاکیزہ زبان میں لکھ چکے تھے لیکن افسوس ہے کہ آج تک یہ کتاب منظر عام پر نہ آسکی۔

مولانا کی تالیف "گلشن سیرت" 1950ء 1369ھ میں منظر عام پر آئی۔ اس تالیف میں مولانا نے سیرت طیبہ انتہائی جگر سوزی سے نظم کی ہے۔ مولانا کی اس منظوم سیرت کی قدر اور تعریف اپنے دور کے جن بہترین علماء اور شعراء نے کی ہے ان میں حضرت خواجہ حسن نظامی، جوش ملیح آبادی، پروفیسر عبدالقادر سروری، مولانا ابوبکر نظمی، مولانا سید عبدالوہاب بخاری اور ڈاکٹر عبدالحق کے نام قابل ذکر ہیں۔

مولانا کی مندرجۂ ذیل تصانیف (اردو، فارسی میں) منظر عام پر آچکی ہیں:

"دیوان امانی" (فارسی میں) 1337 ھ۔ "نوحہ غم"۔ "نالہ درد"۔ "فلاح یار"۔ "مشورۂ سخن"۔ "گلشن سیرت"۔ مزید برآں مولانا کی بہت ساری کتابیں عربی زبان میں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ مولانا نے بمقام لال پیٹ (شمالی آرکاٹ) 9 اگست 1966ء / 3 ربیع الثانی 1386 ھ) میں وفات پائی۔

○

کس کا دل آج داغدار نہیں — مبتلائے فراقِ یار نہیں
شاہ بھی ہے فقیر کا محتاج — خواجگی وجہ افتخار نہیں
ہر کلی یہ چٹک کے کہتی ہے — زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
دعوئ عاشقی نہیں مشکل — سب ہیں منصور اب جو دار نہیں
شادی و غم ہو یا وصال و فراق — ایک بھی ان میں پائیدار نہیں
ہے وہ اک ربِ ذوالجلال کی ذات — زندگی جس کی مستعار نہیں

وہ بھی کہنے لگے امانی سے
شاعروں میں ترا شمار نہیں

○

الٰہی دل ملے زردار کو عثمانِ عفّان کا — ملے مجھ ناتواں کو زورِ بازوئے شیرِ یزداں کا
خوشی دم بھر ہوئی حاصل تو عیشِ جاوداں سمجھے — ہمیں یاد آگیا تھا مسکرانا برقِ خنداں کا
مجھے آوارگی سے روکتے ہیں دشتِ وحشت میں — خدا کا شکر ہے پھر شکر ہے خارِ مغیلاں کا
نہیں معلوم کس کی یاد ایسے ہر دم ستاتی ہے — رُلاتا ہے مجھے رہ رہ کے رونا ابرِ گریاں کا
پریشاں حال ہوں ناکامیوں میں عمر گزری ہے — مصمم عزم ہے منہ تک نہ دیکھوں آبِ حیواں کا
چھپایا راز مرا خشک ہو کر چشمِ گریاں نے — دہن وا ہی رہا لیکن مرے چاکِ گریباں کا

امانی سے کوئی کہہ دو سخن ہے باعثِ زحمت
چمن میں حشر عبث ہے غیر [illegible] مرغِ غزل خواں کا!

○

علامہ ابوصالح محمد غضنفر حسین شاکر نائطی

علامہ غضنفر حسین شاکر نائطی 1899ء میں بمقام مینبور پیدا ہوئے۔ مینبور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو چنچی سے دو ڈھائی میل جنوب میں واقع ہے۔ اس گاؤں کی آبادی کا کثیر حصہ اہل نائط سے ہے۔ آج بھی یہاں کے لوگ اکثر اہل علم ہونے کے ساتھ ساتھ زراعت پیشہ اور تاجر ہیں اس گاؤں میں بڑے بڑے علماء اور فضلاء پیدا ہو چکے ہیں۔ کئی عالم ایسے بھی گزرے ہیں جو اہل تصنیف ہیں قرآن مجید کی تعلیم کے علاوہ علم فقہ پر بھی یہاں کے لوگ اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے۔ علامہ شاکر نائطی اس طبقے کے چشم و چراغ تھے۔ حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری سجادہ نشین خانقاہ اقطاب ویلور سے آپ کے والد محمد علی شاکر کے بہت اچھے مراسم تھے سید شاہ عبداللطیف کی وساطت سے شاکر نائطی ویلور آئے اور مدرسہ لطیفیہ ویلور سے نو سال کی مدت میں یہاں کا تعلیمی کورس ختم کیا یہاں آپ نے مولانا محمد قاسم صاحب کی نگرانی میں رہ کر فارسی اور اردو شاعری کی مشق جاری رکھی اور محمد قاسم صاحب کی ایما پر اوریس کالج ویلور میں اردو اور فارسی زبان کے معلم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا اور دو سال تک اس کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے 1924ء دسمبر میں بانیٔ دارالسلام عمرآباد کی دعوت پر آپ عمرآباد آئے اور آخری عمر تک اسی مدرسہ کے ہو کے رہے۔

علامہ شاکر نائطی کی شخصیت اور فن اور ان کی ادبی خدمات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے اس دور میں جب کہ تامل ناڈو میں آتش و ناسخ کے علم بردار اپنی اپنی دکانیں سجائے بیٹھے تھے اردو شاعری کو وہ موڑ دیا جو غالب کی فکر اور اس کے آہنگ سے قریب تھا۔ غالب مولانا شاکر نائطی کے ممدوح شاعر تھے۔ آپ نے کئی نہج سے غالب کے فکر و فن کو اپنایا لیکن کبھی غالب کی اندھا دھند تقلید کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ آپ کا تعلق مولانا ناطق گلاٹھوی کے توسط سے داغ اسکول سے ملتا ہے لیکن مولانا شاکر نائطی کا لہجہ غالب سے قریب ہے۔

آئینہ کہہ کے رکھ نہ سکا ان کے سامنے حسرت کی چٹکیوں سے مرا دل کبود تھا
ڈر کسی کا نہیں ساری شبِ غم اپنی ہے خوب رولے دل ناکام سحر ہونے تک

مولانا کی کئی غزلیں ایسی ہیں جن میں غالب کا بھرپور آہنگ ملتا ہے۔ داغ اسکول کے تعلق سے مولانا نے ایسے شعر بھی کہے ہیں۔

اے شیخ بے مراسم رندی نہ پی شراب پی آدمی کی طرح بھلے آدمی شراب

مولانا نے فکر انگیز شاعری کی بنیاد ڈالی۔

جب علامہ محوی صدیقی نے تامل ناڈو میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ان کی آمد کے بعد ہی تامل ناڈو میں شعر گوئی کا شستہ مذاق پیدا ہوا اور ارباب ذوق مشاعروں سے روشناس ہوئے تو مولانا شاکر نائطی نے محوی صدیقی کے اس دعوے کے بطلان میں بڑی جدوجہد کی اور علامہ محوی کے اس دعوے کو بے جا تعلی پر محمول کیا۔

حضرت علامہ شاکر نائطی ایک فرد نہیں ایک ادارہ تھے۔ یہ ایک کلیشے Cliche نہیں ناقابل تردید حقیقت ہے۔ بیسویں صدی میں یہاں اردو شاعری کا افتتاح حضرت شاطر مدراسی نے اپنے قصیدہ "اعجاز عشق" سے کیا اور ملک بھر کے اکابرین علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کیا۔ شاطر کے بعد جس ہستی نے تامل ناڈو کو ایک بار پھر شعر و ادب کے نقشے میں تیکھے نقوش کے ساتھ ابھارا وہ حضرت علامہ شاکر نائطی ہیں

علامہ اردو، عربی اور فارسی زبانوں کے جید عالم تھے اور ان تمام زبانوں کے ادب کا ہر روشن اور تاریک گوشہ آپ کی نظر میں تھا۔ ان تینوں زبانوں کے کسی بھی اہم شاعر کی شاعری کا جائزہ جامع و مانع انداز میں دوران گفتگو منٹوں میں بیان کر دیتے اصحابِ رسولؐ کی شاعری پر آپ کی مبسوط کتاب "الانابۃ الی اشعار الصحابہ" کتابی شکل میں شائع ہوئی تو اہل علم کو آپ کی عربی دانی اور شعری بصیرتوں کا ہلکا سا اندازہ ہوا اس کتاب کو مدینہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا۔

قرآن کی لفظیات پر لسانی، تاریخی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے غور و فکر کرتے رہنا علامہ کی ایک بے حد محبوب علمی مصروفیت تھی اور آپ نے اپنے غور و فکر کے نتائج کو قلمبند کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن یہ عظیم کارنامہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

علامہ نے مدرسۂ دارالسلام عمر آباد شمالی آرکاٹ کے استاد اور پھر پرنسپل کی

حیثیت سے اس مدرسہ کو ایک عظیم درس گاہ بنانے میں بے حد نمایاں اور مرکزی رول ادا کیا تھا جسے علمی اور دینی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

علامہ نے نہ صرف علم دین کے فروغ کو اپنا مشن بنایا بلکہ شعر و ادب کو زندگی کی ایک اعلیٰ قدر کے طور پر پیش کرنے اور منوانے کا کارنامہ بھی انجام دیا یہیں سے آپ نے ماہنامہ "مصحف" کا اجرا کیا تھا جو اپنے دور کا ایک بے حد موقر علمی اور ادبی جریدہ تھا اس میں شمال وجنوب کے اساتذۂ علم وفن کی تخلیقات پیش کی جاتی تھیں لیکن ابھرتے ہوئے شعراء اور ادباء کی ہمت افزائی بھی اس جریدے نے اپنے فرائض میں شامل سمجھا تھا اور اس فرض کو بڑی تندہی سے ادا بھی کیا۔

غالباً حقیقت، حق اور حسن کی تلاش علامہ کی شعوری زندگی کے آغاز ہی سے ان کی شخصیت کا ایک جزبن گئی تھی کیونکہ جہاں تک آپ کے بچپن اور لڑکپن کے بارے میں مولف تذکرہ نے تحقیق کی آپ ہمیشہ ہی سے کسی نہ کسی درجہ میں اس راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ راہ سلوک کے ایک نوجوان متلاشی اور پھر ایک سالک کی حیثیت سے آپ کی زندگی کا جائزہ ایک طویل مقالے کا متقاضی ہے۔ بہرحال یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ تامل ناڈو میں اپنے کئی پیش روؤں کی طرح لیکن اپنے اکثر ہم عصروں کے برعکس آپ کی شاعری میں تصوف برائے شعر گفتن نہیں ہے بلکہ آپ کے ذاتی تجربے کی ترسیل کی قابل قدر کوشش ہے۔

علامہ نے اپنے علم وادب اور اپنی شخصیت کے نور سے ایک پورے دور کو منور کیا اور اس نور کی کرنیں آج بھی محوِ سفر ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

(۱)

ہے کوئی چیز حاصلِ دنیا کہیں جسے
اس کے سوا کہ بادۂ مینا کہیں جسے
کل ان کے سامنے مری صورت سوال تھی
یعنی وہ تھا سکوت تقاضا کہیں جسے
رہتے ہیں ساتھ شورش و آشوبِ زندگی
وہ کون ہے جہاں میں تنہا کہیں جسے
یہ وضع عشق جس میں خوشامد وفا کا نام
وہ خوئے حسن رنجشِ بے جا کہیں جسے
جلتا ہوں میں مگر نہ دھواں ہے نہ آگ ہے
دل کی لگی بھی وہ ہے تماشا کہیں جسے
ہوں سب میں اور سب سے جدا سب سے بے نیاز
میں ہوں بھرے جہان میں تنہا کہیں جسے
میں شاکر اپنے پردۂ وحشت کے واسطے
کرتا ہوں قطع دامنِ صحرا کہیں جسے

---

(۲)

ارمانِ وفا ہیچ ہے، امیدِ وفا ہیچ
پیمانِ وفا آپ نے باندھی بھی تو کیا ہیچ
سازِ غم دل چھیڑ کا محتاج ہے غافل
جو تشنۂ مضراب نہ ہو ایسی نوا ہیچ
اک بادِ بہاری کا فسوں ہے یہ چمن زار
سب روزِ نمو ہیچ یہ سب نشو و نما ہیچ
تقدیر ہی سب کچھ سہی تدبیر بھی کچھ ہے
بے ربطیِ کردار پہ قسمت کا گلا ہیچ

پس ماندۂ منزل سے تو پوچھ اس کی حقیقت
آسودۂ منزل کو سہی بانگِ درا ہیچ
چھوڑ اپنی ضرورت کو ضرورت ہے اسی کی
تدبیر بجز شیوۂ تسلیم و رضا ہیچ
ہمت ہو تو ہمدم ہے پہنچنے کی جگہ بھی
اس کشمکشِ زیست میں ہر ایک بلا ہیچ

---

(۳)

دل دل نہیں عکسِ رخِ دلبر سے نکل کر
آئینہ نہیں آئینہ جوہر سے نکل کر
کچھ دشت نوردی کی بھی پروا نہیں باقی
پھرتا ہے سراب پاؤں کے چکر سے نکل کر
اف کیفیت جوشِ مئے تند کی ساقی
دریا کی طرح بہتی ہے ساغر سے نکل کر
یہ دردِ سر اب مول کوئی لے نہیں سکتا
سودا نہ ہو آوارہ مرے سر سے نکل کر
اے قاتلِ سفاک اُدھر کیا ہے اِدھر دیکھ
اب دم ہے مرے سینے میں خنجر سے نکل کر
کس شوق سے یہ منتظرِ موت ہے تشا کر
رہ رہ کے جو آتا ہے دم اندر سے نکل کر

---

(۴)

چشمِ اداشناس بھی کیا لاجواب تھی
دیکھا تو ہر نظر نگہِ انتخاب تھی
دنیائے آب و گل میں سکوں کا گزر نہ تھا
نبضِ مریضِ عشق رگِ اضطراب تھی

اچھا ہوا کہ مر کے ٹھکانے تو لگ گئی
کم بخت جیتے جی مری مٹی خراب تھی
ہاں ایک بت کے روئے کتابی پہ تھی نظر
ہم پڑھ رہے تھے جس کو خدا کی کتاب تھی
جو تھا مرا خیال وہی تھا مقام حسن
جو خواب تھا مرا وہی تعبیر خواب تھی
شاکر کھلا یہ عقدہ پہنچ کر سرِ لحد!
ہستی طلسم بندیِ موجِ سراب تھی

---

(۵)

آئینہ بن گیا ہے وہ اک ان کے ناز کا
چمکا جو داغ میری جبینِ نیاز کا
ہم سر جھکائیں اور نہ ہو وجہ نازِ حسن
اے بے خبر یہ سجدہ ہے اہلِ نیاز کا
نشتر سے چھیڑتا ہے رگِ جاں کو بار بار
ہاں کام کا علاج ہے یہ چارہ ساز کا
پھر ان کو کوئی اہل تقاضا نہیں ملا
شعلہ گرانہ طور پہ پھر برق ناز کا
موقوف ختم حشر ہے اب میرے ہوش پر
دیکھو کرشمہ جلوۂ حیرت نواز کا
ہر سو الجھ رہی ہے حقیقت نگر نگاہ
پھیلا ہوا ہے دام طلسم مجاز کا
شاکر یہی نہ ختم تعلق کا حیلہ ہو
ان سے ملا ہے حکم جو عرضِ نیاز کا

---

(۶)

تیرا مقام سدرہ سے صد راہ ہے بلند
ہمت کرا سے خیال لگا تو سہی زقند
اللہ رے اشارۂ چشم حیا پسند
بولا نہ تھا کہ ہوگئی میری زباں بند
ڈورے تو ڈال زلفِ گرہ گیر پر ذرا
پھر جو نصیب میں ہو، کبھی پھینک تو کمند
تو ہے مجھے پسند تو میری پسند کیا
میری وہی پسند ہے جو ہے تری پسند
پامالِ صد ہزار تمنا دلِ حزیں
گویا ہے اک حکایت دنیائے چون وچند
دیتا ہے اشک دیدۂ مظلوم اس کو آب
سرسبز ہونے دیجئے اب رنگ زہرخند
شاکر پسند ہے جو تجھے لذتِ زباں
اردو نمک کے ساتھ ملا فارسی کی قند

---

(۷)

ہم چل رہے تھے اور بظاہر نشاں نہ تھا
دل کی لگی وہ آگ تھی جس میں دھواں نہ تھا
روکا تھا مجھ کو میری خودی کے حجاب نے
دیکھا تو ان کے در پہ کوئی پاسباں نہ تھا
موہوم جلوہ تھا ترے عکس خیال کا
بدلا خیال تو نے تو سارا جہاں نہ تھا
وہ کر رہے تھے مجھ کو وفاؤں میں پختہ کار
مشقِ ستم سے مدنظر امتحاں نہ تھا

تھا اعتبار نقص و کمال نگاہ شوق
وہ جلوہ جو عیاں بھی نہیں تھا نہاں نہ تھا
بجلی چمک چمک کے نظر ڈالتی رہی
گرتی کہاں! چمن میں مرا آشیاں نہ تھا
شاکر ہوا وفائے مسلسل سے کامیاب
آغازِ عشق میں تو وہ کچھ مہرباں نہ تھا

---

(۸)

معصیت کیش رہا دعویٔ پندار بہت
یعنی ناکردہ گناہ اور گنہ گار بہت
دل میں اتر لائے نہ رنگینیٔ گلزار بہت
گل کھلانے کو ہے اک آہِ شرربار بہت
سخت جانانِ محبت کی کرامت کہیے
ورنہ اس زیست کا اک لحظہ ہے دشوار بہت
میں نے ہر گام پہ گو ٹھوکریں کھائیں لیکن
کر دیا راہِ محبت کو تو ہموار بہت
نظر آتا ہے تو اربابِ محبت کا مآل
ہیں بہت لوگ ابھی جان سے بیزار بہت

(۹)

پہرا ہے حسرتوں کا دل و جاں کے آس پاس
اچھے ہیں پاسباں مرے ساماں کے آس پاس
تھا ہم سے خوف جامہ دری بعد مرگ بھی
پھرتا رہا کفن تنِ عریاں کے آس پاس
گویا چلے ہیں مرکبِ شاہانہ لے کے ہم
سو حسرتیں ہیں اک غمِ جاناں کے آس پاس

فتنے اٹھیں گے اس نگہ سحر فن کے ساتھ
بیٹھے ہوئے ہیں گوشۂ داماں کے آس پاس
جلدی ہے ختم ہونے کی شورِ حیات کو
چرچے ہیں ایسے شہرِ خموشاں کے آس پاس
شاکر نہیں جو خاک بسر داستانِ عشق
کیا ہے خطِ غبار میں عنواں کے آس پاس

---

(۱۰)

اخیر دور ہے بھر بھر کے شیشۂ مے لا
شراب خم میں جو ساقی بچی ہوئی ہے لا
خیالِ حسن مصیبت ہے جانِ مجنوں کو
شبِ فراق درازیٔ گیسوئے لیلا
سمیٹ دفترِ عصیاں کو دے ادھر واعظ
اٹھا یہ وعظ و نصیحت کی ڈاک کا تھیلا
ارے یہ وسعتِ دشتِ وجود ہے کتنی
جنون! ہوش میں آ دیکھ پاؤں کم پھیلا
ترانے دورِ مسرت کے یاد آتے ہیں
کبھی تو پھر وہی نغمہ سنا وہی لے لا
رچی ہوئی ہے جنوں کی نظر میں شادی سی
مچی ہوئی ہے جہانِ خرد میں واویلا
کفن پہن کے چل اس بزمِ ناز میں شاکر
اتار جامۂ ہستی کہ ہے بہت میلا

۱۱

ہے چشم شوخ کا وہی چنچل چلن ابھی
یہ جانفزا ابھی ہے تو ہمت شکن ابھی
ہے شوق کو ابھی ہوس نغمۂ طرب
ہے ساز دل پہ نشتر غم زخمہ زن ابھی
کیوں کر کہوں چڑھی ہوئی تیوری اتر گئی
طرف نقاب میں تو وہی ہے شکن ابھی
احرام بند کعبۂ مقصود مرگ ہوں
ممتاز کچھ کفن سے نہیں پیرہن ابھی
سویا ہے اس کے سایہ میں فتنوں کو لے کے حشر
بیدار ہے تری نگۂ پر فتن ابھی
میں نامراد ابھی ہوں وہی جرعہ نوش غم
یعنی وہی ہے تلخئ کام و دہن ابھی
شاکر یہ کہئے مدعئ خود پسند سے
اہل کمال سے نہیں خالی دکن ابھی

۱۲

آتی ہے تو آتا نہیں کچھ تیرے سوا یاد
آ جائے تو ہوتی ہے تری یاد بھی کیا یاد
افسانے مظالم کے وہ بھولے نہیں جاتے
جب یاد بتاں آتی ہے آتا ہے خدا یاد
ہے بے خودئ عشق مری رسم عبادت
کچھ اور تو مجھ کو نہیں آداب دعا یاد
بے صرفہ یہ دن رات کے چکر میں پڑا ہے
اب چرخ ستم گر کو نہیں راہ جفا یاد

اندیشۂ فردا نہ مجھے شکوہ ماضی
ہو تیری عنایت تو کسی بات کی کیا یاد
افتاد کے انداز پہ رحمت کا تبسم
آئے گی گنہ کو بھی مری لغزش پا یاد
مدت ہوئی بھولے ہوئے غم کا بھی فسانہ
شاکرؔ کبھی اپنی بھی تھی یاد تو تھا یاد

---

(۱۳)

ہے کہاں کلفتِ آغاز کا انجام ابھی
سامنے اور ہے کیا کیا دل ناکام ابھی
پائے واماندہ کو چھوڑ اور کوئی راہ نکال
فکر منزل ہے تو چل دور ہے کچھ شام ابھی
ہے بری طرح رہین سروسامان وجود
پختہ کاران جہاں کی طمع خام ابھی
طوفِ کعبہ میں ہے ایک وضع تلاش اصنام
گھیرے پھرتا ہے مجھے جامۂ احرام ابھی
آرہا ہے اسے گذری ہوئی فرصت کا خیال
ڈھونڈتا ہے دل ناداں وہی آرام ابھی
ہم نے چھیڑا ہے تو ہاں ان کو منا بھی لیں گے
لے تو لینے دو ذرا لذت دشنام ابھی
اس کو مل جائے گی شاکرؔ کی اسیری سے نجات
فکر صیاد ہے اک مرغ نہ دام ابھی

---

(۱۴)

اے حسن ازل تیری کیا شان نرالی ہے
دیکھا تو جلالی ہے سمجھا تو جمالی ہے
ہوں ضبط محبت کا خوگر تو مگر اکثر
مچلی ہے طبیعت تو مشکل سے سنبھالی ہے
رسم و رہ ہستی کا پابند نہیں عاشق
کہتے ہیں جنوں جس کو آزاد خیالی ہے
تخریب سے فارغ ہے اب مرد خراباتی
تعمیر کرے گا پھر بنیاد تو ڈالی ہے
اک وحشت ہستی ہے دھندلے مجھے دنیا کا
کچھ دھول اڑاتی ہے کچھ دھول اڑالی ہے
ہے گرد تماشا سا اک غول بیاباں کا
صحرا میں بھی ہم نے تو بستی سی بسالی ہے
انداز بیاں تو نے سیکھا یہ نیا تشنہ کر
اب طرز نگارش میں آزاد خیالی ہے

---

(۱۵)

کام آساں کی طرح اب ہو کر مشکل کی طرح
ڈال تو دیتا ہوں پہلو میں نئی دل کی طرح
سوز پنہاں دیکھنے والے یہاں کوئی نہیں
جل رہا ہے دل بھی میرا شمع محفل کی طرح
ہو کے برباد محبت شان محبوبی ملی
اٹھ رہا ہے اب غبار قیس محمل کی طرح
شکوۂ تاریکی شام فراق اچھا نہیں
داغ ہائے دل جہاں ہوں ماہ کامل کی طرح

(۱۷۹)

کشت زارِ عشق میں کچھ داغ دل پھولے پھلے
کچھ ہمیں حاصل نظر آیا نہ حاصل کی طرح

اے غبارِ دہر ہم کو دادِ استغنا تو دے
گزری ہے دامن جھٹکتے موجِ ساحل کی طرح

دعویٰ ہوش و خرد کرتے ہیں شاکر بے خبر
رہتے ہیں دنیا میں اہل ہوش غافل کی طرح

---

(۱۶)

ڈالی ہے دو عالم پر مٹی ابھی ڈالی ہے
بس کچھ نہیں اب ہم ہیں یا ہمت عالی ہے

یہ تو یہ ترا جلوہ اب آنکھ کھلی میری
یا دن میں اندھیرا تھا یا رات اجالی ہے

ملتی ہے بڑی راحت اب خاک نشینی میں
میں نے طبیعت ہی مٹی کی بنالی ہے

کونین کی دولت میں الفت ہی پسند آئی
قسمت کی وہی شے تھی جو ہم نے اٹھالی ہے

کیا رکھا ہے دیوانے ان عقل کی باتوں میں
برگشتہ مزاجی ہے آشفتہ خیالی ہے

اڑنا ہے ہمیں لے کر رسوائی الفت کو
جو تم نے اڑادی ہے وہ بات اڑالی ہے

حاصل ہے کرم اس کو اک مرشد کامل کا
شاکر کی دعا لے لو شاکر نے دعا لی ہے

۱۷

عجب انداز سے خنجر بکف وہ تند خو آیا
میں یہ سمجھا کہ انجامِ محبت روبرو آیا

پریشاں کار کو اچھا یہ طرزِ گفتگو آیا
بیانِ زلف ہو کر ذکرِ وحشت مو بمو آیا

دلِ افسردہ کی حالت بدل دی ذکرِ دشمن نے
یہ ان کے منہ سے سن کر جوش میں میرا لہو آیا

رقیبوں کو بھی تھا الفت میں دعویٰ سرفروشی کا
سرِ مقتل بجز میرے نہ کوئی روبرو آیا

رہی جانِ حزیں تا صبح آ کر دونوں آنکھوں میں
قیامت تھی شبِ وعدہ نہ موت آئی نہ تو آیا

عدم کو بھی اگر لے جائے گی تو آرزو تیری
یہاں بھی میں اگر آیا تو بہرِ جستجو آیا

سمائے گا کہاں محشر میں یہ طوفانِ بے تابی
جہاں آرزو لے کر شہیدِ آرزو آیا

دل اس کوچے میں جب پہنچا تو لے کر آرزو پہنچا
یہ جب آیا ہے اس کوچے سے کھو کر آبرو آیا

نشانِ عشق تھی منت کی ہنسلی عہدِ طفلی میں
جنوں بولا کہ لے شاکر پہن طوقِ گلو آیا

---

(۱۸)

پچھتا رہے ہیں آپ سے آنکھیں ملا کے ہم
اب کیا کہیں کہ آ گئے منہ میں بلا کے ہم
خود اپنی رو میں بہہ گئے آنسو بہا کے ہم
دیکھو ہمیں کہ بیٹھے ہیں دریا لٹا کے ہم
ن کے حریم ناز کے جلوے ارے غضب
کیا دیکھتے کہ گر گئے پردہ اٹھا کے ہم
قید قفس میں کاٹتے بے فکر ہو کے دن
ہوتے اگر اسیر نشیمن جلا کے ہم
جب تک نیا ستم نہ ہو رہتے ہیں مضطرب
اتنے ہوئے ہیں خیر سے خوگر جفا کے ہم
اب بزم زیست سے ہمیں اٹھنے کی فکر ہے
بیٹھے ہیں نقش آرزوئے دل مٹا کے ہم
اے بت خدا کے واسطے کچھ تو خیال کر
بیٹھے ہیں تیری یاد میں بندے خدا کے ہم
پردہ نشیں کا عشق ہے گوشہ نشیں نواز
رکھتے ہیں گھر میں راز محبت چھپا کے ہم
اس کاروان زیست کی وحشت نہ پوچھیے
ٹھہرے نہ تھے کہ چل دیئے ساماں اٹھا کے ہم
سو رنج دے کے ہے انھیں سوغات کی امید
اہل وطن سمجھتے ہیں آئیں گے جا کے ہم
شاکر رہے نصیب پہ آتے گئے مرض
شاکر نہیں رہے کبھی قائل دوا کے ہم

۱۹

سر خوشی اور زندگی بردوش
سوچ کر بات کر ارے بے ہوش

کس بلا کا ہے شور نوشانوش
جس سے مرڈنگ بھی ہے دنگ خموش

نرم و نازک نہیں نوائے حیات
کیا سنے پھر بھی مرد پنبہ بگوش

شورشِ بحر کا جو اب ہوا
بڑھ گیا ناخدا کا جوش و خروش

خیر ناکامیاں سہی لیکن
نہیں اپنا یہ عشق ناحق کوش

کیسی بے لاگ ہے ضمیر کی بات
یہ بھی گویا ہے اک نوائے سروش

مٹ کے رہ جائے افتراقِ حیات
ہوں اگر حسن و عشق دوش بدوش

عشق کا ولولہ ہے یوں دل میں
جیسے ساغر میں بادۂ پرجوش

دل صد چاک لے کے پھرتا ہوں
اس طرح جیسے کوئی قاش فروش

شیخ جی رہ گئے دھرے کے دھرے
صحنِ مسجد سے اڑ گئے پاپوش

دیکھ ادھر بھی خیال کر ساقی
تیری محفل میں مجھ پہ طعنۂ ہوش

یہ زمانہ ہے جھوم اٹھنے کا
اب گھٹائیں ہیں میکدہ بردوش

لے اڑی زندگی مجھے تھا کر
اے زہے کیف بادۂ سرجوش

(۲۰)

ذرا اب کام لے اے قیس اپنے جذب کامل سے
مچل کر خود بخود لیلیٰ نکل آئے گی محمل سے

یہاں مجبور ہو کر آئے تھے ہم جذبۂ دل سے
چلے ہیں لیجئے مایوس ہو کر رنگ محفل سے

مکمل اس سے ہوتی ہے نگاہ امتیاز اپنی
مجھے دل بستگی سی ہو گئی ہے نقش باطل سے

مری کشتی کو اس بحر فنا میں غرق ہونا ہے
اگر گرداب سے نکلی تو ٹکرائے گی ساحل سے

کسی کو ساتھ لینا اور وہ بھی راہِ الفت میں
الجھ پڑتا ہوں میں ہر ہر قدم پر خضر منزل سے

کریں گے وہ جفا دل کے سراپا درد ہونے تک
ترس آ جائے گا آخر مآل عشق کامل سے

بٹھا دے گا تجھے ان دست و پا کو توڑ کر ظالم
جو نکلے گا کوئی نالہ مرے بیٹھے ہوئے دل سے

کنارے پر کہیں طوفان ہستی ہی لگا دے گا
انھیں موجوں میں کشتی کھیلتی نکلی ہے ساحل سے

ہمارا کارواں بانگ جرس میں گم ہوا جا کر
چلا شور سلاسل میں ملا شور سلاسل سے

برا کیا ہے رہے یہ ربط اگر سعیٔ لاحاصل
سمجھتا ہوں کہ ہے برق فنا کو ربط حاصل سے

بتاتے ہیں کہ تشا کر وہ سماں آنکھوں میں پھرتا ہے
لرزتی ہے نظر قاتل کی اب تک رقص بسمل سے

○

نکلی یہ شکل عرضِ تمنا برائے دل
نالے نکل نکل کے بنے ہیں نوائے دل

تدبیر ہے یہ پختگیِ مشق خام کی
آہوں سے ہم نکال رہے ہیں ہوائے دل

ہے اس کے اضطراب کا باعث ازل سے کیا
ہم آج تک سمجھ نہ سکے مدعائے دل

ہر روز روزِ حشر ہے ہر شب شبِ بلا
کب تک تمہارے ہجر کے صدمے اٹھائے دل

اے صبرِ عشق آج تغافل کا رنگ دیکھ
منظورِ حسن ہو گئی آخر وفائے دل

بس بس یہ خارزارِ تمنا نکالئے
پتھر اب ایک سینے میں رکھئے بجائے دل

گھر ہو گیا ہے حسرت و ارمان و یاس کا
ڈالی گئی تھی ان کے لئے کیا بنائے دل

آخر بیان درد ہوا دردِ سر مجھے
آ آ کے پوچھتا ہے ہر اک ماجرائے دل

اے وائے عمر رفتہ و ناکامیِ وجود
لے ہائے ہائے جان حزیں ہائے ہائے دل

اے ضبطِ غم اجازتِ اظہارِ درد کچھ
کب تک جگر کا خون پئے چوٹ کھائے دل

صد شکر احتیاجِ مداوا نہیں ہمیں!
شاکرؔ ہے دردِ عشق ہی اپنا دوائے دل

کس سے ہو گی برابری میری — ہے فرشتوں پہ برتری میری
زہد و تقویٰ شعار زاہد کا — رند مشرب قلندری میری
لے ملاتی ہے نغمۂ دل سے — بجتی جاتی ہے بانسری میری
ہے میسر کمال استغنا — ہے فقیری میں سروری میری
وہ مرے حال زار سے خوش ہیں — اب اسی میں ہے بہتری میری
ہے جہاں گیر شانِ ترک طلب — آئینہ ہے سکندری میری
خاکساری ہے اصل لعل و گہر — قدر کرتے ہیں جوہری میری
دیکھ گہری نگاہ سے مجھ کو — کیا حقیقت ہے سرسری میری

بات ایمان کی کہوں شاکر
عین ایمان ہے کافری میری

ز خود رفتہ حسنِ نیرنگ ہوں میں — ہجوم صد انوار سے دنگ ہوں میں
میری ہمنوائی کا طالب ہے عالم — عجب ساز ہستی کا آہنگ ہوں میں
فنا دورِ ہستی کا اک مرحلہ تھی — ازل سے ابد تک بہر رنگ ہوں میں
بلندی و پستی مٹا دینے والا — ترازوئے ہستی کا پاسنگ ہوں میں
تماشا ہوں میں وحدت آرزو سے — وفورِ تمنا سے دل تنگ ہوں میں
ذرا زخمۂ عشق بیدار کر دے — ابھی تک نوا خفتۂ چنگ ہوں میں
کسی نے بھی میری حقیقت نہ جانی — پس منظر صورت و رنگ ہوں میں

مجھے ضرب پیہم ہے درکار شاکر
بہ رنگِ شرار دل سنگ ہوں میں

رباعیات

کیا چیز ہے جانتے ہو برقی قوت
اک لہر ہے منفی اور دیگر مثبت
منفی پہ بھی خط نسخ کھنچ جاتا ہے
اور آپ سے ہو جاتی ہے روشن وحدت

ظلمت کدۂ دہر کی رونق ہو جا
ہر مرتبۂ وجود میں برحق ہو جا
نسبت ہے عدم تو پھر لحاظ نہ کر
اسقاطِ اضافات سے مطلق ہو جا

ساحل پہ نہ بیٹھ یعنی دریا میں اتر
گرداب میں ڈوب غوطے کھا کھا کے ابھر
تو موج و حباب کے فریب نہ کھا
تیری ہو فقط دریگانہ پہ نظر

ہر رنگ کے قمقمے فروزاں دیکھے
دلچسپ و نظر فریب چراغاں دیکھے
اے منبع برق تو ہی لہراتا ہے
تیرے ہی کرشمے یہ نمایاں دیکھے

یکتا ہے وہ ہر روپ میں رنگ جاتا ہے
جیسا قابل ہے اس طرح وہ ڈھل جاتا ہے
پتھر جو ہو تو وہ بھی ہو جاتا ہے سخت
تم موم بنو تو وہ پگھل جاتا ہے

آگاہ بشر ہو اپنی اصلیت سے
ہو جائے بلند پستیِ خلقت سے
اک جرم تو کیا ہزار جرم بھی
آدمیت بھلی ہے انسانیت سے

عبداللہ ذوقی

ڈاکٹر محمد عبداللہ ذوقی فرزند محمد عبدالحفیظ 1899ء میں بمقام بنگلور پیدا ہوئے۔ حیدرآباد بمبئی میڈیکل کالج سے فن طب کے امتحانات میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ 1935ء سے شاعری کر رہے ہیں پہلے علامہ محوی صدیقی لکھنوی سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے رہے اور بعد میں حضرت ابرار حسنی گنوری کے حلقہ سے وابستہ ہو گئے۔ آپ نے غزل، قطعات اور نظمیں بھی کہی ہیں ڈاکٹری پیشہ ہونے کے باوجود آپ نے اپنے ذوق کے پیش نظر شعر گوئی سے گریز اختیار نہیں کیا۔ تقریباً 90 سال کی عمر ہونے کے باوجود فکر سخن آج بھی جاری ہے۔ آپ کو قہقہوں کا سمندر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ زندگی مسکراہٹ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ سیدھے سادھے شعر کہتے ہیں۔ الجھاؤ، تصنع اور بناوٹ کے بغیر اس باغ و بہار اور روشن دل شخصیت کو اردو غزل نے ہمیشہ اپنی باہوں میں پناہ دی ہے۔

○

کس زباں سے شکر تیرا اے مرے صیاد ہو
ہے وہ بدقسمت جو تیری قید سے آزاد ہو

دل سے ذوقی کی دعائیں ہیں کہ یہ بزم خیال
یا خدا سرسبز ہو، شاداب ہو، آباد ہو

○

ہیں بے نیاز شہر خموشاں کے ساکناں
یعنی کسی کو کچھ بھی کسی کی خبر نہیں
لے دوست مرے ضبط محبت کی داد دے
دل میں ہیں لاکھ زخم مگر آنکھ تر نہیں

ہجوم رنج سے خود درد بن گیا ہوں میں
فغاں کے روپ میں بکھری ہوئی صدا ہوں میں
لحد نہ تنگ ہو مجھ پر کہ گود میں تیری
غم زمانہ سے گھبرا کے آ گیا ہوں میں

○

ذوقی خیال موت سے گھبراؤں کس لیے
کنج لحد ہی جائے سکون و قرار ہے

وہاں نصیب مجھے لے کے آ گیا ذوقی
ہر آئنہ کو جہاں خاک میں ملانا ہے

ابوالبرکات انور

مولانا ابوالبرکات انور فرزند مولانا حافظ قاری سید شمس الدین حق اصمعی (فارسی اور عربی کے بہت اچھے شاعر گذرے تھے) 28 فروری 1900ء/12 شوال 1319ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مدراس کے جید عالم عربی اور فارسی کے مستند استاد ہونے کے علاوہ اپنے زمانے کے عربی کے اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب تھے۔ آپ نے فارسی اور اردو مولانا قدرت حلیم سے پڑھی اور عربی خود اپنے ابا حضور سے سیکھی۔ آپ مدراس کارپوریشن میں معلم دینیات رہے اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ آپ کا تعلق بھی اسی کارواں سے ہے جس نے تامل ناڈو میں اردو ادب کی لاج کو ہمیشہ قائم رکھا۔ آپ کو عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں اچھا خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ اگرچہ کہ آپ کی اردو شاعری کا اصول روایاتی تھا لیکن ابلاغ خیال کے سلسلے میں آپ کے یہاں خاصہ تنوع پایا جاتا تھا۔ آپ کو فن تاریخ گوئی میں بھی بھرپور کمال حاصل تھا۔ زندگی بھر قومی، مذہبی اور ادبی خدمات کا جذبہ آپ کے رگ وریشہ میں ہمیشہ خون بن کر دوڑتا رہا۔ آپ نے تامل ناڈو میں بڑے بڑے کل ہند مشاعروں کا اہتمام کیا تھا۔ خصوصاً مسجد والاجاہی میں ہر سال میلاد النبی کے اجلاس کا انعقاد آپ کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ 23 دسمبر 1976ء 1397ھ بروز چہارشنبہ آپ نے وفات پائی۔

مشرک نما لباس ہے گاندھی کلاہ بھی — پھر دیر کیا ہے قشقہ و زنار کے لئے
تنہائی مرد کو تو بلائے عظیم ہے — کچھ فکر جلد کیجئے سمنار کے لئے
یہ شیروانی پھینک دے جبہ اتار دے — اعمال تیرے عیب ہیں دستار کے لئے
دیرینہ زخم کے لئے نشتر ہی چاہئے — ہو تازہ آبلہ خلش خار کے لئے
گاہک ہزار ہیں یہ نئی جنس ہے کہاں — کنسائنمنٹ تازہ ہو بیوپار کے لئے

نگاہ شوق کبھی ان کے روبرو نہ گئی — بھلا ہوا مرے اشکوں کی آبرو نہ گئی
نمی جاں گداز جو پیاسوں کی تشنگی انور — قدم کو چومنے کیوں موج آبجو نہ گئی

غلام محی الدین اثر

لسان الحکمت نواب غلام محی الدین آثر فرزند شاطر مدراسی مدراس میں پیدا ہوئے آپ ایک ایسے نغز گو شاعر تھے جن کی زبان بڑی لطیف، خیالات بلند، نگاہ گہری تھی۔ بڑی لاابالی طبیعت رکھتے تھے۔ بڑی سے بڑی شخصیت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ طبیعت میں بلا کی خودداری تھی۔ نہایت قابل مشاق اور نکتہ رس تھے۔ اس دور میں جبکہ اقبال کے آہنگ نے جدید نسل کو متاثر کیا تھا۔ غلام محی الدین اثر نے بڑی فکر انگیز نظمیں کہیں۔ آپ کے پڑھنے کا انداز بھی اتنا دامن کشِ دل ہوتا تھا کہ شاعرے پر نشہ چھا جاتا تھا۔ قادر الکلام ایسے کہ تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ زبان کی لطافت کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی، تخیل کا حسن آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ محمڈن کالج مدراس میں لکچرر تھے پھر کسی ناموافق واقعہ کے تحت ملازمت کو خیر باد کہا۔ Education Officer کے عہدے پر بھی کچھ دن فائز رہے لیکن طبیعت کی بے نیازی نے اسے بھی ٹھکرا دیا۔ آپ کا جمالیاتی ذوق اتنا اونچا تھا کہ ایک مجسم غزل کی زلف گرہ گیر کا شکار ہوئے آخر وطن سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچ گئے۔

دھان پان سے اس شاعر کے اندر وہ حوصلہ مند دل تھا جو حوصلہ کش حالات کا بڑی استقامت اور دلیری کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔ اثر نے وقت کے بدلتے ہوئے تیور سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے ہمیشہ مصائب سے دوچار ہونا پڑا لیکن ہر حادثے کا خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ جنوبی ہند میں خصوصاً نظم کا ماحول پیدا کرنے میں اثر کی جد و جہد، لگن اور گہری دلچسپی کا بہت بڑا حصہ ہے اثر نے تامل ناڈو میں اردو شاعری کو ایک ایسا موڑ دیا کہ جس کے بعد لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

"آرزو"

نگاہ ابھی مری مستِ مئے جوانی تھی
ابھی گناہ کی دلدادہ زندگانی تھی
جمالِ صورت و معنی میں امتیاز نہ تھا
نیاز مندِ حقیقت مرا مجاز نہ تھا
مآلِ عشرتِ فانی سے بے خبر تھا میں
جہانِ حسن میں منت کشِ نظر تھا میں
ادائے مست بھی، ساقی بھی، مئے بھی میرے تھے
سرور و نغمہ بھی، مطرب بھی، نے بھی میرے تھے
دیا نہ تھا ابھی درسِ جنوں مرے دل نے
کیا نہ تھا ابھی آوارہ ذوقِ محمل نے
نیاز میرا ابھی آشنائے ناز نہ تھا
دلِ شگفتہ میں سربستہ کوئی راز نہ تھا
سوادِ دہر ریاضِ ارم تھا میرے لئے
تمام عیش کا ساماں بہم تھا میرے لئے
اک آرزو ہوئی پیدا بدل گئی دنیا
اٹھا شرارہ وہ دل سے کہ جل گئی دنیا

1946ء (مطبوعہ)

دنیا ہے طریق اپنا بدلنے والی — دولت کفِ افسوس ہے ملنے والی
تقدیر کی ضربیں! اعیاذاً باللہ! — تدبیر ہے خاک و خوں میں ڈھلنے والی

کلیاں چٹکیں، کھلے فلک کے در و بام — بادل چھایا ابھی کھل بھی گیا سرِ شام
ہر شئے کو کشود ہے میسر لیکن! — اک عقدہ مرا ہے جس پہ کھلنا ہے حرام

ہے عشق کے دم سے بزم ہستی روشن　　برہم ہے اس سے زندگانی کا چمن
پوشیدہ رہے تو روح عالم ہے یہ　　ظاہر ہو تو سنگ و تیشہ و دار و رسن

کاغذ پہ اتر سکے وہ تصویر نہیں　　تحریر میں آسکے وہ تفسیر نہیں
ایسے دیکھے ہیں میں نے الجھے ہوئے خواب　　واللہ جو منت کشِ تعبیر نہیں

یادِ طفلی غمِ جوانی کب تک　　یہ جسم یہ جان یہ زندگانی کب تک
جس نقش کو اک روز مٹنا ہے آخر　　اس نقش کی پھر یہ پاسبانی کب تک

مطبوعہ 1948ء

گلابؔ مدراسی

سیّد احمد گلابؔ مدراسی بمقام ویلور (شمالی آرکاٹ) 1906ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ویلور میں حاصل کی اور نہ جانے کب مدراس آئے۔ آپ بھی مدراس کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ غزل اور تاریخ گوئی میں اچھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ قدیم اسلوب کے مداح تھے۔ تغیرات اور انقلابات کے باوجود آپ کے ذوق شعری نے کوئی نئی کروٹ نہیں لی۔ غزل اچھے خاصے ترنم سے پڑھ لیتے تھے۔

آپ ایک مزدور پیشہ تھے جو بیڑی کی صنعت میں مزدور رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ بیڑی سازوں کے معاشی حالات سُدھارنے کے لیے اور اُن کو حقوق دلانے کے لیے بڑی طویل انتھک لیکن زیادہ تر ناکام جدوجہد کی۔ جب بیڑی سازوں کو اُن کے حقوق نہیں دلوا سکے تو اُن کی ایک (Cooperative) سوسائٹی بناکر تادمِ مرگ اس کی اعزازی خدمت کرتے رہے۔ نوجوانی اور جوانی میں اردو ڈراموں سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ کچھ ڈرامے لکھے بھی اور ڈراموں میں اداکاری بھی کی۔ چونکہ جوانی میں بڑے حسین وجمیل تھے اس زمانے کی روایت کے مطابق جب کہ لڑکیاں اسٹیج پر نہیں تھیں انہیں ہیروین کا رُول دیا جاتا تھا۔

آپ نے آواز بھی بڑی غضب کی پائی تھی۔ ڈراموں میں خود گاتے تھے۔ فنِ موسیقی کا بھی کافی علم رکھتے تھے۔ چھند بازی اور بیت بازی میں حصّہ لیا کرتے تھے۔ ان کی بیڑی سازوں کی (Coopreative Society) کا دفتر ہمیشہ مدراس کے شعراء وادباء کی ملاقات گاہ بنا رہتا تھا۔ وہ غربت کے باوجود حتی الامکان شعراء وادباء کی خاطر داری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ شعراء کے علاوہ سنگیت کار قوال اور گائیک جو باہر سے مدراس آتے تھے اُن کے ہاں ضرور چند دن قیام کرتے تھے۔ آپ بہت کم سخن لیے دیئے رہنے والے اور مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔

جانے وہ کیوں تُلا ہے میرے امتحان پر — بنتی ہے اُس کی جان پہ یا میری جان پر
کیا اُس کے ساتھ اہلِ زمیں منہ لگائیں گے — اُس کا تو آج کل ہے دماغ آسمان پر
رنگ آیا بو ہی آئی نہ اب تک گلاب میں — کیسی چلی ہے بادِ خزاں گلستان پر

گر نہ ابرِ کرم ترا برسے — سر نہ اٹھے میرا ترے در سے
اے فلک جیسے میں ترستا ہوں — ویسے تو بھی خدا کرے ترسے
ہم اسی گھر گلاب جاتے ہیں — آبرو کھو کے آئے جس گھر سے

قاسم ویلوری

مولانا الحاج قاری حافظ حضرت سید محمد قاسمؔ ویلور (شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے۔ برسوں ویلور مسلم ہائی اسکول میں منشی تھے اور بعد میں اُورس کالج، ویلور میں اردو لکچرر ہوئے۔ اردو غزل کو زندگی بھر سینے سے لگائے رکھا۔ "جلوۂ سخن" اور "جلوئے یار" میرٹھ میں کلام شائع ہوچکا ہے۔ شاعر ہونے کے علاوہ آپ اچھے مقرر تھے مدرسۂ لطیفیہ میں ہمیشہ جمع کی نمازیں پڑھاتے تھے۔ تقریباً "اسّی 80 سال کی عمر میں اپریل 1940ء میں انتقال ہوا۔ آپ کی وفات پر مولانا کمالؔ ویلوری نے تعزیتی کلمات لکھے ہیں جو ماہنامہ "مصحف" (مئی 1940ء میں شائع ہوئے اس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

○

شہر کی مسموم ہے بارے فضا تیرے بغیر — گلستانِ علم ہے اجڑا ہوا تیرے بغیر
خطۂ ویلور ہے ماتم سرا تیرے بغیر — رنگِ گلزارِ جہاں ہے بدنما تیرے بغیر
بزمِ اردو کو شرف تیری صدا سے رہا — صدر بزمِ شاعری! اب کیا رہا تیرے بغیر

○

خرامِ ناز کے فتنے ہزاروں دیکھے ہیں — نہ ہوگا فتنۂ محشر سے اجتناب مجھے
طبیعت شرابِ کہن کی طرح — بڑھاپے میں قاسمؔ جواں ہوگئی

کمالی ویلوری

مولانا عبدالسلام کمالی ویلوری مولانا خطیب شاہ عبدالرزاق صاحب خلیفۂ قطبِ ویلور کے مکانِ مبارک میں 1906ء میں پیدا ہوئے۔ اردو، عربی اور فارسی کے ساتھ مولوی عالم کی تعلیم 1926ء تک باقیات الصالحات عربی کالج سے حاصل کی۔ اس سند کے حاصل کرنے کے بعد تقریباً دس سال تجارت میں مشغول رہے۔ پھر 1936ء میں مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ 1937ء میں مشن ہائی اسکول ویلور میں اردو کے مدرّس مقرّر ہوئے۔ اور مولانا تقریباً پچیس سال تک اسی اسکول سے منسلک رہے پھر وہاں سے وظیفہ یاب ہونے بعد باقیات الصالحات میں بحیثیت اردو اور فارسی استاد کام کرتے رہے۔ 1971ء میں آپ بنگلور گیے اور وہاں کے عربی کالج سبیل الرشاد میں صدرِ شعبۂ اردو وَ فارسی رہے۔ آپ میں طالب علمی کے دور ہی سے شاعری کا شوق تھا۔

حضرت ضیاءالدین امانی پلگنڈوی سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کی صدارت میں فی البدیہ مشاعروں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ ان مشاعروں میں مولانا شاکر نائطی، حضرت نورؔ مدراسی، حضرت الفتؔ مدراسی، حضرت مغمومؔ مدراسی بھی برابر شریک ہوتے تھے۔

حضرت کمالیؔ ویلوری نے بھی صنفِ غزل کو نئی قدروں سے روشناس کیا ہے۔ آپ کا کلام پڑھنے کا انداز بھی بڑا دلچسپ اور نرالا ہوتا ہے۔ مولانا نے نظم کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ مولانا کمالیؔ ویلوری فن کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف ہیں اس لیے غزل میں دلی جذبات کے اظہار میں دیانت داری، خلوص اور انہماک سے کام لیتے ہیں۔ زبان وبیان پر بھرپور دست گاہ حاصل ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اگر اس کے متعلق میں یہ کہوں تو جانب داری نہیں ہوگی۔

مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔

بے مائیگی ہمت عالی نہیں گئی — پستی میں بھی بلند خیالی نہیں گئی
صیاد کی نظر میں ہم آزاد ہوگئے — کس کو بتائیں بے پر و بالی نہیں گئی
شیدائے حسنِ گلشنِ ہستی لٹا گئے — اُن کی طرف سے پھول کی ڈالی نہیں گئی
ہم نے سرِ نیاز جو قدموں پہ رکھدیا — شمشیرِ ناز اُن سے سنبھالی نہیں گئی
ہم سرزنش سے تھے جو پشیماں وہ ہنس پڑے — آیا جلال، شانِ جمالی نہیں گئی

گلشن میں بھی صبا کی طرح بے قرار ہے
آوارگی یہ تیری کمالی نہیں گئی

گزرا زمانہ ایسا کہ دل پر نشوں پہ نشے غفلت کے چھائے — بام تصور پر رینگتے ہیں لیکن ابھی تک ماضی کے سائے
مرغِ تخیل پرواز سے ہے عاجز زیادہ اس تیرگی میں — فکر حسیں کے عالم پہ یادِ عہد گذشتہ نے ظلم ڈھائے
مثلِ غبار اک افتاں وخیزاں دوش صبا پر کوئی درخشاں — بیچارہ کوئی تھامے گریباں محوِ خرام اک دامن بچائے
صوت وصدا کے فتنوں سے بچ کر نقش ونگار دیوار ہوجا — خاموش لہجوں میں ہیں ہزاروں دلکش اشارے رنگیں کنائے
نازک طبیعت بیمارِ غم کی جو برگِ گل سے بھی ہے زیادہ — جنبش قلم کی اک دردِ سر ہے فکر سخن کی کیا تاب لائے

علم و ہنر کا ہے زعم جس کو آئے کمالی وہ معرکوں میں
فکر و نظر کی میزاں میں تل کر تیغِ سخن کے جوہر دکھائے

نثار نگری

حضرت نثار علی نثار نگری بمقام نگرم "آندھرا پردیش" 1908ء میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1943ء میں مدراس یونیورسٹی سے ادیب فاضل پاس کیا اور نگرم ہی کے ہائی اسکول میں اردو منشی کی حیثیت سے ملازم ہوئے 1954ء میں کلکتہ گیے اور کلکتہ میں قیام کے دوران "خادم" اور "کلکتہ" ویکلی سے منسلک رہے۔ 1955ء میں بمبئی آئے اور یہاں چار سال تک فلمی دنیا سے ناتا جوڑے رہے اور بمبئی میں جب ذہنی آسودگی نصیب نہ ہوئی تو دو بارہ اپنے وطن پہنچے۔ پتہ نہیں کن حالات کے پیشِ نظر 1959ء میں مدراس چلے آئے اور یہیں مستقل طور

پر سکونت اختیار کی۔ یہاں آنے کے بعد 1965ء میں ماہنامہ " امام" اور 1968ء میں " آب و تاب" کا اجراء کیا۔ 9 / فروری 1977ء بروز چہار شنبہ در روز اربعین امام حسینؑ صبح 6½ بجے مسجد جگدیو میں انتقال فرمایا۔ اسی شب بارگاہ ابوالفضل العباس کے احاطے میں آستانۂ حضرت عباسؑ کے قریب تدفین عمل میں آئی۔

آپ طبیعت کی مسلسل ناسازی کے باوجود " آب وتاب " کی زندگی، اشاعت اور فروغ کے لیے بڑی محنت کرتے رہے۔ لیکن یہ ماہنامہ بھی نامساعد حالات کا شکار ہوکر رہ گیا۔ آپ نے " آب وتاب " کے ذریعے جو ادبی نقوش چھوڑے ہیں اُن پر گردشِ ایام کی گرد کبھی نہیں جمے گی۔ اردو ادب کا مؤرخ آپ کی خدمات، شخصیت اور فن کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ خوش فکر شاعر ہونے کے علاوہ آپ ایک مخلص انسان بھی تھے۔ آپ کا حسنِ سلوک ہمیشہ سب کو متاثر کرتا رہا۔ غزل کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی۔ آپ کی تخلیقات میں جذبات کا تقدس پایا جاتا ہے۔ کچھ دن بمبئی میں بھی رہے لیکن سرزمین مدراس سے آپ کا ذہنی، ادبی اور معاشرتی تعلق ہمیشہ پائیدار رہا۔ آپ کا مجموعہ کلام " آئینۂ فرات " سلام اور نوحے پر مشتمل ہے۔

درد کو دل میں بسانا آگیا ۔۔۔ آنسوؤں کو مسکرانا آگیا
انقلابِ دہر! تیرا شکریہ ۔۔۔ ہم کو قسمت آزمانا آگیا
پھر فضا ، تاریک ہی ہونے لگی ۔۔۔ یاد پھر بھولا فسانا آگیا
طاقتِ پرواز ہی جاتی رہی ۔۔۔ جب رہائی کا زمانا آگیا

رازِ دل کا اب خدا حافظ نثار
حسرتوں کو گنگنانا آگیا

مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد

مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد فرزندِ مولانا قدرت حلیم فاروقی 24 / ستمبر

1908ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ مولانا قدرت علیم د المتوفی 1314
اپنے دور کے جید عالموں میں سے ایک تھے۔ ان کی کئی تصانیف نصف صدی پہلے تک بھی جنوبی ہند میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ان میں "ریاض الشہدا" اور "جواہر السید" (جو 1314 میں طبع ہوئی تھیں) بہت مشہور ہیں۔ مولانا قدرت علیم مدرسۂ محمدی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے اور جنوب میں ان سے فیضیاب ہونے والوں کی کافی تعداد رہی ہے۔ مولانا فاروقی کی ابتدائی تعلیم خود اپنے والد کی سرپرستی میں ہوئی اس کے بعد مولانا مفتی محمد صاحب اور شمس العلماء قاضی عبیداللہ صاحب سے بھی علومِ مشرقیہ کی تعلیم حاصل کی۔ 1927ء میں ایس۔ایس۔ایل۔سی اور افضل العلماء کے امتحانات میں آپ نے کامیابی حاصل کی۔ چند سال تک مدرسۂ جمالیہ میں اُستاد کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد محمڈن کالج مدراس میں عربی، فارسی اور تاریخ اسلام کے لکچرر کے عہدے پر مامور ہوئے۔

مولانا رحیم احمد فاروقی کو علم و ادب کا بیکراں سمندر، معلومات کا مخزن، شعر و فن کا گنج گراں مایہ جو کچھ بھی کہیں موزوں ہے۔ آپ کے تبحّر علمی کا اعتراف اکابرینِ ادب نے کیا ہے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر ایسی دسترس حاصل تھی گویا یہ ان کی مادری زبانیں تھیں۔ بے تکلف بولتے تھے تصنّع کا شائبہ دور دور تک نہیں تھا۔ پست قد ہونے کے باوجود قدآور شخصیتوں کی صفِ اوّل میں جگہ پائی۔ علم و ادب کے پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی اس انداز سے کرتے تھے کہ سائل مطمئن ہو جاتا تھا۔ تفہیم کا آپ نے جو انوکھا انداز اختیار کیا وہ آپ کی ذہنی پختگی، وسیع معلومات، تحقیق و تنقید کا غماز تھا۔ بڑی سے بڑی شخصیت آپ کے آگے سرنگوں ہو جاتی تھی۔ بہت کم خوش نصیب ایسے ہیں جنہیں آپ کے آگے کھل کر گفتگو کرنے کا موقع ملا ہو۔ آپ کی جچی تُلی رائے اس قدر صائب اور مسلّم تھی کہ جس سے انحراف مشکل سے ہوتا تھا۔ بہت کم گو تھے لیکن جب کسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا

کہ آپ کی زبان سے جگمگاتے موتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ بقدرِ ظرف ہر ایک نے آپ سے استفادہ کیا۔ تاریخ، ادب، فلسفہ، منطق، معاشیات، سیاست، مذہب کوئی موضوع ایسا نہیں تھا کہ جس پر سیر حاصل بحث کرنے کی استعداد آپ میں نہ تھی آپ کی گفتگو سے کبھی کبھی اکابرینِ علم دفن بھی حیران ہو جاتے تھے۔ ہر شخص آپ سے ملنے کے بعد ایسا متاثر نظر آتا تھا کہ جس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ مدراس ہی میں پیدا ہوئے اسی ماحول میں پرورش پائی۔ یہیں ذہن و فکر کی نشو و نما ہوئی لیکن زندگی بھر غلط زبان استعمال نہیں کی اور لہجہ بالکل اہلِ زبان کا سا تھا۔ ہمیشہ ایک عجیب استغراق کا عالم طاری رہتا تھا۔ تحقیق کی لگن نے آپ کے آگے نئی نئی راہیں کھول دیں۔ اتنے بڑے عالمگیر شاعر و ادیب اور قلم کار ہونے کے باوجود جس میں بھی جوہر پایا۔ اس کی حوصلہ افزائی میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ آپ کی رائے سند کی حیثیت رکھتی تھی ایک زمانے تک گورنمنٹ آرٹس کالج میں پروفیسر رہے۔

مولانا نے تامل ناڈو کے چند شعراء کی غزلوں کے ایک انتخاب "رنگ برنگ" میں "نقشِ اوّل" کے زیرعنوان تحریر فرمایا تھا کہ "یہاں بھی صحافت اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ لیکن جنگِ عظیم کے بعد یہاں علمی اور ادبی زندگی دم توڑنے لگی .... مشاعروں کی گرم بازاری رات دن رہی اور اب بھی ہے۔ لیکن صرف مشاعروں تک ہی ہمارے صوبے کا ادبی مذاق قائم رہا اور تصنیف و تالیف کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ صوبۂ مدراس کے اکثر فن کاروں کو اردو زبان و ادب کے معماروں کی تاریخ میں ممتاز مقام مِل نہ سکا۔"

افسوس کی بات یہ ہے کہ مولانا نے تغافل اور تساہل کے جس رویہ کا ذکر کیا ہے وہ خود بھی اسی کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے اپنی کوئی تصنیف یا تالیف نہیں چھوڑی حالانکہ عربی فارسی، اردو، انگریزی اور فرانسیسی ادب کے علاوہ عربی اور انگریزی زبانوں کے علمِ لسانیات، تصوف اسلامی تاریخ وغیرہ جیسے موضوعات میں ان کا ایک خاص طرزِ فکر اور ایک منفرد رائے رہی ہے اور اس کی اشاعت ان علوم میں

گراں قدر اضافے کا درجہ حاصل کرتی اور گنج ہائے گراں مایہ آج موجود ہوتے جن پر نہ صرف اردو زبان بلکہ ملک کی دوسری زبانیں بھی ناز کرتیں۔ مولانا سے فیض حاصل کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اور اُن میں بعض مشہور حضرات اپنے مقام کو بلند کرنے کے لیے خود کو مولانا کے خاص شاگردوں میں شمار کرتے ہیں۔ ان میں چند ایک چاہتے تو اپنے استاد اور مربی کی تصانیف کو منظرِ عام پر بہ آسانی لا سکتے تھے لیکن انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی بلکہ اپنی ہی الٹی سیدھی لایعنی اور بے سود تصانیف پیش کرتے رہے۔

غالب کی غزلوں پر آپ کی تضمین فکر انگیز ہونے کے ساتھ آپ کے مزاج اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ مولانا ابوالجلال ندوی[ؔ] مفسر قرآن نے آپ کے تعلق سے سچ کہا ہے کہ "مولانا آفتابِ علم وفن ہیں"، جس کی روشنی میرے ذہن کے نہاں خانے تک بھی پہنچی ہے۔

آپ نے 7/ اکتوبر 1966ء میں وفات پائی اور بروز جمعہ دستگیر صاحب (مخدوم ساوی) کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

مولانا کا شمار برصغیر کے مسلّم اکابرین میں ہوتا ہے وہ اردو، عربی، فارسی اور عبرانی زبانوں کے ماہر تھے۔ قدیم لسانیات ان کا خاص موضوع تھا۔ قرآنیات۔ خصوصًا قرآن مجید کے لسانی اور ادبی پہلوؤں کی تحقیق اور اس کی وساطت سے اس کی تفہیم کا اتنا بڑا عالم غالبًا ان کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی پیدا نہیں ہوا۔

ؔ مولانا ابوالجلال ندوی مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگردِ رشید تھے۔ 1927ء میں مدراس تشریف لائے اور اسی شہر کو اپنا وطن بنالیا۔ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ زندگی یہیں گذار دیں گے لیکن بیٹی داماد پاکستان میں تھے اور ان کے شدید اور مسلسل اصرار پر 1958ء میں مدراس سے پاکستان تشریف لے گیے اور وہیں ستمبر 1984ء میں انتقال فرمایا۔

مولانا ابوالجلال ندوی مدراس آئے تو یہاں کے مشہور اور ممتاز عربی مدرسہ جمالیہ کالج پڑمبور میں وائس پرنسپل مقرر ہوئے لیکن چند سال بعد سبکدوش ہوگئے مدراس میں اپنے طور پر علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔ (بقیہ فٹ نوٹ صٖ200 کی ابتدا میں ملاحظہ کیجئے)

بقیہ فٹ نوٹ۔
۔ مدراس میں مولانا کے تعلقات علاّمہ شاکر نائطی، مولانا سیّد عبدالوہاب بخاری اور مولانا رحیم احمد فاروقی سے بہت گہرے اور دوستانہ رہے۔ ڈاکٹر عبدالحق بھی مولانا کے مدّاح تھے لیکن غالبًا تعلقات کبھی دوستی کی شکل اختیار نہیں کر سکے۔

مولانا نے مدراس میں بیٹھ کر کئی تحقیقی مقالے لکھے جو برِّ صغیر کے مقتدر جریدوں کے علاوہ یورپ کے تحقیقی رسائل میں بھی شائع ہوا کرتے تھے۔

مدراس سے مولانا نے "سہیل" اور "ملّت" جرائد بھی شائع کیے مگر یہ رسائل زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکے۔

مولانا انتہائی خلیق لیکن بے حد خود دار شخصیت کے مالک تھے مدراس میں انہیں بے پناہ محبت کے سوا کچھ نہیں ملا۔ (اور وہ کسی اور شئے کے طالب بھی نہیں تھے) اور مولانا نے اس محبت کا جواب بھی اتنی ہی بے پناہ محبّت سے دیا۔ وہ مدراس کو برِّ صغیر ہی نہیں دنیا بھر کے نقشۂ علم و ادب میں ایک اہم اور بڑے شہر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔

مدراس سے وہ لازوال یادیں لے کر گیے اور جاتے جاتے یہاں کی نئی نسل کو اپنے اس شعر کے ذریعہ ایک پیغام بھی دے گیے۔

زمانے کے دھارے پہ بہنا غلط ہے
زمانے کے دھارے کو بہنا سکھاؤ

تضمین بر کلامِ مرزا اسد اللہ خاں غالب

پردۂ تصویر ہے یا دام ہے تزویر کا　　ڈھنگ ہیں تخریب کے اور رنگ ہے تعمیر کا
کھیل ہے تقدیر کا یا کاتبِ تقدیر کا　　نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

دشتِ وحشت میں جنوں کی سرد پائی نہ پوچھ　　نارسائی آہ کی اشکوں کی رسوائی نہ پوچھ
تیرگیٔ کلبۂ احزاں کی گہرائی نہ پوچھ　　کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

طبعِ نقاشِ ازل کا ذوق دیکھا چاہیے　　نقشۂ ہستی کا تحت و فوق دیکھا چاہیے
زیست نے پہنا ہے کیسا طوق دیکھا چاہیے　　جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

فکر اپنی تیز پروازی اگر چاہے دکھائے　　ذہن کو فہم و فراست کی نئی راہیں سجھائے
جدتِ طبعِ رسا ہر گام پر مشعل جلائے　　آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

یادِ ایامے کہ تھا یہ دہرِ سرکش زیرِ پا　　پرچم اس کا سرنگوں تھا اور ترکش زیرِ پا
ہم تھے آزاد اور تھا فرشِ مزرکش زیرِ پا　　بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

لکھنے چلے جو منظرِ خونیں کوئے یار　　فرہاد سوئے تیشہ و منصور سوئے دار
کہنے لگے یہ سروِ خرامانِ جوئے یار　　جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

صدق و صفا کی رہ میں ہیں یہ منزلِ نخست　　داغِ سیاہِ قلب کی ہو جائے رفت و شست
پڑنے لگے جو عزم و ارادہ کے ہاتھ سست　　آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

سود و زیاں ہوا کہ ہو داد و مجادلہ　　سب وہم اور گماں کا ہے جبر و مقابلہ
کیا نام اور پیام کہاں کا مراسلہ　　تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

بھولا نہیں ہے سرخیٔ خونِ شفق ہنوز　　روشن نہیں ہوئے ہیں یہ چودہ طبق ہنوز
جاری مری جبین سے ہے سیلِ عرق ہنوز　　لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

جاں وقفِ اضطراب، جگر رہنِ خستگی　　غمازِ حالِ دل تھی زباں کی فسردگی
چھپتی نہ تھی چھپائے سے چہرے کی تیرگی　　ڈھانکا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

ڈر اور موت سے، یہ ہے رسمِ کہن اسدؔ — آزادؔ اسے سمجھتے ہیں اپنا کفن اسدؔ
نازک تھا گرچہ رشتۂ روح و بدن اسدؔ — تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

○

بجلیاں خوش تھیں کہ اک ظلمت کدہ تھا جل گیا — اب اجالا ہی اجالا ہے اندھیرا جل گیا
کیا بتاتا ہیں کہ کس کا آشیانہ جل گیا — دل مگر سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
وہ جو رہ رہ کر ابھرتی تھی ہڑک باقی نہیں — کاوے دیتی تھی جو وحشت کو وہ جھک باقی نہیں
وحشت و در تھے جس کے طالب وہ سنک باقی نہیں — دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
سُن چکا ہے میرے اوصاف و شمائل بارہا — میری کشتی کی طرف دوڑا ہے ساحل بارہا
آسماں تو بھی ہوا ہے میرا قائل بارہا — میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
راست گوئی کے لیے ہے نامناسب یہ جہاں — یہ زمین کج سرشت اور یہ خمیدہ آسماں
میرے دل کے حوصلے کس طرح نکلیں گے یہاں — عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
سینہ رہتا تھا جو سوزِ آرزو سے داغدار — اب وہی خونِ تمنا بن گیا ہے لالہ زار
داغِ حسرت سے عیاں ہے منظرِ رقصِ شرار — دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
ایک لاینحل معمہ ہے جہانِ آب و گِل — موت ہے دنیا میں پابندِ حیاتِ متصل
ہے حیاتِ دنیوی آزادؔ لیکن جاں گسل — میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

○

کاکل کی طرح گو میں ترے سر نہ ہوا تھا
آزردۂ کوتاہی خنجر نہ ہوا تھا

دشمن کو مگر یہ بھی میسّر نہ ہوا تھا
تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

حاصل کبھی ہوتا نہیں کچھ طولِ امل سے
تقدیر بدلتی ہے فقط حُسنِ عمل سے
ظاہر ہے یہی بحر و بر و دشت و جبل سے
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

صحرا اگر امواجِ سرابی سے ہوا خشک
دل خون تھا یہ کس کی خرابی سے ہوا خشک
خم ذوقِ بلانوشِ شرابی سے ہوا خشک
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اجمال مقیّد ہو تو آزاد ہو تفصیل
اپنائی نہ تقدیر نے حکمت کی یہ تحلیل
منظور اسے اپنے نوشتے کی تھی تکمیل
جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مرے تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

○

ہم نے جب سے اپنا بھی کچھ اتا پتا پایا — ہر دن ایک مصیبت میں دل کو مبتلا پایا
تم نے اپنی شوخی کا اس میں مشغلہ پایا — کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں سے کیجئے گم ہم نے مدعا پایا

عشق کی حقیقت تک کس نے راستہ پایا — یوں تو نام سے اس کے سب کو آشنا پایا
مرگ و زیست دونوں نے اس میں آسرا پایا — عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

مل گئی جو ملنا تھی حسبِ منشاءِ مقسوم　　ساز و برگ سے عاری ایک ہستیٔ موہوم
اُٹھ سکے گا اب کس سے بارِ نصرتِ مظلوم　　دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

گل کھلاتی ہے کیا کیا زیرِ چرخ زر کاری　　حسن کی حیات افزا آرزوئے دلداری
عشق کے لیے ہے سب حسن کی اداکاری　　سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

پھر ہے انجمن آرا چرخ پر مہ کامل　　بن رہی ہیں پھر موجیں خندۂ لبِ ساحل
پھر صبا ہے گلشن کی بزمِ رقص میں شامل　　غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا!

دل گیا ہے جس دن سے زندگی ہے بے معنی　　جانِ اسیرِ بے زاری تن رہینِ بے چینی
غم سے چشم ہے پُرنم زخم سے جگر چھلنی　　حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

لگ گیا رقیبوں کو جب پتہ مری چڑھ کا　　چھیڑتے گیے چھتہ میرے واسطے بھڑ کا
چھوڑتا کہاں تھا پنڈ میں نے لاکھ اسے جھڑکا　　شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

○

گل بانگ اک ترانہ ہے مزمارِ ناز کا
پردہ ہے عندلیب، سرود و نیاز کا
ذرہ بھی ہے حجاب پرِ شاہ باز کا
محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

طوفاں جس سے ڈرتے ہیں یہ وہ کنارا ہے
بجھ کر جو جل رہا ہو یہی وہ شرارہ ہے
ظاہر میں گرچہ شامِ خزاں ہے خسارہ ہے
رنگِ شکستہ صبحِ بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

محشر بدوش ہے یہ تری چشم فتنہ خیز
اٹھی جدھر اٹھا ادھر آشوب رستخیز
قسمت کا فیصلہ ہے، یہ اس سے کہاں گریز
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
ہیں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

شاکی ہے جور یار کا، میرا جگر، نہ میں
یہ بار اٹھا سکے گی نہ میری کمر نہ میں
کرتی ہے راز فاش مری چشم تر، نہ میں
صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

تیزی سے ہیں جو نقشے جہاں کے بدل رہے
صورت جو آج ہے نہیں ممکن وہ کل رہے
رہنا ہے گر کسی کو یہاں سر کے بل رہے
ہیں بس کہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کچھ بھی نہ کر سکی مری فریاد سینہ سوز
اب بھی وہی ہے کجروئی چرخ کینہ توز
اب تک ملی نہ دولت فکر نظر فروز
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

آزاد اسیر گردشِ دوراں ہوا اسد
تخریب کائنات کا ساماں ہوا اسد
شیرازۂ حیات پریشاں ہوا اسد
تاراج کاوشِ غم ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

7

محیط راز ہستی ہے خیال کیف و کم میرا
وجود آباد مجھ سے، عرصۂ دشت عدم میرا
بساطِ بزمِ امکاں کیا در بزم قدم میرا
نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

دل وحشت زدہ دیوانہ ہے، سرکش ہے طاغی ہے
ہوا خواہوں میں تھا جس کے اسی سے آج باغی ہے
میں سمجھاتا ہوں اس کو پر یہی کہتا یہ داغی ہے
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

محبت جوہرِ ہستی محبت حسرتِ ہستی
محبت کا فسانہ نقشِ لوحِ تربتِ ہستی
وبالِ زندگی ہے یہ تضاد خلقتِ ہستی
سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

یہ مانا اک سمندر ہے تری ذاتِ گرامی بھی
بنا تیرا حریف، اپنا شعور ناتمامی بھی
اگرچہ ہے سرور افزا تری شیریں کلامی بھی
بقدر ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

یوں تو مدت سے مرے سینے میں دل بیتاب تھا
تارے انگارے تھے نظروں میں فلک دولاب تھا
شب کو لیکن میں نے جو دیکھا عجب ہی خواب تھا
شب کہ برق سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر ایک حلقۂ گرداب تھا

منتظر تھا دل قدومِ میہماں کا صبح و شام
چشم و مژگاں کی ضیافت کا تھا خاصا اہتمام
ہو گیا درہم دمِ آخر یہ سارا انتظام
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

طور تھا صبحِ ازل مقصودِ تزئینِ جمال
تھا محبت کے لیے نظارہ معراجِ کمال
دیدنی تھا ہم سیہ بختوں کی ناکامی کا حال
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

حسن کی قسمت ہے نور و نغمہ و جام و سبو
عشق کی تقدیر ہے آہ و فغاں و ہائے ہو
تھا عجب منظر یہ دونوں جب ہوئے تھے روبرو
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

شب کہ تھا مستغرقِ ظلمت جہانِ چارسو
کروٹیں لیتا تھا پہلو میں دلِ سیماب خو
سانپ بن کر ڈس رہی تھی یادِ زلفِ مشکبو
یاں سرِ پُر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

گو نجتی تھی شب کی خاموشی میں آوازِ حدی
گا رہا تھا ساربان ! من تو شدم تو من شدی
مست تھے گم گشتگانِ وادیِ فردا و دی
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

شور تھا گلشن میں غنچوں کے دہانِ تنگ کا
ساتھ دیتی تھی صدائے دف نوائے چنگ کا
تھا تماشائی زمانہ اپنے ہی نیرنگ کا
فرش سے تا عرش واں طوفان تھا موجِ رنگ کا
یاں زمین سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں وقتِ وداعِ یار یاد آنے لگا
دامنِ ہوش و خرد پھر ہاتھ سے جانے لگا
شدتِ غم سے سرِ شوریدہ چکرانے لگا
ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

شب، فشارِ غم سے چشمِ تر میں خونِ ناب تھا
ٹوٹنے کو تھے نفس کے تار، دل مضراب تھا
انقلاب آمادہ سارا عالمِ اسباب تھا
نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپند بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

کیوں سرِ شوریدہ میں سودائے خشت و سنگ ہے
شوقِ زخمِ دل کشا ہے عشق ابھی دل تنگ ہے
عشق کی نظروں میں امن و عیش عار و ننگ ہے
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

غمزہائے زیست کی ناز آفرینی کیا کہوں
لذتِ گوش وزبان وچشم وبینی کیا کہوں
کس قدر دل کش تھا فردوس زمینی کیا کہوں
نازشِ ایام خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقف بستر سنجاب تھا

مخزنِ اسرار فطرت ہے یہ ذروں کا جہاں
اس سے واقف ہو نہ سکتے تھے زمین وآسماں
چاک دامانی کی طالب تھیں یہ ساری گتھیاں
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشید عالم تاب تھا

میں نہیں کہتا کہ اب خواہش ہے ہیروں کی تجھے
تو غنی ہے کیا ضرورت ہے امیروں کی تجھے
اک زمانہ تھا کہ جب دھن تھی فقیروں کی تجھے
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا ہی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر ویران سا منظر وہ صبح و شام کا
لینے والا اک نہ تھا دنیا میں تیرے نام کا
فکر رہتا تھا تجھے دن رات اپنے کام کا
یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظار صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

قلزم ہستی میں طوفاں کا اُبھرنا دیکھتے
خشمگیں، پر شور موجوں کا بپھرنا دیکھتے
ایک بار آزاد بھی قسمت کا کرنا دیکھتے
میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

O

تھا خواب نقش زیست، مٹا مثل نقش آب
یہ تھا سراب ہستی، وہ تھا ہستی سراب
اس خواب میں بنا تھا جگر جان کا عذاب
ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خون جگر ودیعت مژگان یار تھا

بہتی تھی میرے دل میں جو ایک نہر آرزو
قطرہ اب ایک اس میں نہیں بہر آرزو
تیری نگاہ مہر میں تھا زہر آرزو
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

رہتا تھا زندگی میں جو بیزار گھر سے میں
جلوے سمیٹتا تھا ہر اک رہگذر کے میں
مرنے پہ بھی نصیبوں سے کہتا رہا یہ میں
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرا کریں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگذار تھا

یہ چرخ عنبریں کی ہے کیسی عجیب چال
باطل ہے زیست، حق ہے مگر زیست کا وبال
مظلوم کو اجل ہے وفا ظالموں کا جال
موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آبدار تھا

غم زندگی کا روز ہے غم زندگی کی شب
آغاز غم ہے درد! مگر انتہا ادب
غم سے نجات کس کو ملی؟ کس طرح سے؟ کب؟
کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو، پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

دل کے ہر داغ کا مشکل ہے چراغاں ہونا
ذروں کا سہل نہیں مہرِ درخشاں ہونا
ایسا آساں نہیں صحرا کا گلستاں ہونا
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کیسی دلکش ہے کہانی ترے دیوانے کی
دشت کی دھن بھی ہے الفت بھی ہے غم خانے کی
وحشتِ دل جو طلب گار ہے ویرانے کی
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وہ بھی دن تھے کہ فقط عشق کا تھا غم مجھکو
اب تو لگتا ہے وہ اک خواب کا عالم مجھکو
عمر بھر سوگ میں رکھے گا یہ ماتم مجھکو
وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھکو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوۂ حسن نظاروں سے نباہ کرتا ہے
لاکھ پردے ہوں، انہیں پل میں تباہ کرتا ہے
کونسا ایسا پھر آئینہ گناہ کرتا ہے
جلوہ ازبس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

دلِ ناشاد کا رنگیں فسانہ مت پوچھ
یہ لبِ زخم پہ کیسا ہے ترانہ مت پوچھ
کس طرح موت ہے جینے کا بہانہ مت پوچھ
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

بے وفا تو نے الٹ دی ہے وفاؤں کی بساط
مستقیم اب نہ رہی زیست کی کوئی بھی صراط
بجھ گیے دل میں جو روشن تھے امیدوں کے نقاط
لے گیے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو، اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

زندگی کیا ہے حوادث کا عجائب خانہ
اس کی تعمیر کا مقصود ہے اس کا ڈھانا
باعثِ راحت جاں ابر جنوں کا چھانا
عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر، غرق نمک داں ہونا

حسن والوں نے اگر کی بھی خطا سے توبہ
ہو کے نادم وہیں کہہ دینگے ادا سے توبہ
سامنے کی تھی مرے جس نے وفا سے توبہ
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

عشق ہے لذتِ ایجاد کی طینت غالب
روح آزاد کی ہے عشق سے زینت غالب
ثبت ہے دہر پہ گو عشق کی عظمت غالب
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

بے وفا کوئی وفا سے کبھی راضی نہ ہوا
اس کے کارن کوئی پتھر کبھی پانی نہ ہوا
کوہ و صحرا تو ہوا طور تجلی نہ ہوا
دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

جوششِ مئے سے تجھے کبھی نشۂ میکش نہ دبا
چند چھینٹوں سے کوئی شعلۂ آتش نہ دبا
تیر کے بوجھ سے اب تک کوئی ترکش نہ دبا
سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

آرزو تھی، غم جاں کاہ فنا سے چھوٹوں
جستجوئے خضر و آب بقا سے چھوٹوں
شاہد شوق کے آزار و جفا سے چھوٹوں
میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ذوق ذاتی نہ سہی امر مقدر ہی سہی
شوق ہے رہنِ سفر راہیں مقرر ہی سہی
آب کوثر نہ سہی، بادۂ احمر ہی سہی
دل گذر گاہ خیال مئے و ساغر نہ سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

دل نے پہلو میں دھڑکنا بھی نہ سیکھا تھا ابھی
درد و غم رنج و الم نے اسے تاکا تھا تبھی
میری افسردہ مزاجی سے ہیں آگاہ سبھی
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گل بانگ تسلی نہ ہوا

کون ہے جس سے بیاں اپنی حکایت کیجیے
جی میں آتا ہے خدائی سے بغاوت کیجیے
کیا دعا مانگیے اب کس کی سماجت کیجیے
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

زندگی اس میں کہاں یہ ہے اجل کا جالب
جب بناؤ تو بگڑ جاتا ہے اس کا قالب
کب تک آزاد رہے ایسے قفس کا طالب
مر گیا صدمہ یک جنبش لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

جام مئے شب ابروئے محبوبۂ طنازہ تھا
مئے کدہ شورش گہہ ہنگامہ ہائے تازہ تھا
شور ہائے و ہوئے کیا تھا حشر کا آوازہ تھا
شب، خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا

آخرش راز جنونِ بے سروساماں کھلا
جس کے آگے تھا ہمیشہ دیدۂ حیراں کھلا
رازِ خارستاں کھلا، سرِ بہارستاں کھلا
یک قدم وحشت سے، درس دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

حسن کیا ہے عشق کیا، دونوں میں اچھا کون ہے؟
عقل کیا کہتی ہے دل کیا؟ ان میں سچا کون ہے؟
اس معمے کا کرے حل، آج ایسا کون ہے؟
مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟
خانہ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

وہ بھی دن تھے، یہ دل ناشاد بھی تھا مجھ سے شاد
جمع بھی خاطر، پریشانی سے رہتا تھا عناد
کج روی پر جب اتر آیا یہ چرخِ بدنہاد
نالۂ دل نے دیئے اوراق لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیواں بے شیرازہ تھا

ساقی و مطرب دلِ مضطرب کو بہلائیں گے کیا
یہ طریقے چرخ کج رفتار کو بھائیں گے کیا
ہستیٔ مرگ آفریں کو راہ پر لائیں گے کیا
دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

دل کے لینے کے لیے اپنی دکھائی تھی جھلک
اب کہاں ہے وہ نظر، حیران ہے چشمِ فلک
ہم نے چھیڑا ذکرِ فرقت، آپ کی جھپکی پلک
بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

عشق سے بدتر نہیں زیرِ فلک کوئی گناہ
روزِ اوّل ہی سے لیکن دل کی ہے اس پر نگاہ
کچھ نہ سمجھا، گو میں سمجھاتا رہا شام و پگاہ
حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

شدتِ شوق شہادت پر جب اتر آتا ہوں میں
کوچۂ قاتل سے بے نیل و مرام آتا ہوں میں
گرچہ اب بھی اپنی بدبختی سے گھبراتا ہوں میں
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

بات قید و بند کی تھی جو کہ ناصح نے کہی
تھی مزاجِ عشق کے برعکس، آخر تک رہی
ہے جنون و عشق کی آپس میں سرگوشی یہی
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا، یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟
زندگی اک قید ہے اس سے نکل آئیں گے کیوں؟
موت سے پہلے، نجات اس قید سے پائیں گے کیوں
ہم قفس کے ہیں، قفس کو چھوڑ کر جائیں گے کیوں؟
خانہ زاد زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

○

جہاں کی ابتدا کیا؟ انتہا کیا
بنائے گردشِ ارض و سما کیا
اسی دھن میں مریں بھی تو برا کیا
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تمہیں معلوم ہے ہم نے کہا کیا؟
ہمیں معلوم ہے تم نے سنا کیا؟
یہ اوچھا پن ہے، اب اس میں رہا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟
ترے کوچے کا نقشہ دیکھتا ہوں
ترے گھر کا دریچہ دیکھتا ہوں

بتاؤں کس کو میں کیا دیکھتا ہوں
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

نمازی ہوں میں قبلہ چاہتا ہوں
میں ہوں سجادۂ کعبہ چاہتا ہوں
اس ابرو کا اشارہ چاہتا ہوں
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟

غضب ہے وہ فدائے بوالہوس ہے
وفادار اس کی نظروں میں کس ہے
گلستاں میں فروغِ خار و خس ہے
فروغ مسئلۂ خس ایک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟

مقدر میں جو لکھی بیکسی ہے
مرے ہمراہ میری بے بسی ہے
دلِ شیدا عدوئے آگہی ہے
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟

ہوائے کوچہ و برزن نہیں ہے
سرِ نظارۂ گلشن نہیں ہے
خیالِ سروِ سیمیں تن نہیں ہے
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟

کبھی بگڑا اگر ذہنی توازن
قوائے ذہن میں آیا تہاون

سمجھ پھر کر نہیں سکتی تعاون
سن اے غارت گر جنس وفا سن
شکستِ قیمت دل کی صدا کیا؟

انا الحق کا کچھ ایسا کم نہ تھا زہر
غریب شہر پر کیوں پھٹ پڑا شہر
یہ سب ہیں اعتباری ، نالہ و نہر
دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟

جگر داروں کا بھی ایک دل جگر دیکھ
تو اپنے تیر مژگاں کا اثر دیکھ
کہاں کی باز پرس ؟ اتنا نہ ڈر دیکھ
محابا کیا ہے ؟ میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خون بہا کیا؟

ہمارا ہے جو تیرے لب پہ شکوہ
یہی ہے بوالہوس کا من و سلویٰ
عجب کیا دل جو ٹوٹا ، ہو کے رسوا
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
شکیبِ خاطر عاشق بھلا کیا

ستمگر یہ ادائے دلربا کیوں
وفاداروں پہ یہ جور و جفا کیوں
یہ ظالم شیوۂ ناآشنا کیوں
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنہ طاقت ربا کیا؟

وہ جس کی دھن میں ہے آزاد دن رات
بیاں کیا کیجیے اس کے کرامات

نہیں جاں سوز صرف اس کے کنایات
بلائے جاں ہے، غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

قتل گہ میں سرِ دشمن جو خمیدہ نہ ہوا
تری شمشیر کا رخ جانب اعدا نہ ہوا
منتخب اور کوئی جز دل شیدا نہ ہوا
درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

کھل گیا آج تری بندہ نوازی کا بھرم
پھر کبھی ہم ترے کوچے میں نہ رکھیں گے قدم
ہم ہیں خوددار، مقابل ہیں خدا ہو کہ صنم
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ذرّہ ذرّہ میں ہے جلوہ تری رعنائی کا
قطرہ قطرہ میں ہے پرتو تری زیبائی کا
ادّعا کون کرے گا تری ہمتائی کا
سب کو مقبول ہے دعوی تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

دل بیتاب ہے بیماریٔ غم کا خواہاں
آرزو اس کی یہی ہے، یہی اس کا ارماں
غم نہیں، سلب بھی ہو جائے اگر تاب و تواں
کم نہیں نازشِ ہمتائیٔ چشمِ خوباں

ترا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

آسماں! تیرا نہیں یہ کوئی دستور نیا
جتنا پھیلا کوئی، کی تو نے بھی اتنی ہی دریا
جرم ہے تیری شریعت میں مگر شرم و حیا
سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

مل گیا روزِ ازل سب کو جو ملنا تھا صلہ
اپنی قسمت سے مجھے ہے کوئی شکوہ نہ گلہ
یوں تو بہتوں کو ملا لعل و گہر سیم و طلا
نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

عشق سے ہے سحرِ شیب میں بھی نورِ شباب
برق خنداں ہے اگر اس سے تو گریاں ہے سحاب
عشق ہے سوزشِ غم، عشق ہے پیہم تب و تاب
ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

دے سکی ہم کو دو رنگیٔ شب و روز نہ جل
ہم کو منظور نہیں تفرقۂ غنچہ و گل
ایک ہی بات کہی ہے حکما ہو کہ رسل
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

ان کو ضد تھی کہ اکھیڑیں جو گڑے تھے مردے
کوچۂ یار میں کشتوں کے لگے تھے پشتے
شہر میں پھرتے تھے آزاد عدو کے گرگے
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

کیا
کسی کو کیا بتائیں، ہم کہاں ہیں، کون ہیں ہیں
خدا کا شکر ہے، طالب نہیں، مطلوب اعلیٰ ہیں
ہوائے حرص سے آزاد ہیں گو خار صحرا ہیں
اسدؔ، ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

ندامت سے ہوا ہے سرنگوں زہد ریائی کا
نہ ہو اخلاص تو پھر فائدہ کیا جبہہ سائی کا
دکھایا اعتراف عجز نے رستہ رہائی کا
پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
سنا ہے ہم نے قصہ حسن کی ناآشنائی کا
تغافل کا تجاہل پیشگی کا خودستائی کا
دھرے الزام دنیا لاکھ، اسیر کج ادائی کا
یہ ہر ح[illegible]ن تماشا دوست رسوائے وفائی کا
یہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

گدائے بے نوا ہوں، تجھ سے ہے یہ میری استدعا
مرے افکار روشن ہوں، مرے اخلاق پاکیزہ
تجلی زار میرا دل ہو، مثل وادیٔ موسیٰ
زکوٰۃ حسن دے اے جلوہ بینش کہ مہر آسا
چراغ خانۂ درویش ہوں، کاسہ گدائی کا

مری زیرِ فلک جب ہو رہی تھی زندگی دوبھر
شکایت تجھ سے کی تھی میں نے اپنے حال کی اکثر
رہا کرتا تھا تیرے ہاتھ میں گو ان دنوں خنجر
نہ مارا جان کر بے جرم قاتل، تیری گردن پر
رہا مانندِ خون بے گنہ حق آشنائی کا

نہ ہاتھوں میں توانائی، نہ پاؤں میں روانی ہے
ہماری زندگانی بھی، غضب کی زندگانی ہے
بیاں کیا کیجیے اس کا، بڑی لمبی کہانی ہے
تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

مظاہر مختلف ہیں، نام الگ ظاہر وہی کل ہے
نوا ہے نے میں، نغمہ ساز میں، مینا میں قلقل ہے
وہی ہے پھول کی خوشبو، وہی فریاد بلبل ہے
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ ہے باعث مری رنگیں نوائی کا

بہت گھبرائے بت سن کر ترا دعوئے یکتائی
پرستاران کے جلآئے، خدائی ان کی بھنائی
ہوئے وہ طعنہ زن تجھ پر، کہ ہے تو بھی تو ہرجائی
دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

ذرا سی بات پر اتنے سیہ کرتا ہے کیوں صفحے
پرانے ہو چکے ہیں آج لفاظی کے سب حربے
پڑھے گا کون یہ طومار؟ بات آزاد کی سن لے
نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

نالۂ عندلیب

جا رہی ہے باغ سے بادِ بہاری ہائے ہائے
کام کچھ آئی نہ اپنی آہ و زاری ہائے ہائے

نکہتِ گل صحنِ گلشن صبحِ خندانِ بہار
کیسے یاروں سے چھٹی ہم کو جیسے یاری ہائے ہائے

مسکراتے دن گئے ہنستی ہوئی شامیں گئیں
اب اندھیری رات ہے اور اشکباری ہائے ہائے

خوں رلاتی رہتی ہے اہلِ نظر کو عمر بھر
دستِ بیدادِ خزاں کی ہنرہ کاری ہائے ہائے

حالتِ زار جوانانِ گلستاں، الاماں!
نازنینانِ چمن کی سوگواری ہائے ہائے

دل تو دل دم بھی نکل آتا ہے سینہ توڑ کر
پھرتی ہے آنکھوں میں جب تصویر تمہاری ہائے ہائے

ناخدا کی کوششیں تقدیر سے ٹکرا گئیں
ڈوب کر ابھری نہ کشتی پھر ہماری ہائے ہائے

مضطرب رکھتی ہے میرے دل کو آزاد آج کل
ایک مبہم سی خلش اک بے قراری ہائے ہائے

محمد عبدالعزیز عادل

حضرت عادل مدراس کے ایک تجارت پیشہ خوشحال گھرانے کے فرد ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم جناب میر امیر علی صاحب سے حاصل کی، قرأت قرآن مجید عبدالغفور صاحب مرحوم اور حیات میاں صاحب مرحوم سے سیکھی۔ فارسی اپنے چچا مولوی عبدالواحد مرحوم سے شروع کی اور آخر میں مولانا الحاج مرزا غلام عباس علی عباس کے آگے زانوئے ادب تہ کرکے اطمینان کا سانس لیا عربی کی تعلیم مولانا عبدالقدوس نعمانی سے حاصل کی۔

آپ کو بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق رہا۔ ابتدا میں اپنا کلام شیدا مدراسی کو دکھاتے رہے۔ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد ایس عبدالغفور مرحوم اور جناب عبدالغنی خان ہائل مرحوم سے اکتسابِ علم عروض کیا۔ پھر استادِ وقت حضرت سید شاہ محمد صبغت اللہ حسینی القادری چشتی نور مدراسی مرحوم سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے رہے نور صاحب کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد آپ کی شاعری میں خاص رنگ اور توانائی پیدا ہونے لگی تھی۔ فارسی اور اردو زبان پر کافی عبور حاصل ہے۔ منشی فاضل اور راشٹر بھاشا ہندی کے بھی سند یافتہ ہیں۔ پہلے سینٹ پالس ہائی اسکول مدراس میں، پھر مسلم ہائی اسکول مدراس میں بحیثیت اردو منشی خدمات انجام دیتے رہے اور یہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ تدریس کے دور میں آپ نے فنِ خطاطی کو بھی اپنایا اس میں اچھی مشق بہم پہنچائی جس کی وجہ سے آج بھی اچھے خوش نویسوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ فن کتابت آپ نے مدراس کے مشہور خاندانی خوش نویس جناب سید جلال الدین صاحب گھائل مدیر "آفتابِ دکن" اور "خورشید"، سے سیکھی۔

مشاعروں کے علاوہ آپ نے نثر میں بھی اپنی جو لانئ طبع کے

جوہر دکھائے ہیں۔ آپ نے ڈرامے اور ناول بھی لکھے ہیں۔ اردو مدارس کے لیے دو ایک کتابیں بھی مرتب کیں۔ دوسری مصروفیات کے باوجود آپ نے شاعری کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑا۔ غزل، نظم، قطعہ، رباعی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ آپ کا کلام صالح روایات کا آئینہ دار ہے۔ سلاست بے ساختگی اور نازک خیالی آپ کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔

آپ کا مجموعہ کلام "ریاضِ عقیدت" 18ر دسمبر 1984ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔

دل مبتلائے گیسوئے پیچاں کیے ہوئے — کب تک رہوں میں درد کو پنہاں کیے ہوئے
مرنے کے بعد بھی نہ ملا آہ مجھ کو چین — وہ آ گئے ہیں بال پریشاں کیے ہوئے
للہ ہٹا دو مصحفِ رخ سے نقاب اب — مدت ہوئی تلاوتِ قرآں کیے ہوئے
امید اب یہی ہے کہ امید ہے بندھی — تکتے ہیں راہ وصل کے ساماں کیے ہوئے

عادل ادھر ہے محوِ تماشائے حسنِ یار
آئینہ ہے ادھر انھیں حیراں کیے ہوئے

تمہارا رنگ خدا رکھے ایسا رنگ نہیں — کہ حسن دیکھ کے جس کا زمانہ دنگ نہیں
قسم خدا کی تجھے بھی بجھا کے رکھ دوں گا — یونہی میں جل مروں اے شمع وہ پتنگ نہیں
جو چھڑ گئی ہے تو بس فیصلہ ہی ہو جائے — ہو ختم صلح پہ جو نام اس کا جنگ نہیں
نظر کو اپنی جتا دو رکھے خیال اس کا — جو دل کے پار نہ ہو جائے وہ خدنگ نہیں

جو دل میں آ گیا وہ کہہ دیا گیا عادل
ہمارے کہنے کا مخصوص کوئی رنگ نہیں

حیدر علی خاں حیدر

حیدر علی خاں حیدر 15 ر جولائی 1910ء بہ مقام مدراس پیدا ہوئے۔ آپ نے اردو ادب کی مشاطگی میں اپنی عمر کا عزیز ترین حصہ صرف کیا تھا۔ آپ کو فارسی، اردو اور انگریزی زبان پر بہ یک وقت دسترس حاصل تھا۔ آپ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک خوش بیان مقرر بھی تھے۔ آپ کی وسیع النظری کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ آپ نے بہت سے نوجوان فن کاروں کی نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ حوصلہ افزائی کی۔ آپ بڑے مخلص، شریف النفس اور با اخلاق انسان تھے۔ آپ کا یہی خلوص آپ کی تخلیقات کے آئینہ میں ہر جگہ اُجاگر ہوتا ہے آپ کی پرکشش شخصیت سے انکار کفرانِ نعمت کے مترادف ہے۔ فارسی ادب سے آپ کی دلی وابستگی اردو زبان کے لئے بہت موثر اور مفید ثابت ہوئی تھی۔ آپ کی ہستی بھی مغتنمات میں سے تھی۔ تامل ناڈو کے کل ہند مشاعروں کی اناؤنسری میں آپ نے جو دلکش اسلوب اختیار کیا تھا۔ اس نے شمال کے مقتدر اور ممتاز شعراء سے بھی خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ بالخصوص اے جے اردو سیمنار اور دوسرے اداروں نے آپ کی خدمات حاصل کر کے جو کارنامے انجام دئے تھے۔ اُس کا سہرا آپ ہی کے سر تھا۔

آپ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ آپ کی نگاہِ دوربیں نے ادب کے صحیح مصرف کو پہچان لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شمال کے اکثر اربابِ نقد و نظر نے بھی آپ کا دل سے احترام کیا تھا۔

اردو شاعری کے ابتدائی دور میں آپ نے منشی فضل الحسن منظور صدیقی سے اپنی غزلوں پر اصلاحیں لیں۔ اور بعد میں عباس، علی عباس، اور مولانا رحیم احمد

فاروقی سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔

آپ کا شعری مجموعہ "حاصلِ عمر" 1976ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ یہ مجموعہ چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ رباعیات اور قطعات، دوسرا حصّہ غزلیات، تیسرا حصّہ پابند نظموں اور چوتھا حصّہ نعت اور منقبت پر مشتمل ہے۔

یہ مجموعہ تامل ناڈو کے اردو ادب کے لیے ایک گرانقدر تحفہ ہے۔ اس مجموعہ کی تخلیقات پڑھنے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ حیدر علی خاں حیدؔر کی شاعری کلاسیکی روایات کے صالح احساسات اور پاک جذبات کی آئینہ دار ہے۔ آپ کی شاعری میں عصری آگہی اور جدیدیت کے عنصر کی تلاش بے سود ہے۔

حضرت موصوف کا دوسرا مجموعۂ کلام "حاصلِ ایمان" جو قصائد، نوحوں اور منقبتوں پر مشتمل تھا ہنوز منظرِ عام پر نہ آسکا حالانکہ موصوف نے اس مجموعہ کو اپنی زندگی ہی میں ترتیب دے دیا تھا۔ حال ہی میں یہ مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔

جلوہ طرازیاں دل مائل کے سامنے
رسوا نہ کیجئے ہمیں محفل کے سامنے
مشاق قتل کرنے میں ایسا تو ہو کوئی
لگتے ہیں بے گناہ سے بسمل کے سامنے
ناکامیوں سے دور اکثر رہا کئے
خنداں رہے جو عقدۂ مشکل کے سامنے
حیدؔر ادائے خاص ہے یہ اپنے دور کی
ناقص کا بول بالا ہے کامل کے سامنے

ان بلاخیز اندھیروں سے مفر ہے کہ نہیں
سب کی آغوش میں پوشیدہ سحر ہے کہ نہیں
تجھ کو لازم نہیں زندوں سے شکایت ساقی
تیرا میخانہ بہ اندازِ دگر ہے کہ نہیں
طعنے دیتے ہو تم اوروں کو کہ ہرجائی ہے
دل تمہارا بھی اِدھر اور اُدھر ہے کہ نہیں
مشعلِ عزم لئے تو ہی بڑھ آگے حیدؔر
یہ نہ کر فکر کہ ہم راہ خضر ہے کہ نہیں

مولانا عبدالباری حاوی وانمباڑی

مولانا عبدالباری حاوی بہ مقام وانمباڑی 1910ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ معدن العلوم سے حاصل کی ۔ اردو، عربی اور فارسی زبان میں خاص ملکہ تھا۔ دس سال تک مظہر العلوم ہائی اسکول آمبور اور گورنمنٹ مسلم ہائی اسکول ویلور میں منشی کے عہدے پر مامور تھے۔ پھر اچانک کپڑے کی تجارت کی طرف مائل ہوئے اور اسی تجارت کے سلسلے میں بیرونی ممالک کا سفر کیا۔ پھر تجارت ترک کرکے مدرسہ جمالیہ پرمبور مدراس میں درس و تدریس کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

اردو شاعری میں آپ کا زیادہ رجحان نعت گوئی کی طرف تھا۔ کبھی کبھار غزل بھی لکھ لیتے تھے۔ غزل میں روایات کے سخت پابند تھے۔ ان کی تخلیقات کا لہجہ اور آہنگ میر تقی میر کے دور سے بھی ایک صدی پیچھے کی طرف تھا۔

1972ء میں حج بیت اللہ تشریف لے گئے راستہ ہی میں بہ مقام ظہران 16 رجنوری 1978ء کو وفات پائی۔ ظہران ہی میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

آثم کرنولی

حضرت محمد ابراہیم آثم کرنولی 1910ء میں محلہ گڑھ (موجودہ غزل آباد) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبدالغنی مرحوم عمارت سازی کے ٹھیکیدار تھے۔ آپ نے مولوی حافظ سید عبداللہ مدنی سے عربی اور مولوی عبد الجبار مرحوم سے فارسی سیکھی اور بعد میں مولوی حافظ قاضی محمد ابراہیم کی مدد سے عربی زبان پر عبور حاصل کیا۔ گورنمنٹ محمڈن ہائی اسکول سے ایس ایس

ایل۔سی پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ سکنڈری گریڈ ٹریننگ اسکول کرنول سے دو سالہ کورس میں کامیابی حاصل کی اس کے بعد 1935ء میں بہ حیثیت مدرس ویلور محمڈن ٹریننگ اسکول میں ملازمت پر مامور ہوئے 1937ء میں وہاں سے آرکاٹ محمڈن ٹریننگ اسکول میں آپ کا تبادلہ ہوا اور 1940ء میں اس مدرسہ سے مستعفی ہونے کے بعد مدراس مسلم ۔ بوائز کارپوریشن اسکول میں میر مدرس کی خدمات پر فائز ہوئے۔ 1962ء میں تعلیمی ملازمت سے وظیفہ یاب ہو کر آپ نے مستقل طور پر مدراس میں سکونت اختیار کی۔

حضرت اَثَم کرنولی اگرچہ کرنول کے تھے۔ لیکن تامل ناڈو کی فضا کچھ ایسے راس آئی کہ آخرکار یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بڑے زود گو شاعر تھے۔ سنگلاخ زمینوں میں بھی شگفتہ شعر کہہ لیتے تھے جو آپ کی قادر الکلامی کی دلیل تھی آپ محض خوش فکر اور خوش گو شاعر ہی نہیں بلکہ بڑی زندہ دل اور باغ وبہار شخصیت کے مالک بھی تھے۔ آپ نے دل نواز ترنم اور دل کش غزل سے کئی مشاعروں کو لوٹا تھا۔ آپ بھی صالح روایات کے پابند تھے۔ الفاظ کی بندش، حسنِ تخیل کے اظہار میں بڑی مہارت رکھتے تھے آپ کا کلام آج بھی زبان زد عالم ہے۔ تغزل سے بھرپور آپ کا لہجہ وجدان کے مہین تاروں کو چھو لیتا ہے۔ آپ کی غزلوں میں رندی اور سرشاری کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے کہ بے پئے ہر شخص جھومنے لگتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی حضرت اَثَم نے غزل کی بڑی خدمت کی ہے اور اردو غزل نے بھی آج تک آپ کو فراموش نہیں کیا۔ آج بھی غزل کے تعلق سے آپ کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔

8ر دسمبر 1974ء 1394ھ میں اچانک حرکتِ قلب بند ہونے سے آپ کی موت واقع ہوئی۔ امیر النساء بیگم قبرستان (رام لاؤباغ) میں تدفین عمل میں آئی۔

حضرت گلابؔ مدراسی نے آپ کی تاریخ وفات لکھی ہے۔

وائے کیا آثمؔ سا شاعر آج دنیا سے چلا

● جینے کو جئے کیا خاک جئے بے موت جئے مجبور جئے
سوسن کی طرح خاموش جئے نرگس کی طرح بے نور جئے

ہر جام و سبو کو توڑ دیا رُخ بادہ کشی کا موڑ دیا
ساقی کی نگاہوں کے مارے بے بادہ پیئے مخمور جئے

ظلمات کے پردوں میں اکثر بجلی کی چمک بھی دیکھی ہے
اے گردشِ دوراں یہ تو بتا اک لمحہ کبھی مسرور جئے

جس منہ سے تیرے گن گاتے تھے اس منہ سے نکلا کیا یعنی
کیا صبح طرب کیا شام غضب ہر حال میں ہم مشکور جئے

ایک لمحہ انا الحق کا آثمؔ اک عمر خضر سے ہے بہتر
وہ زندہ نہیں وہ مردہ ہے جو دار و رسن سے دور جئے

● ہماری فکر کی پرواز کون سو نہ گئی
فضا میں چھوڑ کے اک نقش اک نمو نہ گئی

ہمیں تھے کور نظر تشنۂ تماشا رہے
کہاں کہاں ترے جلووں کی آب جو نہ گئی

کئے ہیں سجدے ترے جب بھی لئے رُخِ روشن کے
مری نگاہِ صنم کوش قبلہ رو نہ گئی

حنا کو پیس کے ہیرے کو کاٹ کے دیکھا
وہ سُرخ رُو ہی رہی اس کی آبرو نہ گئی

ہمیں تھے شمع فروزانِ میکدہ آثمؔ
ہمارے بعد سیہ پوشئ سبو نہ گئی

● سنا سکا نہ انھیں داستاں کیا کرتا
حریفِ نطق تھی ظالم زباں کیا کرتا

گیا وہ دورِ عدالت پسندیاں بھی گئیں
نیا زمانہ ہے نوشیرواں کیا کرتا

فرازِ چرخ تحمل کو ناپنے کے لیے
وہ لے رہا ہے میرا امتحاں کیا کرتا

یہ کائنات نہیں بود و باش کے قابل
مکاں میں رہ کے بھی ہوں بے مکاں کیا کرتا

دل و دماغ پہ پیری ہے خیمہ زن آثمؔ
نہ فکر ہے نہ تخیل جواں کیا کرتا

عبدؔ مدراسی

حضرت عبداللہ حسین عبدؔ مدراسی مدراس میں 1910ء کو پیدا ہوئے آپ عطریات کے تاجر تھے۔ زندگی بھر اسی پیشہ سے وابستہ رہے۔

آپ کی ہستی مغتنمات سے تھی۔ آپ کی محبوب صنف نعت تھی۔ کبھی کبھی منقبت کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ کہنہ مشق شاعر تھے۔ آپ کے والد حضرت سعدالدین سعدؔ مدراسی کی طرح آپ بھی نعت گوئی کے میدان میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ زندگی بھر والدِ مرحوم کی تقلید کرتے ہوئے آپ نے نعت ہی کے دامن کو تھاما اور اس صنف کے آئینہ میں اپنے بھرپور خد و خال اُجاگر کئے۔ حالانکہ اسلوب قدیم تھا۔ لیکن اس میں نئی کیفیت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مشاعروں میں کلام تحت میں پیش کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ چھت میں لرزہ آگیا۔

آپ کو تاریخ نکالنے کے فن میں کافی دسترس حاصل تھی۔ آپ کے بعد اس فن کے جوہر دکھانے والا آج دور دور تک کوئی نہیں ہے۔ تاریخ گوئی اور نعت گوئی کے اس قادر الکلام شاعر سے بھی 31ر دسمبر 1980ء میں مدراس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو کر رہ گیا اور یکم جنوری 1981ء کی دوپہر تدفین عمل میں آئی۔

دل ہے کہ میرا کشمکشِ خیر و شر میں ہے — اس کے اثر میں میں ہوں وہ میرے اثر میں ہے
گم ہو گیا ہوں راہ نوردی کے شوق میں — میں ہوں سفر میں یا مری منزل سفر میں ہے
اے موسمِ بہارِ نو کیا گل کھلائے گا — ہر پھول کی ہنسی مرے زخمِ جگر میں ہے
ذرّے میں مہر، مہر میں ذرہ سما گیا — اُس کی نظر میں میں ہوں وہ میری نظر میں ہے

شیخِ حرم کو ایسی سعادت کہاں نصیب
سجدہ کناں جو عبدؔ تری رہ گذر میں ہے

حیرت القادری

شاہ غلام احمد حیرت القادری بر مقام حیدر آباد (آندھرا پردیش) 1911ء میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں میٹرک تک تعلیم بھی حیدر آباد میں 1928ء میں حاصل کی۔ آپ کے والد شاہ نبی محی الدین قادری پیر شاہی حیدر آباد کے چند اہم بزرگوں میں سے ایک تھے۔ انھیں طریقت کا سلسلہ ورثہ میں ملا تھا۔ اپنے والد کی طرح حیرت القادری بھی اس سلسلہ سے وابستہ تھے۔ آپ نے والد کے دستِ مبارک پر بیعت کی منزل بھی طے کی۔ آج بھی آپ کے سلسلہ کے مریدین حیدر آباد، کرنول، رائچور، ادھونی اور گلبرگہ شریف میں موجود ہیں۔ آپ سچے عاشقِ احمدِ مختار اور ثنا خوانِ مدحتِ سرکارؐ تھے۔ آپ 1930ء میں مدراس آئے۔ اور یہاں اپنی شادی رچانے کے بعد ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ طالب علمی کے دور سے ہی شاعری کا ذوق تھا۔ آپ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ جہاں آپ نے اردو غزل کو خونِ جگر دیا ہے۔ وہاں نعت گوئی کو بھی پاک عقیدت، نیک احساس اور صالح جذبات سے سرفراز فرمایا ہے۔ آپ کے کلام میں کہیں کہیں لاشعوری طور پر جدیدیت کے خدوخال اُجاگر ہوتے ہیں۔ آپ نے بڑی خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت انجام دی ہے۔ بالآخر 67 سال کی عمر میں 6ر جولائی 1978ء کی شام حیرت القادری کی روح نے ملکِ عدم کا سفر اختیار کیا۔ اور آپ کی تدفین حضرت محمد مختار مخدوم عبد الحق ساوی بیجاپوری عرف دستگیر صاحب کی درگاہ شریف کے احاطہ میں عمل میں آئی۔

یار نے ہم سے بے رخی کی ہے ۔۔۔ بات غم کی نہیں خوشی کی ہے
زندگی بھر رکھا اندھیرے میں ۔۔۔ قبر پر آ کے روشنی کی ہے
جان مانگی ہے تم نے حیرت کی ۔۔۔ لیجئے یہ تو آپ ہی کی ہے

مولانا حبیب خاں سرِوش داؤد عمری

مولانا حبیب خاں سروش مرحوم پتگرم کے رہنے والے تھے۔ جو ترپاتور سے تقریباً تین میل دور ایک چھوٹا سا قریہ ہے۔ دسمبر 1924ء میں عمرآباد میں جامعۂ دارالسلام عربی اور فارسی مدرسہ قائم ہوا تو مولانا اس مدرسہ میں داخل ہوئے اور 1932ء تک مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔ وہ ابتداء ہی سے بہت سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے شخصی وقار کا جامعہ کے تمام طلباء پر بہت زیادہ اثر تھا۔ بڑے اچھے مقرر تھے۔ آپ کی علمی اور فکری استعداد میں بڑی وسعت گہرائی اور کشادگی تھی۔ آپ عربی وفارسی کے ساتھ مشرقی اور مغربی علوم سے بھی آشنا تھے۔ شاعری میں مولانا شاکر نائطی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ مدراس یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی کرنے کے بعد گورنمنٹ آرٹس کالج میں لکچرر مقرر ہوئے۔ آپ میں بہت اچھا تنقیدی شعور بھی تھا۔ آپ کے بہترین مضامین مدراس کے ہفت روزہ اخبار "شاکر" میں بالالتزام شائع ہوتے تھے۔

آپ کی تالیف "سوانح حیات ممتاز" یقیناً اردو ادب میں ایک کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آپ کی شاعری آپ کے بہترین اور صالح جذبات اور احساسات کی عکاس ہے۔ اندھا دھند روایات پرستی کے قائل نہیں تھے۔ آپ کا شعری مذاق بہت بلند اور سلجھا ہوا تھا۔ کلام میں عمق اور زبان وبیان کی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آپ کی طویل نظمیں بڑی محاکاتی اور فضا آفریں کیفیات سے مملو ہوتی تھیں۔ حالانکہ آپ نے بہت کم لکھا ہے لیکن جو بھی لکھا ہے وہ اردو ادب کی بارگاہ میں ایک روشن چراغ کی

طرح ہے جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

○

دلوں کو نعرۂ تکبیر سے گرما دیا تُو نے
لگا دی آگ سینے میں اب لے آتش نوا تُو نے

یہ پھر غوغائے رستاخیز کیسا میکدہ میں ہے
مئے دیرینہ پائی ہے کہیں سے ساقیا تُو نے

نہیں آگاہ تو اپنی فلک پروازِ فطرت سے
زمیں کی پستیوں میں کیوں نشیمن کر لیا تُو نے

تری سرمایہ داری کی یہ زینت رنگ لائے گی
غریبوں کا لہو لے کر بنائی ہے حنا تُو نے

ذرا تو بادۂ مشرق کا امرت نوشِ جاں بھی کر
بہت کھائی ہے جو مغرب زہریلی ہوا تُو نے

نہ یہ اندازِ آزر ہے نہ یہ شان براہیمی
بنایا ہے بتوں کو اپنا در پردہ خُدا تُو نے

اگر یہ خواب ہے تو بس وہ اک تعبیر ہے اس کی
وہی ہے آخرت، دنیا میں جو حاصل کر لیا تُو نے

تیری شانِ فقیری میں تھی استغنائے سلمانی
کچل ڈالا تھا تاجِ خسروی کو زیرِ پا تُو نے

کھٹکتی ہے مری ہستی اگر اس دارِ فانی میں
میں حیراں ہوں مرے مولا یہ دل کیوں دے دیا تُو نے

خودی کی پرورش ہوتی ہے ہستی کے مٹانے میں
نہیں سیکھا ہے دانہ سے کوئی درسِ فنا تُو نے

ضمیرِ کائناتِ دہر میں جو راز مخفی تھا
اُسے اے مردِ مومن آخر افشا کر دیا تُو نے

مبارک جوشِ جنوں تیری غضب ہے فتنہ سامانی
جہانِ ہوش میں ہنگامہ برپا کر دیا تُو نے

شروشِ غیب دیتا ہے مبارک باد یہ مجھ کو
کہ پایا اپنی قسمت سے دلِ درد آشنا تُو نے

○

ذکرِ جمیل

میں نے چاہا کہ ترے حسن پہ کچھ شعر لکھوں
نطق کو خانۂ رنگیں سے گہر بار کروں
اپنے فردوسِ تخیل سے لطافت لے کر
شعر و نغمہ کی زبان میں تجھے میں پیش کروں

زلفِ شب رنگ کی چھاؤں میں ترا روئے حسین
جیسے ظلمات میں روشن ہے خضر کی قندیل
حسنِ پرکیف کی تفسیر نہ ہو گی مجھ سے
روحِ تخئیل مری آج ہے مجروح و علیل
تیرے ہونٹوں پہ ہے دوشیزہ بہاروں کا نکھار
رخِ گل رنگ پہ خوابوں کے جزیروں کی بہار
نگہِ مست میں ہے بادۂ دوشیں کا خمار
شوخ آنکھوں میں نہاں برقِ تبسم کا شرار
گو کہ ہیں تیرے لئے باعثِ تزئینِ جمال
میرے افکارِ گہر بار کے یہ نقش و نگار
پھر بھی شکوہ ہے مجھے حسنِ فسوں کار ترا
میرے الفاظ کے سانچے میں کبھی ڈھل نہ سکا

اپنے احساس کو فردوس بداماں کر کے
تیرے شاداب سے پیکر میں نیا رنگ بھروں
نقشِ صناعیٔ آذر کے حسیں پیکر میں
سوچتا ہوں کہ نئی جان کہاں سے ڈالوں
ڈر ہے مجھ کو کہ ترے حسن کی توہین نہ ہو
وہ بھی کیا شعر کہ جس سے تری تحسین نہ ہو
ماہ و انجم میں درخشاں ہے ترا عکسِ جمیل
حسن کی آنچ تری روکشِ گلزارِ خلیل

شرقیؔ مدراسی

محمد عبداللہ شرقی 1912ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ کو بہ یک وقت نثر و نظم دونوں پر عبور حاصل ہے۔ 1930ء میں جب مولانا محوی صدیقی بھوپال سے مدراس آئے تو شرقیؔ آپ کی شہرت سے متاثر ہو کر آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہو گئے۔ تقریباً آدھی صدی سے شعر کہتے آئے ہیں۔ لیکن تغزل میں دو قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ آپ کی غزلیں قدیم اسلوب اور قدیم زاویۂ نظر کی حامل ہیں۔ آپ کے لہجے میں ناسخؔ اور آتشؔ کا رنگ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ غالباً آپ کے دو چار شعری مجموعے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ 1988ء میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

بادہ آشام بہت اور ہیں پیمانے چند
کاش کھل جائیں یہاں اور بھی مے خانے چند

جان دے دے کے ملی ان کو حیاتِ جاوید
شمع کے سائے میں سوتے ہیں جو پروانے چند

اُن پیالوں سے بجھے پیاس ہماری کیوں کر
ہم بلانوش ہیں کیا چیز ہیں پیمانے چند

دنیا میں بہت دیکھے حکومت کے سماں
وہ دبدبے، وہ رعب وہ شوکت کے نشاں

شرقیؔ مگر انداز یہ ہیں اور ہی کچھ!
کونین میں سکہ ہے محمدؐ کا رواں

حاصل فلکِ پیر کو گرچہ ہے فراز
گلزار میں گل کو بھی بڑا حسن پہ ناز

شرقیؔ یہ بڑائی ہے مگر سب باطل
ہیں ساری خدائی میں محمدؐ ممتاز

ایک چیز کو دوسری پہ برتر پایا
انسان کو ہر چیز کا افسر پایا

ہے شانِ محمدؐ کی نرالی لیکن
شرقیؔ انھیں کونین کا سرور پایا

عظیم آمبوری

کاکا عبدالواحد عظیم آمبوری، آمبور (شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے۔ سنِ ولادت معلوم نہ ہوسکا۔ آپ دراصل وہ سیماب صفت شاعر تھے کہ ہمیشہ گرجتے ہوئے بادل کی طرح ادبی محفلوں میں آتے تھے اور آندھی کی طرح چھا جاتے تھے۔ آپ نے بھی بڑی خاموشی سے اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ عرصہ دراز تک علامہ شاکر نائطی سے وابستہ تھے لیکن اختلاف کا مسئلہ پیدا ہوتا تو بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتے۔ آپ کی ہنگامہ خیزی، بے باکی اور نڈر پن سے سب خائف رہتے۔ صاف گوئی کی عادت تھی۔ جو بھی کہتے مُنہ پر کہتے۔ مولانا شاکر نائطی نے جب علامہ محوّی صدیقی لکھنوی کے خلاف خاموش محاذ قائم کیا تو عظیم نے کھلے طور پر اس محاذ کی نمائندگی کی۔ آپ کا رجحان بھی غزل کی طرف بہت زیادہ تھا۔ اپنی آخری عمر میں آپ نے ایک طویل مثنوی "رودِ کاویری"[1] بھی لکھی جو مدراس کے ادبی ماحول میں بے حد مقبول اور مشہور ہوئی۔ معلوم نہیں آج ان کی تخلیقات کا سرمایہ کہاں، کس کے پاس اور کس حالات میں موجود ہے؟

21ر مارچ 1968ء ۱۳۸۷ھ کو آپ کا انتقال آمبور ہی میں ہوا۔

○

خون رونے سے یہ دھبے میرے داماں میں نہیں ۔۔۔ میں نے وہ پھول چنے ہیں جو گلستاں میں نہیں

جوشِ وحشت میں کئے دستِ جنوں نے پرزے ۔۔۔ نام کو تار بھی ایک میرے گریباں میں نہیں

چرخِ ہفتم سے یہ آئے ہیں مضامین عظیم ۔۔۔ قدر داں ان کا کوئی بزمِ سخن داں میں نہیں

---

[1] اس مثنوی کا مسودہ مولانا محمد یوسف کوکن کے پاس محفوظ ہے۔

نوابؔ محمّد محمودؔ

نواب محمّد محمودؔ کا تعلق نوابانِ آرکاٹ سے تھا۔ آپ 15ر اپریل 1913
کو مدراس میں پیدا ہوئے اور آپ کو ادبی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔
آپ نہایت حلیم الطبع اور خوش گو تھے۔ مدراس یونیورسٹی سے بی۔ اے
اور بی۔ایل میں امتیازی طورپرکامیابی حاصل کرنے کے بعد آپ نے وکالت
کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ آپ کی طبیعت میں خلوص ومحبت سنجیدگی ومتانت
کے ساتھ ساتھ بڑی شگفتگی تھی۔ دو بار حج بیت اللہ سے سرفراز ہونے
کے بعد ان کی زندگی نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ وکالت کے پیشہ کو بھی
خیر باد کہہ دینا پڑا۔ آپ بہت صاف گو اور سچائی پسند تھے۔ اردو شاعری
کی تمام تر اصناف پر بھرپور دسترس حاصل تھا مگر آپ نے نعت گوئی کی طرف
بہت زیادہ توجہ دی ہے۔

18ر جنوری 1978ء کو مختصر سی علالت کے بعد آپ نے آخری سفر
اختیار کیا اور مسجد والاجاہی میں اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

آپ کے انتقال کے بعد آپ کے سعادت مند فرزند جناب اکرام
محمود، اڈوکیٹ نے بڑی لگن اور خاص انہماک سے آپ کے کلام کو یکجا کرنے
کے بعد تین مجموعے انتخاب کلام محمودؔ (مطبوعہ 1979ء)، گنجینۂ محمودؔ (مطبوعہ
1984ء)، نوائے محمودؔ (مطبوعہ 1986ء) اردو ادب کو دئے۔

○

زہد وتقویٰ کا جہاں دفتر کھلا — حال اپنا خود بخود ہم پر کھلا
اس چمن میں دیدہ ور کے واسطے — پتہ پتہ میں ہے اک دفتر کھلا
نیّرِ اسلام جب پیدا ہوا — مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

بن گیا جو سیدِ ابرارؐ کا نکتہ نکتہ زیست کا اس پر کھلا
کیا کرے محمودؔ ان کی منقبت
جن کی خاطر گنبدِ بے در کھلا

ہم کو ادق ردیف ملی قافیہ ادق
عنوان وہ کہ جس کا ہے خود تسمیہ ادق
سب واردات اس کی کہاں ہم سنا سکے
ہے داستانِ زیست بھی اک مرثیہ ادق
وسعت کہاں ہے تیری بصارت کو مل سکے
اتنا تری نظر کا ہے جب زاویہ ادق
ذرّوں کی منزلت ہمیں معلوم ہے مگر
مشکل یہ ہے کہ ذرّوں کا ہے تجزیہ ادق
محمودؔ نیک لوگوں کے ذکرِ دریاں کے ساتھ
کیسے ہو تیرا ذکر کہ ہے تسویہ ادق

فریدؔ مدراسی

شیخ فریدالدین فریدؔ مدراسی 19 ر اگست 1919ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ پیشہ کے اعتبار سے اپنے باپ کی طرح فریدؔ بھی گوشت کے بیوپاری تھے۔ بچپن سے انھیں مدراس کے اچھے شعرار کی صحبتیں حاصل تھیں۔ شعرار کی صحبتوں نے انھیں شعری ذوق عطا فرمایا تھا مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ خصوصًا نعت گوئی میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا ثبوت پیش کیا ہے۔ زبان آہنگ اور لہجہ کے اعتبار سے دوسرے بعض نعتیہ مجموعوں سے کچھ کم نہیں ہے۔

آپ نے 1980ء میں مدراس میں وفات پائی۔

کہیں ہے رنگ ترا اور کہیں ہے بو تیری
جھلک ہے صاف نمایاں بہر نمو تیری
نجوم ہوں کہ مہ و مہر ہوں کہ شبنم و گل
ہر اک نقش میں ہے شکل ہو بہو تیری
تلاشِ یار میں کب تک رواں رہے گی فریدؔ
تنک اساس نگاہوں کی آبجو تیری

ابوالخیر واقف القادری ہاشمیؔ

حضرت مولانا مولوی سید درویش محی الدین ابوالخیر واقف القادری ہاشمیؔ ، مولانا مولوی الحاج سید شاہ حسین قادری چشتی محرم کے پوتے اور حضرت مولانا ہاشمؔ ترپاتوری کے شاگرد رشید تھے۔ آپ بہ مقام ترپاتور (شمالی آرکاٹ) 1916ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت ویلور کے علمی اور مذہبی ماحول میں ہوئی۔ آپ نے بہت کم عمری میں عربی فارسی اردو کی تعلیم حاصل کی اور بہت کم عمری ہی میں (لگ بھگ 45 سال کی عمر میں) راہی ملک عدم ہوئے۔ اردو غزل آپ کی محبوب صنف تھی۔ تصوف کے مضامین پیش کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔

آپ اپنے والد بزرگ وار سید شاہ عبدالقادر قادری چشتی (فرزند حضرت محرم) سے بیعت تھے۔ ترپاتور اور مدراس میں آج بھی آپ کے ارادت مند موجود ہیں۔

مدرسۂ اعظم مدراس میں مدرس تھے۔ 1961ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

جو نہ اٹھا غیر سے اس بار کا حامل ہوں میں
ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

ہیں علاج درد میں مصروف سارے چارہ گر
درد یہ کہتا ہے اٹھ کر عشق کا حاصل ہوں میں

بزم میں ہلچل سی ڈالی شعر خوانی نے مری
واقفؔ مسرور وجہ گرمئ محفل ہوں میں

عبدالقادر نویدؔی

سید عبدالقادر نویدؔی عمری بن سید جعفر مرحوم 1917ء میں پتگرم تعلقہ ترپاتور ضلع شمالی آرکاٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پتگرم کے بورڈ محمڈن اسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد 1929ء تا 1936ء جامعہ دارالسلام عمرآباد ضلع شمالی آرکاٹ میں درس نظامی سے فارغ ہوئے مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل اور افضل العلماء کی سندیں بھی حاصل کیں۔ 1938ء تا 1976ء سٹی منسپل ہائی اسکول کوئمبٹور میں بطور اردو منشی کام کیا۔

آپ کہنہ مشق شاعر اور منجھے ہوئے ادیب ہیں۔ آپ کا کلام ماہ نامہ "مصحف" عمرآباد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ آپ صالح روایات کے تحت پابند ہیں۔ کلام میں زبان کی لطافت کے ساتھ فکر کی گہرائی بھی ملتی ہے۔ زیادہ تر غزل کہتے ہیں۔

○

ذرہ ذرہ چمن دہر کا بے کار نہ تھا — دیکھنے والا مگر دیدۂ بیدار نہ تھا
پھول ہی پھول نظر آئے حقیقت بیں کو — چشم بینا میں کھٹکنے کو کوئی خار نہ تھا
منزلِ زیست میں ٹھوکر بھی مقدر کو ملی — دو قدم تک بھی کہیں جادۂ ہموار نہ تھا
مفت رسوا ہوا جاکر تو نویدؔی ورنہ — ان کی محفل میں کوئی تیرا طرفدار نہ تھا

○

میر نذر حسن سحبانؔ مدراسی

میر نذر حسن سحبانؔ مدراسی کی تاریخ پیدائش نہ معلوم ہو سکی۔ ایک جگہ موصوف نے خود لکھا ہے۔ " میری زندگی دوسرے شعراء کرام کی زندگیوں سے بالکل مختلف ہے ایک بہترین شاعر کے لئے حصولِ علم عروج اور تکمیل فنِ شاعری کے لیۓ جیسی تعلیم و تربیت لازم قرار دی جاتی ہے وہ میرے حصّہ میں نہ تھی " لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ آپ کا شعری سرمایہ دیکھنے اور پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ فطری شاعر تھے اور آپ کی شعری تخلیقات میں جو جواہر پارے موجود ہیں وہ ان کے بیان کی نفی کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے غالبؔ، امیرؔ اور داغؔ کے دواوین کے مطالعہ نے ان کے شعری ذوق کو جلا بخشی ہو۔ شعری ذوق انھیں ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے ابّا حضور قاضی میر غلام جیلانی بذاتِ خود اچھے شاعر تھے ابتداء میں سحبانؔ مدراسی کے کلام کی اصلاح خود غلام جیلانی کیا کرتے تھے بعد میں وہ سید ابوالبرکات انورؔ کی طرف رجوع ہوئے۔ ابوالبرکات انورؔ کی صحبتوں میں ان کی شاعری کو نئی توانائی ملی اور ان کی فنی معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔1945ء کے بعد انہوں نے مبتدی شعراء کی بہت زیادہ خدمت انجام دی اور ان کے شاگردوں کا قافلہ بہت دور دُور تک پھیلا ہوا ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ کوئی شاگرد بھی شعری ادب میں آپ سے دو قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا 8 راگست 1983ء میں آپ کینسر کے موذی مرض سے جاں بحق ہوئے۔

○

رقصاں ہیں تجھ پہ نازو ادا سر سے پاؤں تک
لپٹی ہوئی ہے تجھ سے حیا سر سے پاؤں تک

میں اور تیرے ظلم کا شکوہ رقیب سے !
جھوٹا ہے یہ بیاں ترا، سر سے پاؤں تک

دو چار ہوں گناہ، تو بخشش کی ہے امید
ہے میری زندگی میں خطا سر سے پاؤں تک

کس رشکِ گل نے آج گلے سے لگا لیا　　مہکی ہوئی ہے بادِ صبا سر سے پاؤں تک
سحابؔ وہی کلام ہے مجھ کم ترین کا
سنتی ہے جس کو خلقِ خدا سر سے پاؤں تک

مضمونِ خط میں کوئی کہاں دل کا حال باندھے　　الفاظ میں کہاں تک رنج و ملال باندھے
شام و سحر ہیں تجھ سے دل عاشقوں کے روشن　　کیوں کر کوئی قمر کی تجھ سے مثال باندھے
پھرتے ہیں وہ غضب میں جیسے پھرے سپاہی　　خنجر پہ ہاتھ رکھے سینے سے ڈھال باندھے
اک خواب ہی کم از کم آئے نظر کہ جس میں　　وہ شوخ بڑھ کے ہم سے شرطِ وصال باندھے
تعریف تیری سحابؔ اس کے سوا نہیں ہے
مشکل زمیں میں تو نے نازک خیال باندھے

ہوا خیال فسانہ تجھے سنانے کا　　چمن کا پھول کا بلبل کا آشیانے کا
مرے خلوص و تحمل پہ کچھ اثر نہ ہوا　　غرض کے حیلے کا تکذیب کا بہانے کا
وہ گفتگو میں ہمیشہ خیال رکھتا ہے　　خلش کا وہم کا دھوکے کا آزمانے کا
ہے اشتیاق حسینوں کو آج کل سحابؔ
ستم کا ظلم کا بیداد کا زمانے کا

جلالؔ کڑپوی

حضرت محمد جلالؔ کڑپہ کے رہنے والے تھے پتہ نہیں کن حالات کے تحت مدراس آئے اور ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ اسلامیہ کالج وانمباڑی میں اردو کے لکچرر تھے۔

اردو شاعری میں غزل اور نظم کی صنفوں کو اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے اپنایا۔ ان کی غزلوں میں دور دور تک کہیں بھی تغزل کی چاشنی نہیں ملتی۔ ان کی نظمیں بھی موجودہ تقاضوں کے ادراک سے محروم ہیں۔ اپنے وقت کے عہد آفریں بزرگ شاعر مولانا آسیؔ ترپاتوری کے شاگرد ہیں۔ لیکن شعری ادب کے وسیع اور کشادہ جزیرے میں اپنے استاد کی قد اور شخصیت کے آگے بہت بونے سے لگتے ہیں۔

فی الحال چتوڑ (آندھرا پردیش) کے مضافات میں ایک عربی مدرسہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ حال ہی میں 1988 آپ کا ایک شعری مجموعہ "جمالِ جلال" منظر عام پر آیا ہے۔

1989ء میں آپ حج کے لیے روانہ ہوئے اور وہیں راستہ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

○

مری شامِ غم کی سحر ہو رہی ہے
کلی اشکِ شبنم سے منہ دھو رہی ہے

زمانے کے فتنے کبھی جاگ اٹھے
مری آج قسمت یہ کیوں سو رہی ہے

نہ پوچھو جلالؔ حزیں سے کہ کیوں ہیں
غریبوں کی یوں ہی بسر ہو رہی ہے

تصرفات میں قدر وقضا کے موت وحیات
یہ دونوں قبضے کے اپنے نہ اختیار کے ہیں

یہ نرمی اور وہ سختی ہے فطرتوں کی جلال
یہ گل، بہار کے ہیں خار بھی بہار کے ہیں

○

نوراللہ اسرار

محمد نوراللہ اسرار وانمباڑی کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ شعر گوئی سے خاص دلچسپی ہے۔ حضرت ماہر القادری کے تلامذہ میں سے ہیں۔ جذبات کے اظہار میں سادگی اور سلاست سے کام لیتے ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں بھرپور تغزل کی چھاپ ہر جگہ نظر آتی ہے۔ آج کل تجارتی مصروفیات کے پیش نظر غالباً شعر گوئی کا سلسلہ رک سا گیا ہے لیکن اسرار کا ادبی ذوق ہمیشہ توانا رہے گا۔ آپ نے 24 دسمبر 1989ء کو انتقال فرمایا۔

کبھی وہ سوئے مے خانہ چلا آہستہ آہستہ — تو زاہد نے کسی سے کچھ کہا آہستہ آہستہ
مجھے کیا عذر کم ظرفی ہے میرے مہربان ساقی — پلا جتنی بھی ہو لیکن پلا آہستہ آہستہ
انھیں ہونا تھا روشن شمع کی مانند محفل میں — مجھے اسرار جلنا تھا جلا آہستہ آہستہ

پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی

پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی 19/ جولائی 1919ء کو ضلع کوئمبتور کے ایک قصبہ پرندلور میں پیدا ہوئے۔ آپ جنوبی ہند کے ایک ذی علم مشائخ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور عربی، فارسی، دینی، علوم کی اعلیٰ تعلیم جامعہ دارالسلام، عمرآباد سے حاصل کی۔ مدراس یونیورسٹی سے افضل العلماء، منشی، فاضل، بی۔ اے اور ایم۔ اے میں کامیابی حاصل

کرنے کے بعد 1959ء میں بحیثیت لکچرر شعبہ تاریخِ اسلامی ، سرکاری ملازم ہوئے اور 1978ء میں وائس پرنسپل بن کر وظیفہ یاب ہوئے۔

آپ کہنہ مشق شاعر تھے۔ جذبات کی عکاسی اور احساسات کی ترجمانی میں بڑی خوش سلیقگی سے کام لیتے تھے۔ آپ کے کلام میں فکری عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ زبان وادب کے مسائل سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ آپ کی تحقیقی صلاحیت بھی قابلِ ذکر ہے۔

آپ کو علاقائی زبان تامل پر بھی دست گاہ حاصل تھی۔ آپ نے تامل زبان کی مشہور اور تین ہزار سالہ قدیم تصنیف " ترو کرل "کا منظوم ترجمہ اردو زبان میں شروع کیا تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس گرانقدر کام سے سبکدوش ہونے سے پہلے ہی زندگی کی آخری سانسیں جواب دے گئیں۔

5/ جون 1978ء کو بنگلور میں آپ کی وفات ہوئی اور یہیں تدفین عمل میں آئی۔

○

بوجہ خندۂ گل برق گرتی ہے گلستاں پر
یہ کیوں پھر ٹوٹ پڑتی ہے مصیبت قلب نالاں پر

رہا برسوں دل افسردہ محو گریہ وزاری
نظر اک بار اٹھی تھی بہارِ روئے خنداں پر

زمانہ کس طرح دورِ جنوں کو بھول سکتا ہے
ہماری زندگی منقوش ہے دیوارِ زنداں پر

○

صعوبتوں سے الجھنا ہے غم اٹھانا ہے
ملا ہے دل جو مقدر میں چوٹ کھانا ہے

وفا شعاریٔ دل کی یہ انتہا کہ اسے
یہ شوق ہے کہ جفاؤں کی تہہ کو پانا ہے

فریب خوردۂ سودا ہے سرمدی یکسر
ہوس بچھائے جو دام اپنا کب یہ دانا ہے

○

ترو کرل کا منظوم ترجمہ :-

ابتدا ہے الف سے ابجد کی
یوں ازل سے ہے جلوۂ باری

بن کے عارف جو گائے گن رب کے
دوگنوں[ع۱] سے وہ دور ہے شب کے

ہل نہ جوتے کبھی کسان اپنا
ختم کر دے جو ابر، دان اپنا

بند گر فیض ابر ہو جائے
آبروِ بحر اپنی کھو جائے

جس کا ہر لفظ ہے اثر میں قوی
شاندار ان کا ہر کلامِ خفی

پائیں دولت بھی اور عزت بھی
بڑھ کے نیکی سے ہے کوئی خوبی

وہ جو ثابت رہے بھلائی میں
سنگ حائل جنم کی وادی میں

خانگی زندگی میں نام کرے
دیوتاؤں میں تو مقام کرے

خوش وہ پتنی جو لاج ہے گھر کی
یافت سے خرچ کم کرے بر کی

کیا کمی نیک اگر ہے گھر والی
ورنہ دامانِ زندگی خالی

جس کی اولاد نیک ہو جائے
ست جنم کے دکھوں کو دھو جائے

بند الفت نہ ہو گی تالوں میں
شیرہ ہو جائے بھیگی آنکھوں میں

پیار کی راہ ہی ہے خوش بختی
اور فیضانِ آسمانی بھی

قدر مہماں کی جو نہ پہچانے
اس کی دولت بھی اس کا ساتھ نہ دے

بے ریا پر خلوص اور میٹھی
بات ہوتی ہے اہلِ دانش کی

دیکھنا! بول خوش اثر بھی ہیں
خام کیوں پختہ جب ثمر بھی ہیں

بات میں جب مٹھاس گھل جائے
قدر تیری جہاں پہ کھل جائے

قوتِ ضبط کی حفاظت کر
تحفہ انمول یہ ترا جوہر

زخم آتش بجاں تو بھر جائے
زخم تیر زبان نہ بھر آئے

نیک اطوار بے لگام نہ ہو
بھول کر بھی وہ بد کلام نہ ہو

پاک سینہ اگر ہو کینے سے
زیست گذرے تری قرینے سے

ع۱: شب سے مراد جنم کی تاریکیاں ہیں۔ دوگن سے مراد اگلی اور موجودہ جنم کی برائیاں۔

جس کا سینہ حسد سے خالی ہے — اس کی خوش قسمتی مثالی ہے
حرص میں دائمی ضیا کیا ہے — عارضی لطف کی ہوا کیا ہے
دوسروں کی بدی جو گائے گا — اس کا ہر عیب تو لا جائے گا
نیک انسان فضول گوئی سے — نیکیوں کا وقار کھو بیٹھے

عبدالرحمٰن تشنہ

آپ 7 رنومبر 1923ء بمقام پتگرم، ترپاتور ضلع شمالی آرکاٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ دارالسلام عمرآباد کے فارغ التحصیل تھے۔ مدراس یونیورسٹی سے بی او ایل اور ایم امتیازی درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ فکر پر زبان کی لطافت، محاورات اور معاملہ بندی کو ترجیح دیتے تھے۔ کلام میں سادگی کا عنصر بہت زیادہ موجود ہے۔ تشنہ کی خود اپنے وطن میں قدر و منزلت نہ ہو سکی ورنہ اُن کی تخلیقات کا سرمایہ اکارت نہ جاتا۔

آپ نعت گوئی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ آپ کی نعت کے ہر شعر سے آپ کے پاکیزہ جذبے اور والہانہ عقیدتوں کے نقوش نمایاں ہیں۔ آپ 22 ردسمبر 1971ء میں وفات پائی۔ نیوٹاؤن وانم باڑی کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

اللہ اللہ ماہِ عربؐ کی تابشیں! — وادیٔ بطحا کے ہر ذرّہ کو سینا کر دیا
جذبۂ حبِّ نبیؐ کا ہے کرشمہ تشنہ یہ — تیرے ان اشعار نے اک حشر برپا کر دیا

سلطان قدیر

سلطان قدیر کی پیدائش اور تعلیمی حالات کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع بہت نصیب ہوئے ہیں۔ ان کو اردو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ اتنے زود گو شاعر تھے لمحوں میں ڈھیر سارے قصائد اور سلام لکھ دیتے تھے۔ عوامی شاعر ہونے کے ناطے عبدالغنی شجاع (تامل ناڈو کے مشہور معروف عوامی شاعر) سے دو قدم آگے نکل چکے تھے۔ ایامِ رمضانِ مبارک کی حسین اور بابرکت

راتوں میں گلی کوچے آپ کے قصائد کی خوشبو اور پھلجھڑیوں کی ست رنگ چھوٹ سے آباد رہتے ہیں۔

آج سلطان قدیر ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کے شعری جذبوں کی مہک مدراس کے اکثر احباب کے دل و دماغ میں جلوہ فگن ہے۔

1973ء / ۱۳۹۳ھ میں آپ نے وفات پائی۔

○

اس مست نظر کے اے ساقی ہم جب سے بنے ہیں متلنے
سب ٹوٹ چکے ہیں پیمانے اور بند ہوئے ہیں میخانے
اے شیخ چلو ہم تم پی لیں پر کیف چھلکتے پیمانے
ان دیر و حرم کو رہنے دو چھوڑو یہ پرانے افسانے

○

گلوں کا دور گیا بھی تو گل کی بو نہ گئی
ہماری جان گئی بھی تو آبرو نہ گئی
ہم اپنی کثرتِ عصیاں پہ اس قدر روئے
دعا ہماری سرِ عرش بے وضو نہ گئی
محل میں بات سناتا ہے جھونپڑوں کی قدیرؔ
کہ تجھ سے آج بھی وہ مفلسی کی خو نہ گئی

○

باگی عبدالقادر دانش فرازی

باگی عبدالقادر دانشؔ فرازی د فرزندِ باگی محمد اعظم، بہ مقام آمبور 1921ء میں پیدا ہوئے۔ آپ خورشید احمد جامی، مخدوم محی الدین اور خلیل الرحمان اعظمیؔ کے دور کے شاعر ہیں۔ آپ تامل ناڈو کے وہ پہلے اور واحد شاعر ہیں۔ جنہوں نے ہر دور میں ادب کی بدلتی ہوئی قدروں کا دیانت داری، خلوص اور ایک ذمہ دارانہ احساس کے تحت ساتھ دیا۔ آپ کی شاعری کا آہنگ ترقی پسند تحریک 1936ء سے 1958ء تک منفرد تھا۔ آپ نے خصوصًا تامل ناڈو میں عصری آگہی کے رجحانات اور جدیدحسیت کے چراغ روشن کرنے میں ایک اہم تاریخی رول ادا کیا تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ بعض تنگ نظر اور متعصب نقادوں نے ان کی خدمت، جدوجہد اور لگن کو نظر انداز کیا۔ بعض اوقات خود تامل ناڈو کے ان فن کاروں نے بھی ان کے فن اور شخصیت سے اغماض برتتے ہوئے اپنا پرچم بلند کرنے کی کوشش کی جنھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں حضرت دانش فرازی سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔

حضرت دانش فرازی نے ترقی پسند تحریک کی عمرانی، ثقافتی اور سماجی قدروں کا بھرپور ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ اپنی آزاد نظموں میں عصری آگہی اور نئے لہجوں کی نئی جہتوں کو اُجاگر کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا جس سے تامل ناڈو کی نئی نسل متاثر ہوئے بغیر نہ رہی ابتدا ہی سے اہلِ علم و ادب نے دانش صاحب کو ایک سنجیدہ اور فکری شاعر سمجھ کر ان کا دلی خیر مقدم کیا۔ خلیل الرحمان اعظمی جیسے انصاف پسند نقاد نے ان کی نظموں کو پڑھنے کے بعد کاوش بدری صاحب کو لکھا کہ اردو کے شعری ادب میں اقبال کے بعد ایک بار پھر ایک فکری شاعر منظر عام پر آرہا ہے۔ اپنے دور کے سب سے بڑے سخت گیر نقاد مولانا نیاز فتح پوری نے بھی آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کی منظوم تخلیقات کو "نگار" کراچی میں نمایاں جگہ دی۔ حضرت دانش فرازی دراصل فکر کے شاعر ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں زندگی کی گہرائی، مشاہدے کی لطافت اور کائناتی مناظر کے وہ نقوش ملتے ہیں جو ایک بڑے اور عظیم فن کار کا خاصا ہیں۔

حضرت دانش فرازی میرے ان پیش رؤں میں سے ہیں جنھوں نے قدیم اور جدید ادب کا بالالتزام مطالعہ کیا۔ آپ نے ان شعراء کو بھی پڑھا، سمجھا جن کے نام سے نئی نسل کے فن کار بے بہرہ ہیں۔ حضرت دانش فرازی کے تنقیدی شعور کی سطح پر ابھرنے والے رنگوں کی فضا بھی جانی پہچانی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کی تخلیقات میں فن کار کی شخصیت اور

داخلی عناصر کے درمیاں پیدا ہونے والے ان مٹ رشتوں کا ادراک ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت دانش فرازی نے کبھی تنقید کو اپنا موضوع نہیں بنایا لیکن آپ کی اصابت رائے کا اعتراف شمال کے اکثر ارباب علم وفن نے کسی مصلحت کے بغیر کیا ہے۔ حضرت دانش فرازی کا تنقیدی سفر مسلسل دشواریوں کے باوجود بڑا خوش گوار رہا ہے۔ ایک تو زبان وبیان پر بھرپور دسترس پھر زندگی کے طویل اور تلخ تجربات ومشاہدات پھر تخلیقات کی زیریں لہروں کی دریافت، ان تمام خصوصیات کی وجہ سے تنقیدی ادب میں آپ کا ایک الگ مقام پیدا ہو گیا ہے۔

حضرت دانش فرازی کی تخلیقات کا گرانقدر سرمایہ جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ اب تک بدقسمتی یا ماحول کی ناقدری کی وجہ سے منظرِ عام پر نہ آسکا لیکن ان کی مطبوعہ تصانیف "رگِ سنگ" 1959ء (قطعات کا مجموعہ "آیاتِ فطرت" 1964ء (سورۂ فاتحہ کی مختلف تفاسیر کی روشنی میں ایک طویل نظم "نالۂ فرأت" مطبوعہ 1967ء (مرثیہ امام حضرت حسین علیہ السلام)، "محسن اعظم" مطبوعہ 1974ء (نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ پر ایک طویل نظم) "خدنگِ خستہ" مطبوعہ 1981ء (آزاد نظموں اور غزلوں کا انتخاب)، کے مطالعہ سے اردو ادب میں ان کی بلند پائیگی کا بہترین ثبوت ملتا ہے۔ آپ کی تصنیف "محسنِ اعظم" سردر کائناتؐ کی مختصر حیاتِ طیبہ کی آئینہ دار ہے۔ زبان وآہنگ، فکر ونظر اور لہجہ کے اعتبار سے بھی یہ طویل نظم انفرادیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں آپ نے بڑی یکسوئی کے ساتھ اختصار وایجاز کے باوجود نبیؐ اکرم کی سیرت کو بڑے دلکش اور متاثرکن پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم میں بعض مقامات پر نثر ونظم کے امتزاج کے ساتھ تمثیلی اسلوب کی بالیدگی اور رفعت و دلکشی کو سمونے کی فن کارانہ کوشش کی ہے۔

حضرت دانش فرازی سے فیض یاب ہونے والوں کا حلقہ مدراس سے کرناٹک تک پھیلا ہوا ہے جن میں یوسف خواہاں، علیم صبانویدی،

حسن فیاض، نورسن خیامی، اجمل سعیدی، سراج زیبائی، تمنا یوسفی، مخدوم اشرف، آذر بیابانی، سہیل راشد، امین سیٹھ الماس، نثار الماس، چراغ بنگلوری عبدالملک ضیا وانمباڑی، بزمی آمبوری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت دانش فرازی کی ادبی زندگی کا بڑا حصہ شہر مدراس میں گذرا اور یہیں آپ کی ادبی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوئے۔ مدراس بڑی میٹ مسجد سے ملحق مدرسہ میں برسوں مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مدراس میں آمد کے بعد مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد سے جناب کاوش بدری نے ان کا تعارف کرایا تو کہا جاتا ہے کہ مولانا نے دانش فرازی کی شعری استعداد کا امتحان لینے کے لئے اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ ان کے سامنے رکھدیا اور فرمایا کہ فی البدیہہ منظوم کرو۔ دانش صاحب نے ذراسی کوشش سے مولانا کے حکم کی تعمیل کردی جس کے بعد مولانا آزاد ہمیشہ دانش صاحب کی شعری اور فنکارانہ صلاحیت اور استعداد کے معترف رہے۔ بعد میں بعض نامساعد حالات سے دل برداشتہ ہوکر بنگلور کو اپنا مستقر بنایا اور وہاں ان کا قیام 1970ء سے 1973ء تک رہا۔ اس مختصر سے قیام کا اکثر حصہ سیدہ اختر کی ادبی کاوشوں کو رنگ روپ عطا کرنے میں گذرا۔ زندگی کا آخری دور زیادہ تر وانمباڑی اور آمبور میں گذرا مدراس سے آپ کا ذہنی رشتہ آخری عمر تک استوار رہا اور یہیں آپ کا انتقال ہوا۔ تامل ناڈو کے اردو ادب کا یہ بڑا المیہ ہے کہ دانش فرازی زندگی بھر معاشی پریشانیوں کا شکار رہے اور انھیں اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کے بھرپور اظہار اور استعمال کی کم ہی فرصت اور مہلت ملی۔ اس فرصت اور مہلت کا بھی بڑا حصہ انہوں نے تخلیقی کام پر کم اور نوجواں نسل کی تربیت پر زیادہ صرف کیا یہ ان کی اردو زبان و ادب سے بے پایاں محبت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

تامل ناڈو کی یہ عہد آفریں شخصیت 25 رجنوری 1981ء کو مدراس کے اردو ادب سے اپنا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توڑ گئی اور 26 رجنوری

1981ء کو آپ کی تدفین آمبور (شمالی آرکاٹ) کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

○

وہ گھن گرج تھی رات کہ جی بھر کے سو گیا
طوفاں اٹھا کے کیا کوئی کشتی ڈبو گیا

ہم عمر بھر جو رات کے آنگن میں بٹ گئے
سورج ہمارے دل میں کہیں دفن ہو گیا

میں پھر رہا تھا جام بکف میکدے کے پاس
مسجد کے زیرِ سایہ مرا قتل ہو گیا

شبنم تو شرمسار تھی پلکوں کی چھاؤں میں
شاید غمِ فراق ہی موتی پرو گیا

کہتے نہ تھے کہ بات ہماری بھی مان لو
بن دیکھے جھڑتے پتوں کا موسم بھی سو گیا

وہ لمحہ جس کے قرب میں جسموں کی آنچ ہے
پوچھوں یہ کس سے کونسی وادی میں کھو گیا

دانش اسی کا نقشِ کفِ پا ہے تا اُفق
اک بھیگی بھیگی رات کو ٹھکرا کے جو گیا

پگھلتے خواب کے ملبے میں دب گئے ہیں لوگ
کسی صدا کے بغیر آج چیختے ہیں لوگ

تمھارے در سے بچھڑنے کا فیض ہے شاید
مجھے قریب سے پہچاننے لگے ہیں لوگ

قدم قدم پہ ہے بے چہرگی کی دھند محیط
خدا ہی جانے کہاں کس کو ڈھونڈتے ہیں لوگ

کہیں رواں ہیں اُجالوں کا ہاتھ تھامے ہوئے
کہیں چراغ کی مانند بجھ گئے ہیں لوگ

بجھا وجود کا سیال آتشیں لاوا
پگھلتے برف کی وادی میں کانپتے ہیں لوگ

انھیں سنبھال کے مرکز پہ کون لائے گا!
جو بے سبب کئی خانوں میں بٹ گئے ہیں لوگ

زمانہ تہمتِ بے جا سے کام لیتا ہے
خود اپنی آگ کے شعلوں میں جل بجھے ہیں لوگ

کسی کلیم کے ادراک کی مدد کے بغیر
فرازِ طور سے دانش کو پوچھتے ہیں لوگ

مرے مزاج سے واقف جو تھا وہ پھر سے ملا
قریب پل کے اسے دور ڈھونڈنے نکلا

وہ بھیگی رُت کا ترشح وہ پو پھٹے کی فضا
تمام جسم کو شعلوں نے آ کے گھیر لیا

نشہ عجیب ترے لمس کا تھا مجھ پہ محیط
ترا وجود مگر پھر بھی زہر لگتا تھا!

اُداس چھاؤں کو دیکھا ہے پانچ سال کے بعد
مگر جو مجھ سے ملا تھا اسی سے مل نہ سکا

بھٹک کے ابر کا ٹکڑا کوئی ادھر آئے
سلگ رہا ہے کئی دن سے پیاس کا صحرا

نکل سکی نہ ہوا کی گرفت سے خوشبو — ملا نہ شیوۂ آوارگی سے چھٹکارا
صریرِ خامہ سے دل کی نوا ہے ہم آہنگ
سکوتِ شب میں قلم بولتا ہے دانشؔ کا

تجھ سے نکلا نہ مرے دیدۂ تر سے نکلا — کب خدنگِ نگہِ ناز جگر سے نکلا
صاف جب تک نہ کھلا زلفِ گرہ گیر کا پیچ — نالۂ شوق کہاں دامِ اثر سے نکلا
ناوک انداز نہ تھا کوئی سرِ محفلِ ناز — جانے پھر اتنا لہو کیسے جگر سے نکلا
شرم کی بات تھی، چپ رہ گئے کہتے کس سے — رہزنِ صبر و سکوں اپنے ہی گھر سے نکلا
ساز خود چھڑ گئے، خود آپ فروزاں تھے چراغ — پیکرِ حسنِ جہانتاب جدھر سے نکلا
نہ ترا غمزۂ خوں ریز ہی چھوٹا تجھ سے — نہ یہ سودائے محبت مرے سر سے نکلا
ابر سے جس کی توقع تھی جنابِ دانشؔ
کام آخر وہ مرے دیدۂ تر سے نکلا

درد کی تہ میں ہے وہ کیف کہ راحت کہیے — غم کی آنکھوں میں ہے وہ لو کہ مسرت کہیے
زخم کو پھول تو آنسو کو گہر، درد کو دل — دل کی روداد بہ آئینِ حکایت کہیے
لائیے اہلِ محبت کو سرِ مقتلِ ناز — ورنہ ہر شوق کو توہینِ محبت کہیے
زندہ رہتے ہیں بہ ایں تلخیٔ اندوہ وفا — عمر بھر جتنی ملے اس کو غنیمت کہیے
خوگرِ ضبط اگر دل کو بنائے نہ بنے — آنکھ تر ہو تو اسے اشکِ مسرت کہیے
آپ سے وعدہ وفا ہو نہ سکے گا لیکن
کچھ تو دانشؔ سے بہ آئینِ مروت کہیے

دنیا جو نہیں ساتھ نہ ہو یار تو ہوگا — قاتل وہ ہمیشہ سے طرحدار تو ہوگا
اس غم کی کڑی دھوپ میں ٹھہریں گے کہاں ہم — کچھ دور چلیں، سایۂ دیوار تو ہوگا
آؤ انھیں ہاتھوں سے چٹانوں کو نچوڑیں — کم دیدۂ کہیں دامنِ کہسار تو ہوگا
کیوں قتل سے دہشت ہو شہیدانِ وفا کو — ظالم سرِ مقتل تیرا دیدار تو ہوگا
وہ قیس ہو، وامق ہو کہ فرہاد ہو دانشؔ
اس جنسِ محبت کا خریدار تو ہوگا

تم نے پھر مسکرا کے دیکھا ہے
ورنہ دل کیوں مرا دھڑکتا ہے

شوخیِ نقشِ پا پہ مرتا ہوں
کیا غرض اس سے کون گذرا ہے

چڑھتے سورج کا جلوۂ صد رنگ
تیری آنکھوں میں ہم نے دیکھا ہے

کوئی نغمہ ہو کوئی لے، کوئی راگ
تیری آواز ہی کا دھوکا ہے

رگِ جاں پر تھرک رہی ہے کرن
اس نے یوں مسکرا کے دیکھا ہے

یوں تو آنے کو ہر اک چیز مقابل آئی
ایک تو تیرے تبسم کی سوئے دل آئی

بے خبر اتنی کہ ہم دیر و حرم سے گذرے
کون جانے کہ کہاں عشق کی منزل آئی

جب بھی اربابِ زمانہ سے ہوئے ہیں مایوس
کام آخر وہی سفاکیِ قاتل آئی

چاندنی یوں ترے رخسار سے اتری شبِ غم
صبح کی پہلی کرن جیسے سوئے دل آئی

کتنی صدیوں سے گذرتا ہوا آیا دانش
اک تری شکل کئی بار مقابل آئی

کہتا ہوں ایسی بات کہ نا معتبر سی ہے
حدِ نظر سے دور کوئی رہگذر سی ہے

شعلے لپک کے حلقۂ در تک پہنچ گئے
زنداں کی سرد رات ابھی بے خبر سی ہے

ساتھی شبِ دراز سے مایوس ہو گئے
مجھ کو زہے نصیب امیدِ سحر سی ہے

چپکے سے کون خندہ بہ لب یوں گذر گیا
پھر کہکشاں کی راہ میں گردِ سفر سی ہے

دانش نہ جانے اور بھی لٹتے ہیں کیا یہاں
دیکھو تو کوئی چیز متاعِ ہنر سی ہے

یہی دل کی داستاں ہے یہی شوق کا فسانہ
تو بچھڑ گیا جہاں سے وہیں رک گیا زمانہ

میں وہ شاخِ برق دیدہ کہ خزاں بھی جس کو روئے
نہ بہارِ لالہ و گل، نہ فضائے آشیانہ

مجھے عذرِ زخمِ دل کیا تو کہے تو مسکرا دوں
مگر اب بھی خوف یہ ہے کہ نہ رو پڑے زمانہ

میرا شیوۂ تغافل مجھے دے مئے شبانہ
میں سمجھ نہیں سکوں گا کبھی حسن کا بہانہ

تجھے فکر کیوں ہے دانش یہی رسمِ انجمن ہے
میں خزاں کا ذکر چھیڑوں، تو بہار کا ترانہ

آبرو اپنی اگر جاتی ہے
زلف تو ان کی سنور جاتی ہے

کس کو معلوم کہ یہ موجِ بلا — بے خبر اٹھ کے کدھر جاتی ہے
ہم کہاں جاتے سوئے منزلِ شوق — سنتے ہیں گردِ سفر جاتی ہے
گونج اٹھ اٹھ کے فصیلِ شب سے — تا بہ دیوارِ سحر جاتی ہے
بار ہا چھیڑئے کیوں ذکرِ وفا — ان کی صورت ہی اتر جاتی ہے
جان جائے تو بلا سے دانشؔ
کتنی مشکل سے نکھر جاتی ہے

جلاؤں ایک چراغ اور تیری محفل میں — کہ جس کا جلوۂ صد رنگ ہے ہر اک دل میں
مسافرانِ رہِ عشق تیز گام سہی — مگر ٹھہرے گئے ہیں جنوں کی منزل میں
کسی کے قتل کو صدیاں گذر گئیں لیکن — لہو کا رنگ ابھی تک ہے دستِ قاتل میں
ابھی وہ میرے لبِ آرزو کو چھو نہ سکا — چھپا ہوا جو تبسم ہے پردۂ دل میں
بہت تھے ہم میں عیوب برہنگی دانشؔ
کہ جب تو تیغ بھی عریاں ہے دستِ قاتل میں

گلوں میں رنگِ شکستِ خزاں سے آیا ہے — افق کی سمت اجالا دھواں سے آیا ہے
نگاہِ شوق سے اوجھل سہی دیارِ عدم — مگر یہ رہروِ ہستی کہاں سے آیا ہے
بلند ہو کے بھی حدِ نظر ہے چرخِ کبود — اگر یہ سچ ہے تو کون آسماں سے آیا ہے
نہ چھیڑو دشت نوردی کی بات ہم نفسو — ابھی بچھڑ کے کوئی کارواں سے آیا ہے
اسے تلاشِ خدا تھی، خدا ملا ہوگا
یہ سرد ناز جو شہرِ بتاں سے آیا ہے

اداس کنج میں مانگے کی روشنی کی طرح — خود اپنے گھر میں ہیں برسوں سے اجنبی کی طرح
جنوں بمنزلۂ آگہی ہے کیا کہئے — شرابِ معرفتِ فن کو بے خودی کی طرح
قسم خدا کی غنیمت ہے رنجِ محرومی — نہ آؤ بھیس بدلتی ہوئی خوشی کی طرح
فصیلِ شب پہ کبھی اک چراغ روشن تھا — کہ وہ بھی صبحِ بیاباں کی تیرگی کی طرح
ملا جو غم بھی وہ غم کی طرح ملا دانشؔ
مگر خوشی نہ میسر ہوئی خوشی کی طرح

کھوئے گئے ہم ایسے کہ ملتا نہیں سراغ — کب اس اندھیری رات میں لو دے اٹھے گا داغ
کھلنے لگے ہیں داغِ عیوب برہنگی — واللہ جب سے عرش پہ ہے آپ کا دماغ
ممکن نہیں کہ دیکھ سکے آنکھ سوئے گل — اور اس پہ سیر باغ سے دنیا ہے باغ باغ
کیوں کر نہ اہلِ دل میں ہمارا بھی ہو شمار — دل کی جگہ ہے آج کئی حسرتوں کا داغ
اک شمع وہ بھی حلقہ بگوشِ شبِ فراق — اور حکم ہے کہ اس کو کہوں لعلِ شب چراغ

دانشؔ دکن کا شاعرِ آتش نوا سہی
خالی مگر ہے آتشِ سیّال سے ایاغ

کچھ تو اظہارِ غم وسوزِ نہاں ہونا تھا — دل کو ہر رنگ میں مصروفِ فغاں ہونا تھا
زندگی لے کے کہیں آئی تو ہے آخرِ کار — اب یہ معلوم نہیں ہم کو کہاں ہونا تھا
ہے وہی خاک کے پردے میں ازل سے جس کو — بوئے گل، نالۂ دل، جوئے رواں ہونا تھا
دل ابھی عمرِ گذشتہ پہ لہو روتا ہے — ہم نے کب تجھ سے یہ چاہا کہ جواں ہونا تھا
تنگِ سجدہ ہے اگر آج ترا ذوقِ جبیں — کسی دہلیز کا اک سنگ گراں ہونا تھا
مختصر سا وہ فسانہ تھا غمِ ہستی کا — جس کو شرمندۂ الفاظ و بیاں ہونا تھا

ہے بجا ناز کہ ہم اہلِ دکن ہیں دانشؔ
اور ہوں گے وہ جنہیں اہلِ زباں ہونا تھا

قطعات:-

۱

اب غسل کو صہبائے کہن لے آؤ
کافور نہیں، خاکِ چمن لے آؤ
اک رند نے مے خانے میں دم توڑا
انگور کے پتوں کا کفن لے آؤ

۲

ہوتی ہے شب و روز مصائب سے جنگ
پھیلائیں کہاں پاؤں کہ چادر ہے تنگ
لہراتے ہیں ہر گام اجل کے سائے
بڑھتی ہے مگر اور بھی جینے کی اُمنگ

۳

لہو خرید کے بھیجو شراب خانوں کو
وہاں تو جام میں اک بوند بھی شراب نہیں
ہمارا گھر ہی جلاؤ کہ روشنی ہو جائے
اندھیری رات ہے گردوں پہ ماہتاب نہیں

نظمیں

آدمی

دشت در دشت سرگشتۂ جہل تھا
صیدِ نا آگہی
آخرِ کار اجلاسِ فطرت ہوا
سب مظاہر نے باہم کیا مشورہ
ہو گیا فیصلہ
کھول دی جائے آدم پر اسرار کی ہر گرہ
پھر ہوا یہ کہ
دشت و دمن، بحر و کہسار و سنگ و شجر
چیر کر سینہ اپنا دکھاتے چلے
بے محابا خزانے لٹاتے چلے
اس کو آدابِ ہستی سکھاتے چلے
محرمِ رازہائے دروں بن سکے
یہ بہ ہر نوع صاحب جنوں بن سکے

غیر مرئی وہ قوت
جو ہے عالم عالم محیط
وہ مظاہر کی آواز، خوشبو، تپش، رونمائی کی ضامن بھی ہے
وہ ازل اور ابد، ابتدا انتہا، درمیانی تناظر سے بھی ماورا
بطن در بطن ہے اس کی اک سیمیائی نمود
اس سے ہوتی ہے تعمیرِ ذاتِ شہود

ذات

جوہر ہے
اسمار کے اعراف سے بے نیاز
موت اخراجِ جوہر بہ اجسامِ ناسوت ہے

زمیں کی سمت جھک رہا ہے آسماں
افق افق ہیں لکہ ہائے ابر آنسوؤں سے تر
مگر زمیں ہے تشنہ لب
نہ بادۂ عنب
نہ کوئی جامِ ارغواں
بھرے بھرے جہاں میں
خلار کا زہر گھل رہا ہے بوند بوند
یہ سوچتی ہے کائنات
دھوئیں کی تہ بہ تہ فضا ہے کیسی گہری دھند ہے
میں کیوں نہ مہرِ ضوفشاں کے آئینے کو توڑ دوں

سارے اجرامِ گنبدِ بے در
چاہتے تھے یہی بہ ذوقِ لطیف
ہر طرح آدم ان کا ہو جائے
آدم اس فکر میں کدھر جائے

ایک تنہا زمین جو چپ تھی
سادگی اس کی جب پسند آئی
زینہ زینہ اتر کے آدم نے اس کی بانہوں میں ڈال دی بانہیں
کوہساروں کے لب پہ پھول کھلے جگمگانے لگیں حسیں راہیں
آدمِ آغاز کا وہ سادہ ورق
جس میں مبہم سی کچھ لکیریں تھیں
جسم اس کا تھا ننگ پیراہن

○

بھرے بازار سے گذرو تو دیکھو
دکانیں کتنی بوجھل، زخم خوردہ آرزوؤں سے سجی ہیں
روپہلے ان گنت خوابوں کا یخ بستہ لہو
کس کس جگہ کب سے بہا ہے ؟
کہاں بکتے ہوئے حسّاس ضمیروں کی مہکتی مسکراتی منڈیاں ہیں
بھرے بازار سے گذرو تو دیکھو
لپکتے، دوڑتے چہروں کے پیچھے
کہاں تک ساتھ دیتے ہیں اُجالے
کہاں پر روشنی دم توڑتی ہے
کہاں کھلتا ہے شب کا وہ دریچہ
کہ جس سے جھانک لیتا ہے اندھیرا — !

○

ذہن کے صحرا میں آوازوں کے اُڑتے ہیں پرند
تھک گیا ہوں سوچ کے لانبے سفر کی دھوپ سے
ڈھونڈتا ہوں اک درختِ سایہ دار
تاکہ اس کی چھاؤں میں کچھ دیر ٹھہروں
اور
پھر آگے بڑھوں — !
سوچ کے لانبے سفر میں دور تک کوئی نہیں
میرے سوا
ہاں کبھی ہلکا سا ہوتا ہے گماں
چند سائے دوش پر خوابوں کا پشتارہ لئے
آج بھی میرے تعاقب میں ہیں آہٹ کے بغیر
سوچتا ہوں
میں بھی اپنے خول سے نکلوں اگر
دو قدم چل کر انھیں سایوں میں گم ہو جاؤں گا
جانے کہاں کھو جاؤں گا !

○

چل دور کسی کاشانے میں اک دلکش گیت سناؤں گا
وہ گیت کہ جس کے سینے میں صدیوں کی آگ سلگتی ہے
وہ آگ کہ جس کے شعلوں میں تپتی ہے اگر شعلوں کی خودی
تابندہ گہر بن جاتی ہے
وہ گیت کہ
جس سے صبحِ ازل اسرارِ ابد کی نرم لویں
آفاق کے دل میں اتری تھیں
چٹکی تھیں اُجالوں کی کلیاں
لچکی تھی کمانِ قوسِ قزح
چھلکا تھا سبوئے رنگِ شفق
اس گیت کو ایک فرشتہ نے

اک روز یونہی انجانے میں
حوروں کے لب سے چرایا ہے ۔

ناقۂ وقت تھا
پیش افتادۂ برق ورہوارِ باد
بے نیازِ مکافاتِ کون وفساد
رات تھی
صبح کا منتظر کوئی راہی نہ تھا
پھول تھے
پیکرِ شیوۂ خیر خواہی نہ تھا ۔

بدلتے موسم کا جب سے میں نے مزاج سمجھا
یہ سوچتا ہوں کہ اپنے احساس کے دریچے کو بند کردوں
کسی سے کچھ دیر کے لیئے مانگ لوں
کوئی مسکراتا چہرہ
خلوص کے پیرہن کی تہ میں
میں کرب کی آگ کو چھپالوں
مگر یہ اندیشہ مجھ سے آہستہ کہہ رہا ہے
دھواں اٹھے گا تو کیا کروگے ؟

تیرے ترشے ہوئے لب ، لب نہیں
بوسوں کا جم
لذتِ لمس سے ہر عضو گرہ کھولے ہے
تو ہے خاموش مگر جسم ترا بولے ہے

ہم کتنے اجنبی سے لگتے ہیں ہمارے درمیاں کتنی دیواریں
حائل ہیں —— لیکن
جسموں کے یہ اونچے ، افق کو چھونے والے زرد آبنوسی
قرمزی ، سیاہ ، شاداب وسفید پہاڑ جب ٹوٹ کر
ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جائیں گے
انجانے خلاؤں میں ہم ایک ناقابلِ تقسیم اکائی بن جائیں گے !

وہ ایک لمحہ جو ہر بدلتے سمے کا باغی ہے
مجھ میں تحلیل ہوگیا ہے
میں اپنی نوکِ قلم کی آواز سن رہا ہوں
گلی میں کچھ شور ہو رہا ہے —— !

جن لوگوں کے ذہنی افق پر گھپ اندھیرا ہے
وہ روشنی کی جستجو میں صبح کی بجائے رات کا سفر
اختیار کرتے ہیں

○ "اور راوی نے کہا"

(طویل نظم کا ایک باب)

عجب حیرت کا عالم اس سمے تھا
یہی سب سوچتے تھے مختلف لہجے میں یہ آوازیں کیسی ہیں
کہاں سے یہ ابھرتی ہیں
مگر اس بات سے سب مطمئن تھے
کہ راوی مطمئن ہے
ابھی ہونٹوں کو جنبش ہوگی اور اسرار کی کلیاں
کھلیں گی، نور کا چشمہ بہے گا پھول برسیں گے
مگر راوی یونہی چپ تھا
کہ اتنے میں اُدھر کچھ فاصلے پر پیڑ اک جلنے لگا
چنگاریاں لپکیں
دھوئیں کے ان گنت مرغولے راوی کی طرف بڑھنے لگے
لیکن
جواں راوی کی آنکھوں کی لوئیں بجھنے نہیں پائیں
یونہی وہ مطمئن تھا
پھر سراپا پُرسکوں لہجے میں یوں گویا ہوا۔
لوگو!
تمھارے انتشارِ ذہن کا، حیرت کا گہری سوچ کا احساس ہے مجھ کو
مجھے معلوم ہے تم کس قدر بے تاب ہو، وحشت زدہ ہو دل گرفتہ ہو
تمھارے دل کی دھڑکن سن رہا ہوں
سنو!
یہ پیڑ جو جلتا ہے اپنی آگ کے شعلوں میں جلتا ہے

کبھی اس کے گھنے سائے میں تنہا کوئی روتا تھا
مچلتی تھیں یہاں آٹھوں پہر نروان کی لہریں
سمندر پار اس سائے سے اک دن روشنی پہنچی
کبھی اس نے سوچا تھا
کہ دکھ کے ناگ پھن پھیلائے جو روحوں کو ڈستے ہیں
جواں جسموں کی لذت کے تقاضوں کا نتیجہ ہے
نتیجہ ہے یہ اُس جذبے کا
جس کی تہ میں لاکھوں خواہشیں ہیں، ان گنت ارمان ہیں، قاتل امنگیں ہیں
کوئی خواہش بری ہوتی نہیں لیکن
توازن کی کمی سے نت نئے فتنے ابھرتے ہیں
ابھی جو مختلف سمتوں سے یہ آوازیں اٹھی ہیں
یہ آوازیں تو ہر اک دور میں اٹھتی رہی ہیں
ہر زمانے میں
ان آوازوں کے پیچھے ایک ایسا ذہن ملتا ہے
جو اکثر سوچتا ہے
جہانِ انفس و آفاق میں
پنہائے عالم میں
مقامِ کبریا کیا ہے
نہ جانے یہ کہاں تک سچ ہے لیکن کوئی کہتا تھا
خدا، انسان، تاریخ و مذہب سب اضافی ہیں
مگر جو اصل ہے وہ قوتِ مطلق ہے
اک انمٹ اکائی ہے

○ "ایک کہانی"

خوشی اور خداوند کی جستجو میں
کہ اب سے بہت پہلے صدیوں سے آگے
کوئی عنکبوتِ تخیّل کے تاروں سے دن رات اک جال سا بُن رہا تھا
مگر ساتھ یہ بھی تو وہ سوچتا تھا
خداوندِ عالم اگر دامِ تخیّل میں صید ہو جائے پھر کیا رہے گا
اگر شاخِ سدرہ سے آگے
کہیں غیر مرئی فضا میں کسی عرش پر جس کی چاروں طرف
نور کا دائرہ ہے
وہ میری ہی مانند بیٹھا رہے گا
تو پھر مجھ میں اور اس میں کیا فرق ہے
میں بھی اک تختِ سیمیں پہ بیٹھا ہوا ہوں
یونہی سوچتے سوچتے سوگیا وہ
مگر جب کھلی آنکھ تو اس نے دیکھا
منڈیروں پہ سورج کی زر کار کرنیں تھرکنے لگی ہیں
وہ پودا جسے اُس نے آنگن میں بُویا تھا
دیوار کو بڑھ کے چھونے لگا ہے
وہ بچے جنہیں اس نے پہروں پُراسرار قصے سنائے
اب ان کی نگاہوں میں بیتی ہوئی رات کی اک کہانی
کئی ان کہے بھید بتلا رہی ہے
مگر اس کو حیرت تو اس بات پر تھی
اسی کی طرح وقت کے برق پا قافلے کو
کوئی روک کر پوچھتا ہے
مجھے بھی خوشی اور خداوند کی جستجو ہے

کسی دامنِ کوہ میں، دشتِ خاموش کے گوشۂ عافیت میں
اگر تونے دیکھی ہیں دونوں کی پرچھائیاں بھی
مجھے تو بتادے!
مگر وہ کوئی بات سننے سے پہلے
اسی کی طرح سو گیا!

عبدالرؤف رازی آمبوری

اے۔ عبدالروف رازی آمبوری حضرت دانش فرازی کے ہم عصر شاعر، انگریزی زبان کے مشہور صحافی آمبور میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ادارت میں مدراس سے ہفت روزہ دکن ٹائمز Deccan Times برسوں شائع ہوتا رہا۔ جب دہلی سے انگریزی ہفت روزہ Radiance شائع ہونا شروع ہوا تو بطور خاص آپ کو دہلی والوں نے مدعو کیا اور مدیر کے فرائض سونپ دئے۔ عارضۂ قلب کی وجہ سے مختصر سی مدت کے بعد آپ نے۔ جریدے کی ادارت سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

علامہ شاکر نائطی کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے بعد آپ نے اردو شاعری شروع کی۔ آپ کی بھرپور صحافتی استعداد کی صحیح

قدر دانی مدراس کے ماحول میں نہیں ہوئی۔ افسوس ہے کہ مسلسل کوشش کے باوجود آپ کی تاریخ پیدائش نہ معلوم ہوسکی۔

صحافتی دنیا میں اور عام طور پر بھی آپ اے اے رؤف کے نام سے مشہور تھے

آپ نے 23 / اگست 1975ء بہ مقام آمبور انتقال فرمایا۔

کیا کہوں کس سے کہوں کیونکر کہوں؟ — مہر لب پر بے قراری دل میں ہے
پھول کی پتی سے بھی نازک ہیں وہ — قوت فولاد لیکن دل میں ہے
کیا کہیں رازی جہاں سے چل بسا — شورِ ماتم یار کی محفل میں ہے

محبوب پاشاہ محبوب

محبوب پاشاہ محبوبؔ حضرت تجمل الحسن ایمانؔ گوپاموی کے خلف الرشید 1922ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ کی شاعری موروثی ہے۔ غزل آپ کی محبوب صنف ہے اور اس نگارِ شوخ و شنگ کی ناز برداری اور دل دہی میں آپ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے۔ آپ کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ آپ غزل میں امیرؔ اور داغؔ کے مکتبِ خیال سے وابستہ ہیں۔ سلاست، سادگی اور دلآویزی آپ کے کلام کی خصوصیت ہے۔

آپ کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ سرمایہ دار نوجوانوں

کی ذہنی تربیت میں آپ نے اپنے درس وتدریس کے دور میں نہایت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ جسے یہاں کی نوجوان نسل کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

آپ کا شعری مجموعہ "متاعِ محبوب" 1982ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔

○

ہے نغمہ ریز اک بُتِ طناز دیکھنا
مسحور کائنات ہے آواز دیکھنا

پردے تعینات کے اٹھتے ہی جائیں گے
میرے جنونِ شوق کا اعجاز دیکھنا

محبوبؔ خستہ حال پریشاں تھا یاد ہے
اور آج ہو رہا ہے سرافراز دیکھنا

○

پھر ہم کو زندگی کے ستم یاد آگئے
پھر التفاتِ اہلِ کرم یاد آگئے

شاید قریب آہی گئی منزلِ حیات
"عمرِ رواں کے نقشِ قدم یاد آگئے"

محبوبؔ کہہ رہی ہیں اِدھر دل کی دھڑکنیں
پھر آج اُن کو بھولے سے ہم یاد آگئے

○

نزولِ شعر کے لمحے عجیب ہوتے ہیں
کہ جیسے آپ ہمارے قریب ہوتے ہیں

گلوں سے پہلے رسائی ہے اُن کے دامن تک
کھٹکنے والے بھی کیا خوش نصیب ہوتے ہیں

وہ دیکھو دور سرِ شام رو رہا ہے کوئی
یہ اشکِ غم شبِ غم کے نقیب ہوتے ہیں

عبدالحلیم قدسی

ابوتراب محمد عبدالحلیم قدسی عمری پرنام پیٹ (شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے۔ جامعۂ دارالسلام، عمرآباد کے فارغ تھے۔ عربی، فارسی اور اردو میں ملکہ حاصل تھا۔ شاعری میں علامہ شاکر نائطی سے استفادہ کیا تھا۔ بیک وقت تینوں زبانوں پر قدرت حاصل

ہونے کی وجہ سے آپ کے کلام میں زبان وبیان کا حسن، اسلوب کی کوشش اور اظہار کی لطافت ہر جگہ موجود ہے ۔ قدسی مولوی فرود تھے لیکن آپ کی تخلیقات میں سرشاری کے وہ عناصر پائے جاتے ہیں جن سے وجدان جھوم اٹھتا ہے
1982ء میں آپ جان بحق ہوئے ۔

○

خوف کیا ہے عشق میں گر زندگی برباد ہو ۔۔۔ کیا بھروسا اس کا جو خود ہی فنا بنیاد ہو
کس طرح سے زندگی کی راہ ہو سکتی ہے طے ۔۔۔ چارہ گر اجب ہر قدم پر اک نئی افتاد ہو
سرمۂ چشم فلک بن جاؤں گا قدسی ضرور ۔۔۔ خاکساری میں اگر مٹی مری برباد ہو

○

• ہاں ! اپنے گوشِ دل سے سُن لو قدسی ۔۔۔ یہ راز کسی سے بھی نہیں ہے مخفی
چو سا ہوا مشرق کے جگر کا ہے لہو ۔۔۔ رخسار پہ مغرب کے جو جھلکی سُرخی!

• وہ دن نہ رہا نہ وہ رات رہی ۔۔۔ اگلی سی نہ جینے میں مرے بات رہی
جب سے کہ نگاہ پھیر لی ہے اُس نے ۔۔۔ آنکھوں میں نہ میری کائنات رہی۔

بشیر احمد قابل

محمد بشیر احمد قابل وانمباڑی کے کہنہ مشق شاعر ہیں اگرچہ حلیہ سے شاعر کم تاجر زیادہ معلوم ہوتے ہیں ۔ آپ کے کلام میں تخریبی عوامل کے خلاف طنز و مزاح کا جو لطیف امتزاج ملتا ہے وہ دامن کش دل ہے ۔ آپ کی خود دار شخصیت کی چھاپ آپ کی تخلیقات میں بھی نظر آتی ہے ۔ آپ بڑے زندہ دل، خوش گو اور خوش مزاج ہیں ۔ جب بھی ملتے ہیں تبسم بلب ملتے ہیں ۔ شاعری میں اُن کا اپنا ایک خاص رنگ ہے۔

تحت اللفظ غزل پڑھتے ہوئے مشاعرے کے سامعین کو چونکا دیتے ہیں۔ کہنہ مشقی کے باوجود آپ کے کلام کا سرمایہ نہ ہونے کے برابر ہے لیکن جو کچھ بھی ہے اُس سے اُن کے مزاج کو سمجھنے میں ایک محقق کو بڑی مدد ملتی ہے۔

○

بس اتنا جانتا ہوں شیخ یار سا تو نہیں
خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یہ سنا تو نہیں

گناہ گار ہیں جنت میں نیک دوزخ میں
کہیں خلوص وعقیدت کی یہ سزا تو نہیں

دھواں کے دوش پہ جو سوختہ جنازہ ہے
کسی کے گھر سے اٹھا ہے یہ آپ کا تو نہیں

سحر کی گود میں نیند آگئی ستاروں کو
ہمارے خواب پریشان کہیں خفا تو نہیں

○

یوسف خواہاں

محمد یوسف خان فرزندِ لعل خان 22ر دسمبر 1922ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ اردو شاعری کی بسم اللہ اپنے ماموں ذکی شان سے پڑھی یعنی فضل الحسن منظور صدیقی کی صحبتوں سے بھی فیضیاب ہوئے۔ حضرت شاداں وشارمی سے بھی بعض غزلوں پر اصلاحیں لیں - 1958ء میں حضرت دانش فرازی کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہونے کے بعد ان کے شعری ذوق کے اُفق پر ایک نئی شفق پھوٹی اور اس شفق کی سُرخیاں قطعات کے روپ میں منظرِ عام پر آکر آج بھی ان کے نام کو روشن کر رہی ہیں۔ آپ نے تامل ناڈو کے شعری ادب میں قطعات کے فن کو بہت زیادہ فروغ

دیا۔ بے پناہ مصروفیات کے باوجود شعر سے فطری وابستگی نے آپ کو بہت آگے بڑھایا اور آج بھی آپ کے تخلیقی عمل میں تھکن کے آثار نہیں پیدا ہوئے آپ اگرچہ کم کہتے ہیں لیکن اچھا کہتے ہیں. عصری رجحانات سے ناآگہی کے باوجود لاشعوری طور پر آپ کی تخلیقات میں سماج کے ضمیر کی صدائے بازگشت کہیں کہیں سنائی دیتی ہے۔ آپ کی شاعری کے تانے بانے بھی جمالیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں تغزل کی وہ بھرپور کیفیت ملتی ہے جو آپ کو آپ کی شخصیت سے بھی بہت اونچا اٹھاتی ہے۔

قسم خدا کی تمہارا جواب کیا ہوگا
کہیں یہ حسن یہ رنگِ شباب کیا ہوگا

گلوں سے چاند سے، تاروں سے ان کو کیا نسبت
جو لاجواب ہیں اُن کا جواب کیا ہوگا

یہ بھیگی بھیگی سی راتیں، یہ چاندنی یہ فضا
بڑھے جو حد سے مرا اضطراب کیا ہوگا

حیات سر بہ گریباں ہے عشق خاک بسر
اب اس سے بڑھ کے کوئی انقلاب کیا ہوگا

یہ آبرو یہ بزرگی خدا نے بخشی ہے
تمہارے ہاتھوں سے خواہاں خراب کیا ہوگا

مخدوم اشرف

حکیم مخدوم اشرف بہ مقام میلاپور مدراس 23ر فروری 1923ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حکیم محمد عبدالوہاب مدراس کے مشہور و معروف حکیموں میں سے ایک تھے۔ فنِ حکمت آپ کو ورثہ میں ملا ہے۔ آپ نے شاعری کا آغاز 1968ء میں کیا۔ کئی اساتذۂ فن کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ آپ کا رجحان بھی زیادہ تر غزل کی طرف ہے۔ صالح روایات کا احترام کرنے کے باوجود عصری رجحانات اور نئی قدروں کی آگہی سے بے نیاز نہیں ہیں۔ ان کی بعض تخلیقات میں کہیں کہیں لاشعوری طور پر جدیدیت کی چھاپ بھی ملتی ہے۔ آپ بہت مخلص ہیں اور یہی خلوص ان کی تخلیقات میں بھی کار فرما ہے۔ آپ نے اپنے احساسات اور جذبات کی ترجمانی میں ہمیشہ انصاف سے کام لیا ہے۔

○

کبھی آواز دیں پتے کبھی پتھر بولیں
شبِ غم اونگھتے سناٹے برابر بولیں

گھر ہو آباد صداؤں کا خموشی ٹوٹے
بات طوفان کی چلے گہرے سمندر بولیں

لنے کچھ بھی نہیں دیتی ترے قرب کی آنچ
ہونٹ کھلتے ہی نہیں کیسے سخنور بولیں

گردشِ ایام نے مارا ہم کو !
سخت حالات میں کیا فکر کے پیکر بولیں

چوٹ کھائیں تو کوئی بات بنے اے اشرف
بے اثر بات بھری بزم میں کیوں کر بولیں

○

ادیب بھارتی

اسداللہ بیگ ادیبؔ بھارتی 1923ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پتہ نہیں کہاں ہوئی لیکن مدرسۂ جارج ٹون ہائی اسکول، متیال پیٹ سے (S.S .L.C.) پاس کرنے کے بعد مدراس Coll- -ectors Office میں بحیثیت کلرک ملازم ہوئے۔ اور بعد میں (Revenue Inspector) بنے اور زندگی کی آخری سانسوں (1971ء) تک اسی عہدے پر فائز رہے۔

ادیبؔ بھارتی کو مرحوم لکھتے ہوئے خامہ خوں چکاں ہوتا ہے تو انگلیاں فگار۔ ادیبؔ ایک زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں حصولِ علم کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ ریاستی حکومت کے ایک اہم شعبہ کے افسر ہونے کے باوجود انہوں نے حق گوئی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا در اصل ادیبؔ شدّتِ احساس کے وہ زندہ، پائندہ اور ناقابلِ فراموش پیکر تھے جنہوں نے زندگی بھر اردو ادب کی خدمت کی، فن کے حق کو پہچانا اور اپنی تخلیقات کے آگے اپنے لہو کے ایک ایک قطرے کا حساب دیا۔

ادیبؔ بھارتی تامل ناڈو کا وہ پہلا فن کار تھا جس نے تند جذبات اور شدّتِ احساس کے ساتھ آزاد نظم کی صنف کو باوجود ہزار مخالفت اپنایا۔ ادیبؔ پہلے شاعر تھے اور بعد میں افسانہ نگار۔ اِن کے اندر جو افسانوی خصوصیات پنہاں تھیں وہ ان کی نظموں میں مترشح ہوئیں تھیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ انہوں نے اپنے مزاج کی افتاد اور اپنی طبیعت کے تقاضے کو پہچانا پھر افسانہ نگاری کی طرف اُس خطرناک حد تک توجہ دی کہ آخرکار افسانہ لکھتے لکھتے وہ خود ایک افسانہ بن گئے۔

جنوبی ہند میں نظم کا ماحول پیدا کرنے میں ادیب نے جد و جہد، لگن اور دلچسپی کا جو مظاہرہ کیا وہ کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔
ادیب بھارتی زندگی بھر ترقی پسند نظریات کے قائل تھے۔ ان کے شعری اور افسانوی تخلیقات میں اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے بھی زندگی ہی میں ایک افسانوی مجموعہ ترتیب دیا تھا جس پر حضرت راز امتیاز صاحب نے پیش لفظ بھی لکھا تھا۔ یہ مجموعہ کتابت کے مراحل بھی طے کر چکا تھا۔ لیکن جو سرمایہ طباعت کے لئے رکھا تھا وہ ان کی جان لیوا بیماری کی نذر ہوگیا۔ آخرکار 1971ء میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور سعید آباد مسجد، مدراس کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

ملہار

میں نے جس پیڑ کے سائے میں پناہیں لی تھیں
آج اسی پیڑ پہ پت جھڑ کے نشاں اونگھتے ہیں
اپنی دھن میں مگن، ساحلی بگلوں کی طرح
میری چاہ کی زنجیر گراں
بے وفا دوست کی سہمی ہوئی یادوں کی طرح
اُسی گاؤں کا بھولا ہوا بھگوان بن کر
آگ کھاتی ہوئی صدیوں کو صدا دیتی ہے
گنگناتی ہے تو
سناٹے پگھل جاتے ہیں
گونجتی ہے تو
دہل جاتے ہیں طوفان کے دل
روتی ہے تو
برسات کا دم گھٹتا ہے

• افسوس •

تیری مژگاں کے ہر اک تار سے — آنسو کے گہر
جھلملاتے ہوئے تاروں کی کہانی — کہہ کر
دامنِ چاہ، — ڈھل ڈھل کے
بکھر جاتے ہیں —
تیری یادوں کے سبک فام و سبک گام
سوار
تیری تنہائی میں، کعبہ کے مکینوں کی طرح

کتنی صدیوں سے جلاتے ہیں
تقدس کے چراغ —!!
کتنے گمنام سے راہی، تیری منزل کے قریب
دیدۂ شوق میں صد رنگ گلستاں لے کر
کتنی انجان سی راہوں سے گذرتے آئے
تیری منزل کا فسوں
اب بھی وہی ہے کہ جو تھا ——!!!

18-1-1963

اوج کشنگری

رفیع الدین اوج کشنگری بھی جامعۂ دارالسلام عمرآباد کے فارغ التحصیل ہیں ابتداء سے شاعری کی طرف آپ کا طبعی رجحان نمایاں تھا۔ رفتہ رفتہ آپ نے غزل کی مشاقی میں خاص انہماک اور لگن سے کام لیا سادگی اور پرکاری آپ کے تخلیقات کی اہم خصوصیت ہے اردو ادب کو آپ سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن وقت نے آپ کے ساتھ وفا نہیں کی-1975ء میں آپ نے اس دنیا سے مُنہ موڑلیا۔

نشانۂ ستم بے شمار ہو کے چلے
تمہاری بزم سے ہم دل فگار ہو کے چلے
جنونِ عشق سے حاصل ہوا وقار ہمیں
خرد کی زد میں جو آئے وہ خار ہو کے چلے
نہیں تھے ایک ہمیں ان بتوں پہ اوج فدا
کہ ان پہ شیخ و حرم بھی نثار ہو کے چلے

شیخ داؤد فانی

شیخ داؤد فانی ترچناپلی میں پیدا ہوئے۔ ترچناپلی کے ادب پرور ماحول میں ان کی علمی اور ذہنی تربیت ہوئی۔ سینٹ جوزف کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ سینئر کو آپریٹو انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہو کر اسی شعبہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔

آپ ترچناپلی کے اُن شعراء میں سے ہیں جن کے کلام میں تخیل کی رنگینی اور زبان کی لطافت پائی جاتی ہے۔ فانی کا سلجھا ہوا شعو اظہارِ غم سے گریز کرتے ہوئے نشاطِ غم کو ترجیح دیتا ہے۔

فانی کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اِن کا لہجہ جانا پہچانا ہے اور ان کی تخلیقات بے ساختگی کی حامل ہیں۔

○

کیا پوچھتے ہو رونقِ داغِ جگر یہاں
پر نور بزمِ عشق ہے شام و سحر یہاں

میرے چمن کے پختہ ارادوں کے سامنے
کچھ بھی نہیں ہے ہستیٔ برق و شرر یہاں

فانی یہ فیضِ جنبشِ دامانِ یار ہے
چلتی ہے گاہ گاہ جو بادِ سحر یہاں

○

عارف مدراسی

(فرزند خلیفہ محمد قاسم علی قادری وشاذلی مرحوم)

محمد محی الدین عارف بہ مقام مدراس 16، مارچ 1924ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدراس کارپوریشن اسکول سے حاصل کی۔ ٹیچر ٹریننگ کی سند حاصل کرنے کے بعد کارپوریشن اسکول میں مدرس کے عہدے پر مامور ہوئے۔ شعری محفلوں اور ادبی ہنگاموں میں آپ کی سرگرمیاں اس اعتبار سے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ آپ بڑے صاف گو اور سچائی پسند شخصیت کے مالک تھے۔ جہاں بھی شعری روایات اور زبان وبیان کے پیراہن کو مجروح ہوتے دیکھا وہاں مستند دلائل کی روشنی میں اپنے آپ سے باہر ہوکر لڑ بیٹھتے اور سامنے والے سے اپنا لوہا منوا کر دم لیتے۔ ان کی اس صاف گوئی نے بہتوں کے دل میں خاص جگہ پیدا کرلی تھی۔ یہاں تک مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد نے بھی ان کی بے وقت اور اچانک موت سے متاثر ہوکر کیا خوب کہا ہے۔ ؎

کیسے کڑیل جواں کو تاکا ہے
موت کو موت کیوں نہیں آتی

عارف کی جواں مرگی واقعی اردو ادب کے لئے نقصان سے کم نہیں چونکہ عارف نے اردو ادب کی خدمت کو اپنا فریضۂ زندگی نہیں سمجھا بلکہ ساری زندگی اس کے لئے وقف کردی۔ عارف کو زبان وبیان پر بھرپور عبور حاصل تھا۔ نثر ونظم پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ عارف نے ایک ماہنامہ "جلترنگ" مدراس سے جاری کیا جس سے

یہاں کی ادبی رفتار کا اندازہ ہوتا تھا۔ عارؔف صالح روایات کے پابند تھے۔ جدیدیت اور فطری رجحانات کو تخلیقی جامہ پہنانے کا تصور ان کے ذہن میں نہیں ابھرتا تھا۔ چونکہ تصوف سے عارؔف کا تعلق فطری نہیں بلکہ عملی تھا۔ عارف نے اپنے سرچشمۂ فیض سے کئی ابھرتے ہوئے نوجوانوں کو سیراب بھی کیا تھا۔ نئے لکھنے والوں میں اُمنگ پیدا کی۔ اردو ادب کو ان سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن موت نے عین عالمِ شباب میں عارف کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

عارؔف زود گو اور پُرگو بھی تھے۔ خدا جانے ان کی تخلیقات کے ذخیرے کا کیا حشر ہوا۔ حضرت علامہ شاکرؔ نائطی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ اور تصوف کے تعلق سے وہ علامہ کے مرید بھی تھے۔ علامہ سے عارؔف کو خاص عقیدت تھی۔ عارؔف نے اپنے شیخ سے صحیح طور پر استفادہ کیا اگر وہ زندہ ہوتے تو فن کی بلندیوں کو چھو لیتے لیکن پھر بھی انہوں نے یادوں کے وہ نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔

تلخیٔ گردشِ دوراں سے ہم آغوش نہیں ۔۔۔ زندگی میری ترے غم سے سبکدوش نہیں
شورشِ دہر بھلا مجھ پہ اثر کیا ڈالے! ۔۔۔ سیرِ افلاک مری سیر کی ہمدوش نہیں
لاکھ پردوں میں چھپائی گئی ہستی اپنی ۔۔۔ تیری تصویر مری آنکھوں سے روپوش نہیں
گرمیٔ عشق سے گمنام سی جل جاتی ہے ۔۔۔ کیا مری ہستیٔ دل شعلہ در آغوش نہیں

خود ہی تنگ ظرفی سے محدودِ کرم ہے عارؔف
کیا کرے رند کو ساقی کہ بلانوش نہیں

ہوش آیا ہے چوٹ کھانے سے　　بات کرتا ہوں اب ٹھکانے سے
جرأتِ عشق ہے وہی اب تک　　کون ڈرتا ہے اس زمانے سے
جب کہ بدلی ہے نیتِ ساقی　　لطف کیا بدلیوں کے چھانے سے
درد کی داستاں سنے گا کون　　مٹ گئی الفت اب زمانے سے
جب حقیقت ہی چھپ گئی عارفؔ
کیا ملے گا ہمیں فسانے سے

اب کہاں تیرا سہارا ہے مجھے　　زندگی یوں بھی گوارا ہے مجھے
چھوڑ دے اے غمِ دوراں مجھ کو　　غمِ جاناں نے پکارا ہے مجھے
زندگی نذرِ حوادث ہے مگر　　اپنی ہمت کا سہارا ہے مجھے
دشت میں اڑتی ہوئی دھول سہی　　جوشِ وحشت نے نکھارا ہے مجھے
فکرِ ساحل نے ڈبویا عارفؔ
تندِ طوفاں نے ابھارا ہے مجھے

رشید الدین امجد مدراسی

رشید الدین امجد بہ مقام مدراس 15ر اگست 1924ء کو پیدا ہوئے۔ آپ مدراس کے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعروں میں سے تھے۔ غزل میں روایات کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مدراس کے کئی کارپوریشن اسکولس میں مدرس کے فرائض انجام دیئے۔ وظیفہ یاب ہونے کے بعد مٹھائی کی تجارت شروع کی۔ ہر شام آپ کی دکان شعراء کی محفلوں اور شعری رنگینیوں سے مزیّن رہتی تھی۔ آپ بہت پُر خلوص شخصیّت کے مالک تھے۔

○

ہوئی مقبول عاشق کی مناجات — الٰہی رات دن ہوتے ہیں دن رات
کھنچے جب کھینچ لائی مَے کدے میں — عبث بد نام ہے پیر خراجات
نہ پایا تو نے وہ دور آہ امجدؔ — ہوا تھا چاند دو ٹکڑے کسی رات

○

ابوالبیان حمادؔ

مولانا عبدالرحمان جناب ابوالبیان حمادؔ اندازاً 1924ء میں مالور (بنگلور) میں پیدا ہوئے۔ تقریباً 10 دس سال کی عمر میں جامعہ دارالسلامؔ عمرآباد آئے اور 1944ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ 15 پندرہ سال کی عمر میں طبیعت میں شعری اور نثری صلاحتیں موجود تھیں۔ تقریباً ایک سال مسلسل ہندوستان کے دورے پر رہنے کے بعد 1946ء میں استاد کے عہدے پر مامور ہوئے۔ اور آج بھی اسی جامعہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ کی شعری تخلیقات قدیم اسالیب کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے لیس ہیں۔ آپ ابتدا سے ادب برائے ادب کے مخالف اور ادب برائے زندگی کے پرستار تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کی تخلیقات میں خالص اسلامی زندگی کے پاک اور صالح نقوش بہت زیادہ کارفرما ہیں۔

علامہ شاکر نائطی کے شاگردوں میں آپ کا نام گرامی بھی شامل ہے۔

○

رہینِ کشمکش یہ میری جانِ ناتواں کیوں ہو
کبھی تم مہرباں کیوں ہو، کبھی نامہرباں کیوں ہو

جو ہے منقارِ بلبل پر، زبانِ لالہ و گل پر
وہ میری داستانِ غم کسی کی داستاں کیوں ہو

کہانی دردوغم کی بھر وہ اشکوں کی زبانی ہے
مرے قلبِ حزیں کا اور کوئی ترجماں کیوں ہو

سجا رکھا ہے ہم نے آشیانے کو سلیقہ سے
خدانا خواستہ مایوس، برقِ بے اماں کیوں ہو

فرازِ دار سے کوئی تمہیں آواز دیتا ہے
چلو جلدی ابھی حمادؔ آخر تم یہاں کیوں ہو

○

اسمٰعیل رفیعی

مولانا اسمٰعیل رفیعی کی شخصیت بہر اعتبار نہایت وقیع ، بلند اور معزز ہے۔ آپ بھی دار السلام عمر آباد کے فارغ التحصیل ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور تامل زبان کے ادب عالیہ کا آپ نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ آپ ایک ایسے خوش فکر شاعر ہیں جن میں خاص انفرادیت کی شان پائی جاتی ہے۔ آپ کی نظر بڑی گہری، تخیل دسیع اور احساسات اُفق کو چھونے والے ہیں۔ آپ کے کلام میں بڑی گہرائی ملتی ہے۔ آپ کی ہر تخلیق دعوتِ فکر دیتی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آپ نے اپنی استعداد، قابلیت اور فنی موشگافی سے وہ کام نہیں لیا جو آپ کو لینا چاہئے تھا۔ اگر مولانا اسمٰعیل رفیعی کا شمار ہندوستان کے صفِ اول کے شعراء میں کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا آپ مختلف اصنافِ سخن پر بھرپور قدرت رکھتے ہیں۔ علائم کے استعمال میں آپ کے یہاں جو خوش سلیقگی اور بے ساختگی ملتی ہے وہ بہت کم شعراء کو نصیب ہوئی ہے۔ مولانا اسمٰعیل رفیعی زندگی کے بیکراں سمندر کی گہرائی میں ڈوب کر نتائج کا استنباط کرتے ہیں۔

اسی لئے آپ کی ہر چیز گنج بے بہا کی حیثیت رکھتی ہے۔ زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں کا ادراک بھی رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ زمانے کی رفتار نے آپ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میں یہ کہوں گا کہ اس میں کچھ مولانا رفیعی کے تساہل کو بھی دخل ہے۔ وہ بلند پایہ فن کار جو جدید و قدیم تقاضوں کا مزاج شناس ہے۔ یوں گم نامی کی زندگی گذارے یہ خصوصاً اردو ادب کا بہت بڑا المیہ ہے۔ یہ شخصیت شمال میں پیدا ہوئی ہوتی تو آج یقیناً اختر الایمان، فیض، ن م راشد اور میراجی کی جگہ لیتی۔

راقم الحروف کی شاعری سے متعلق طویل مضمون لکھتے ہوئے مولانا نے شاعری کو ترک کرنے کا سبب یوں پیش کیا ہے۔

"مجھے اپنے وقت کے شاعر دوستوں کے ساتھ شعر کہنے اور سننے کے مواقع ملتے رہے ہیں اور میں اپنے اندر اس وقت ایک طرح کی ناآسودگی محسوس کرتا رہا۔ یا تو ہم اپنی سمتیں متعین کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے یا عظیم یا زندہ جاوداں شاعری پر قدرت حاصل نہیں کی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ کسی عظیم شاعر کے کامیاب تتبع سے ہی ہم نئے امکانات کیوں نہیں دریافت کر رہے ہیں وقت کے مشہور شاعروں کے لب ولہجہ اور آوازوں کی تقلید میں زندہ شاعری نہیں ہوسکتی اپنے دور اور اپنے ملک کے عظیم شاعر ٹیگور کا بھی ایک تتبع اردو میں پیدا نہ ہوسکا۔ میرے اسی احساس نے مجھ سے اپنی آخر نظم " گرودیو " کہلوائی تھی۔ ٹیگور کے تتبع کی میری یہ پہلی کوشش بھی تھی۔ میرے ترکِ شاعری کا سبب یہ ناآسودگی بھی تھی لیکن اصلی اور ٹھوس سبب مجھے ایک اور نئی غزل کی تلاش تھی۔"

مولانا اسمٰعیل رفیعی کی اس نئی منزل کے خضر شیخ کامل، عارفِ واصل، پیشوائے طالبین رہنمائے سالکین، طریقت پناہ معرفت دست گاہ حقیقت آگاہ حضرت مولانا مولوی خواجہ حبیب اللہؒ شاہ قادری چشتی نقشبندی سہروردی خلیفۂ سلاسل اربعین تابعین سید المرسلین قدس اللہ سرہ العزیز سلیمان پوری ساکن منار گراہی المتوفی 1971ء (مؤلف تذکرہ کے دادا پیر د مرشد) تھے۔ آج مولانا ایک مرشدِ حق عالم دین اور شیخ طریقت کی حیثیت سے اس مقام پر فائز ہیں جہاں سے بے شمار تشنہ گانِ حقیقت کو جامِ توحید عطا ہوتا ہے۔ مولفِ تذکرہ کو بھی (1982-12-26) میں آپ کے ارادت مندوں میں شامل ہونے کا شرف نصیب ہوا ہے۔

حضرت مولانا کے ارادت مندوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ آج آمبور، وانمباڑی، کرشنگری، ترپاتور اور مدراس میں کثیر تعداد میں پھیلا ہوا ہے۔

آپ ایک منفرد تنقیدی شعور کے مالک ہیں جس کا ثبوت ان چند مضامین میں ملتا ہے جو آپ نے حضرت علامہ شاکر نائطی جیسے شعراء واد باء پر لکھے ہیں یا پھر یہ تنقیدی بصیرت ان خطوط میں ملتی ہے جو مولانا اپنے احباب کو کبھی کبھی کسی موضوع کے تعلق سے استفساریہ لکھتے ہیں۔ راز امتیاز جیسے ادیب (جو اردو کے کسی نقاد سے کم ہی متاثر ہوتے ہیں) نے 1968ء میں اپنے ماہنامہ "ساون" میں بجا طور پر لکھا تھا کہ "رفیعی کا تنقیدی شعور ہمارے بعض مشہور پیشہ ور نقادوں سے کہیں زیادہ وقیع اور قابلِ اعتماد ہے۔" لیکن افسوس ہے کہ اردو تنقید مولانا سے محروم رہ گئی کیونکہ انہوں نے اپنے لئے کوئی اور ہی منزل منتخب کرلی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

رباعیات

• آ کاش ہو وہ آنکھ، زمیں بن جائے
جیسی چاہے، حسیں حسین بن جائے
جُھک جائے تو اعتبارِ عالم نہ رہے
اُٹھ جائے تو مینارِ یقین بن جائے

• تاروں کا بجھا بجھا سماں ہوتا ہے
ہر سمت اُجالا بھی دھواں ہوتا ہے
تم آؤ تو اس رات کی قسمت جاگے
یہ میرے مقدر میں کہاں ہوتا ہے

• جب راہ کا شور و شر کھو جاتا ہے
خورشید بھی چلتے چلتے سو جاتا ہے
رہتی دنیا کا مجھ کو ہوتا ہے یقین
جب ایک بھی تارا مرا ہو جاتا ہے

• پلکوں پہ لرز رہا ہے رخصت کا اثر
دامن میں ٹپک رہے ہیں دردِ دل کے ثمر
سینوں میں پگھلتی رہی ہیں ہمت کی سلیں
رونے بھی ہیں آپس میں دلاسے دے کر

○ عشق پردے میں چھپائے کیا چھپے
عاشقوں کی آنکھ کا اک ایک اشک
بے شبہ ساری حقیقت کھول دے

○

○ پریت کی لذّت کو چکھنے کے لئے
روح کو منظور ہے، کہتے ہیں لوگ
دوسرا قالب پرکھنے کے لئے

○

○ یہ خوش نصیبی کی، کہتے ہیں خوش نصیبی ہے
کہ جس کے حق میں نوازش ہے دیوتاؤں کی
جنم جنم سے طبیعت میں دل گدازی ہے

○

○ غلط کہ پیار فقط حق راست بازی ہے
یہ اور بات ہے، صادق ہے کوئی، کوئی نہیں
بُرے بھلے کا فقط پیار ہی تو ساتھی ہے

○

○ جس آدمی کے دل میں محبت نہیں ہوتی
رس جس میں نہیں، پیڑ وہ کیا لائے گا پتی
اس شخص کی خوشحالی، فراغت نہیں ہوتی

○ تن کی زیبائش میں کچھ رکھا نہیں
روح آرائش نہیں رکھتی اگر
دل، محبت کی جگہ رکھتا نہیں

○

○ سندِ زندگی محبت ہے
یہ نہیں ہے تو آدمی کیا ہیں؟
ہڈیوں کے ہیں پوستیں کوڑے

○

○ خود غرض ہے عشق کا ہر بے شعور
خلق کی خدمت میں لگ رہنے کے تئیں
عاشقوں کی ہڈیاں ہیں چور چور

○

○ پسیجتا ہے محبت میں دل سبھی کے لئے
گداز دل کا ثمر بے بہا خزانہ ہے
بنا یہی ہے صداقت کی روشنی کے لئے

"دوست"

چلے تھے ایک ہی محبوب کے تصور میں — وہ جس کے غم میں برابر کے دل فگار تھے ہم
کسی کے عشق کی بے مہریوں کے نشے میں — بس اک خمارِ نظر کے بہم شکار تھے ہم

چلے تو ایک ہی مکھڑے کی آرزو میں چلے — دلوں میں ایک ہی حسرت سے بے قرار تھے ہم
بنی خلوص کی "ترمورتی سبھا" بھی گواہ — کسی کے عارضِ سیمیں پہ کیوں نثار تھے ہم

ترے خلوص کی برقی کشش کے توڑے میں — میری نظر بھی مرے مطمحِ نظر پہ اٹھی
قدم قدم پہ رفاقت بھی تھرتھراسی گئی — مگر کہیں بھی رقابت کی آگ جل نہ سکی

غبارِ راہِ محبت کی دھند چھٹنے دے — نہ کہہ کہ ایک ہی محبوب کے رقیب تھے ہم
کہ آندھیوں میں جلائی تھی ہم نے شمعِ وفا — وفا کے، صدق کے، سنجوگ کے نقیب تھے ہم

عجب نہیں کہ رہِ زندگی میں بھی اے دوست — ہمارا سایہ بھی ہمدوش بن کے رہ جائے
یہ سایہ بھی شجرِ راہ بن کے لچکے گا — ہر اک نشانِ قدم بھی پکار اٹھے گا
کچھ آگے، ایک ہی منزل کے دو رفیق چلے

"دوسرا قدم"

ہر طرف پھول ستاروں کا تصور رکھ کر — میں نے اس وادیٔ پرخار میں رکھا تھا قدم
اب بھی یادکی پرکیف گذرگاہ میں ہے — تاکنے والی نگاہوں کا تعاقب ہر دم

میں نے سوچا تھا کہ یہ آگ پرائی تو نہ تھی
اور شاید کہ تجھے بھی یہ خیال آیا ہو

غیر کہتے ہوئے اس غم کو جو اپنا سا تھا
اجنبیت کے تصور سے ملال آیا ہو

تیرے مقدور نے ہونی کا نتیجہ سمجھا
میرے نزدیک مری اور کوئی راہ نہ تھی

لاکھ پسپا، مری رفتار نہ تھی اب پابند
میں نے دیکھا تری آواز بھی ہمراہ نہ تھی

زمزمہ زن تارِ رگِ جاں پہ تھی ہر دم جو صدا
دیکھتے دیکھتے وہ دور کی آواز ہوئی

اور اس راہ کی سنسان سی ڈھلوانوں میں
رینگتے رینگتے اس موڑ پہ دم توڑ گئی

میں نے اس موڑ پہ رکتے ہوئے یہ سوچا تھا
یہ رہ و رسم کی مٹیالی سی صدیوں کا غبار

غول بن جائے تو کتنوں کو چھپا لیتا ہے
راہ گیروں پہ یہ آسیب کے سایوں کی قطار!

انہی سایوں میں تھے کچھ راہنما سینا کے
تیرے آبا، مرے اجداد جہاں ملتے ہیں

میں نے دیکھا، قدم ان کے بھی شکستہ تھے یہاں
کفِ پا کے نہیں، سجدوں کے نشاں ملتے ہیں

حسِّ مجہول سرِ راہ بدل دی میں نے
رسمِ معمول ہی ناگاہ بدل دی میں نے

شاہراہوں کی طرف میری روش کا ہے گذر
میری دھرتی ترے چرنوں سے ہری کیوں نہ ہوئی

سبزے ہٹتے، تری رفتار کے دائیں بائیں
مرے رستے کی سجل مانگ بھری کیوں نہ ہوئی

کالی راتوں نے مری نیند تو چھینی ہو گی
مجھ کو ظلمت میں اجالے کا یقیں آیا تھا

جانے کس طرح ترے غم سے ملی جہدِ حیات
ورنہ چاہت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا

رُباعی

گھڑیاں بیتیں لگا کے جان کی بازی
راتیں کاٹیں تو صبح کی ٹوہ لگی

ملتے ہیں اگر فریب بڑھتا ہے یقین!
کاذب ہو اگر صبح تو کاذب ہو گی

صبحِ آزادی

نہ جانے کتنے پسینوں کا امتحاں لے کر
بسی ہوئی ہے یہاں خوشبوؤں میں بادِ صبا
وہ آزمائشِ خوں رنگ و بو کی شورش میں
شرارِ اشک سے ہے شبنمیں چمن کی فضا
وہ صبح جس کی کرن بے قرار تھی اتنی
کہ جس کے پھول سے چہروں کو رات نے روکا
کلی کلی نے زباں کھولنا پسند کیا
تو بڑھ کے رات کے انجانے ہاتھ نے روکا
یہی کرن ہے جو لہروں کی ہم نفس بن کر
خلیجِ گردشِ ایام کاٹتی آئی
دبی ہوئی تھی جو ملبوں تلے نحیف سی بو
سیاہ رات کی دیوار چاٹتی آئی
اسی کرن کی لپک سے ملی گراں زنجیر
صدائیں گیت کی آواز گھل گئی جیسے
کلی کلی کہ تھی نا آشنائے بیداری
بہ حدِّ خوابِ گراں آنکھ کھل گئی جیسے
اسی کرن کی تپش ہے چمن کا سرمایہ
یہ صبح آئی تھی اک کاوشِ بقا بن کر
غمِ حیات کی صورت ہے کاہشِ نکہت
نہ جانے کتنے پسینوں کی ابتدا بن کر

جبر وقدر

جل پری
جل کے گھونگھٹ سے جھانکی ہوئی
درد نادانیوں کا اٹھائی ہوئی
ایک نا آشنا دوش پر
جبرِ تخلیق لادی ہوئی
بے خبر
لوبھ کی لاگ سے
اس دیش کی دھوپ کی
آگ سے،
بے گماں، اپنے ماتھے میں سربستہ
انجانے ہر بھاگ سے،
آرزو، عزم، امید کا دم لئے
نارسائی کے سلک حدِ امکان سے!
آنکھ میں
چشمِ نسیاں کا آنسو لئے،
سیپ کی چھاتیوں کا خزینہ
حسن کا، بے کراں روشنی کا پسینہ،
اس کے کاکل کے جھومر میں
ایسا کھپا ہے،
جیسے اس کے تبسم کی سرحد کے اس پار
دُرِّ عدن چھپ گیا ہے
اور، سرِ شام ساحل

تماشائیوں کی
نظر، سانحہ کی آنچ میں
جل گئی ہے۔

○○
○

عیادت

ٹھیرا ٹھیرا ہوا، ہر رنگ، بدلنے والا
اور کچھ دیر ٹھہر جائے گماں بھی
تو یقین بن جائے
(دشت ہی دشت ہے بے سمت وجہات
وہی نزدیک، وہی دور ہے۔ تا حدِ نظر
کسی ہمزاد کا سایہ بھی نہیں
ایک سناٹا ہی سناٹا ہے
منزل و فاصلہ وراہ سے چھوٹی ہوئی رات)
زیرِ افلاک درِ مرگ سے ہے کس کو فرار
چند بکھرے ہوئے، اڑتے ہوئے یادوں کے شرار
چند گذرے ہوئے اعمال کی ٹوٹی کلیاں
گدگدائی ہوئی قربت سے گرے آنسو ہیں
آج چن کر انھیں
یادوں کی لڑی میں بھر دے
کتنا دلچسپ ہے یادوں کا شمار
رنج لائے کہ خوشی، لوٹ کے آتی ہے بہار

○○

○ نظم

تجھ سے لافانی بنی یہ ناتواں ہستی مری
تیرے ہاتھوں میرا جامِ زندگی ہے بیکراں
خالی ہوتے ہوتے یہ پیمانہ بھرتا جائے
ہے

یہ تیری آواز نے جو گونجتی ہے دم بدم
کوہ و صحرا کی فضائیں، بحر کی ہر موج میں
نو بہ نو صبحِ ازل سے آج تک بھی آئے
ہے

لمس کی کیسی لطافت، تیرے چھوئے ہی
تیرے ہاتھوں یہ مرا قلبِ حزیں ہے مفتخر
ایک بے پایاں مسرت آج یہ چھلکائے
ہے

تیرے انعامات لامحدود، یہ چھوٹے سے ہاتھ
ہے کرم بھرپور اتنا، کتنی عمریں بھر گئیں
آج تک جاری ہے، گنجائش بھی لیکن پائے ہے۔

○ گیتانجلی

از

مترجم :- اسمٰعیل رفیعؔ ٹیگور

اس کو تکتے کٹ گئی بے سود ساری رات ہی
مجھ کو اندیشہ، گجر دم وہ یہاں آجائے گا
اور مرے اعصاب پر خوابِ گراں طاری لے ہے
دوستو، اس کو نہ لوٹاؤ جو میں سو بھی پڑوں
اس کی آہٹ سے نہ جاگوں تو جگانا بھی نہیں
اک بلند آہنگ میں جب پھٹ پڑے چڑیوں کا شور
سر سرِ جشنِ صباحی بھی مجھے چھیڑے نہیں
وہ بھی آجائے تو سونے دو، جو میں سویا رہوں
اس کے چھونے سے ہی ٹوٹے گا مرا افسونِ خواب
ہاں فقط اس کے تبسم پر کھلے گی میری آنکھ
جہل کی ظلمات میں اک خوابِ روشن کی طرح
بس اسی کے ہی سراپا پر اٹھے گی میری آنکھ
پَو کے خاکوں میں ہو بس پہلے پہل اس کی نمود
اس کے دیکھے سے ہو میری آنکھ میں پہلی کرن
روح میں ہیجانِ لذت ہو مری پہلی نظر
آپ میں آؤں تو اپنا ہوش ہو اس کی خبر

پالکی بردار

دھیرے دھیرے ہم چلے ہیں پالکی تھامے ہوئے
جیسے، پر تولے ہوئے بگلا اڑے ندیا پرے
رنگ و رامش کی فضا میں پھول کی پتی اڑے
پتلے پتلے ہونٹ پر سوتے میں مسکاں کھیل جائے
ہنستے گاتے ہم چلے ہیں پالکی تھامے ہوئے
پالکی ہے یا گلے کے ہار کا ہیرا ہے یہ
دھیرے دھیرے ہم چلے ہیں پالکی تھامے ہوئے
راگنی کے جھٹکے میں جیسے تارا جھول جائے
جیسے کالی بدلیوں کے فرق پر ناچے دھنک
جیسے اس دلہن کی آنکھوں پر ہو آنسو کی جھلک
ہنستے گاتے ہم چلے ہیں پالکی تھامے ہوئے
پالکی ہے یا گلے کے ہار کا ہیرا ہے یہ

○ کورومنڈل کے ماہی گیر
سروجنی نائیڈو

مترجم : اسمٰعیل رفیقؔ

بھائیو، جاگو اٹھو، اب تو سحر ہونے لگی
رات بھر رو رو کے اس بچے کو جیسے نیند آئے
سوگئیں آغوشِ اوشا میں ہوائیں رات کی
مانجھیو اب جال تھامو، کشتیاں کھینے لگو
دولتِ دریا سمیٹیں۔ ہم کہ دریا زاد ہیں
مرغ بھی آواز دیتا ہے : اٹھو تاخیر کیا
موج ساتھی ہے، سمندر ماں ہے، بھائی کھیے
ڈوبتے سورج کو جائیں بھی تو ہم کو غم نہیں
دیوتا آغوش پھیلاتے ہیں ہم جائیں کہیں
کس قدر جاذب ہیں یہ ناریل کی پرچھائیاں
بھینی بھینی آم کی پیڑوں سے آتی ہے ہوا
چودھویں میں کس قدر سوندھی ہیں اس کی پتیاں
مست نغموں سے بھری آتی ہے کانوں میں صدا
اور شیریں تر ہے ہونٹوں پر، یہ رقصندہ پھوار
بھائیو جپتو چلاؤ دور نیل آکاش تک
چومنے لگتی ہے موجوں کو جہاں اس کی کنار

"رابندر ناتھ ٹیگور"

یہ پیچدار ڈھلانیں، سفید پوش پہاڑ
یہ سر اٹھائی ہوئی چوٹیاں، یہ کوہ و دمن
قطار باندھی ہوئی جھاڑیاں، یہ وادی میں
ندی ندی کے کنارے یہ ایک آبادی
وہ کوئی قافلہ ہے خیمہ و طناب لئے
غم و خوشی کو کوئی کارواں گذار گیا
سدا سدا سے مگر یہ پہاڑ قائم ہے
سبھی کا دوست بنے اور سبھی کی لاج نبھائے
کبھی تو ابر چڑھا ہے، کبھی تو برکھا ہے
ندی ندی میں عنایت کی، پیار کی صورت
وہ کوئی قافلہ ٹھہرا، گذر گیا کوئی
سفید پوش کی عظمت ہے اپنا آپ ثبوت
وہ بجلیاں کہیں چمکیں، لپک پڑے کوندے
مگر پہاڑ کی عظمت کو کوئی جا نہ سکا
جو تیرے دل کو جلایا ہے آتشیں شعلہ
بنا ہوا جو ترے سر خرد کا سایہ ہے
جمال و حسن کی صورت امر ہے دوہوں میں

○ تحفۂ سالگرہ

(نظم)

ہمایوں کبیر

مترجم : اسمٰعیل رفیقی

آج کی صبح تری سالگرہ آئی ہے
دل مرا دل نہیں، دنیا بھی کوئی چیز نہیں
سوچتا ہوں کہ ترے پیار کا تحفہ کیا ہے ؟
کوئی تحفہ نہیں، ہدیہ نہیں، سوغات نہیں
نہ مصوّر ہوں کہ شہکار بنا کر لانا
بادلوں میں کہیں بکھرے ہوئے گاؤں کی طرح
یادیں بھولے ہوئے بول کچھ ابھرے ہوں گے
یاد آئیں بھی اگر گیت تو بے سُر آئیں
ان سنے گیت سہارا ہیں مگر ارمان کا
روح بے مایہ ہے حسرت میں کہیں کھوئی ہوئی
اس کے سامان میں کیا تھا؛ جو کہیں چھوٹ گیا
یہ بھی احساس گرا نبار کہ اپنا بھی نہ تھا
روح بھولی ہوئی ایام گذشتہ کی متاع
آج بھی ڈھونڈ رہی ہے وہی نایاب سراغ
جو کسی دیر کے فردا میں ہے بے دید و نمود
دور دنیا کی طلب میں یہ مرا جہد طویل
دور آفاق کی خاطر یہ مرا ذوقِ طلب
میرے ناچیز سے ہاتھوں یہی تحفہ ہو قبول

"تاج محل"

ہمایوں کبیر

مترجم: اسمٰعیل رفیعی

خواب اک میری بساطِ قلب پر سویا ہوا
آج اس کا رخ دمکتا ہے شفق کی تاب میں
میری نظروں میں پسارے اپنی کومل پتیاں
مرمریں خاکے کے پیچھے کیسے جادوگر تھے ہاتھ
سارا عالم محوِ حیرت بن کے تکتا ہے جسے
دل کی بے صبری مری بلیوں اچھلتی ہے نہاں
اک اتھاہ، خاموش، لامحدود سطحِ آب پر
اک کنول تو نے کھلایا، اک آپ اپنی مثال
آسماں کی رفعتوں میں عظمتِ تنہا لئے
تو ہے سرگرداں، فراقِ یار میں کھویا ہوا
رقص کرتی ہیں رتیں تیری لگن کے گرد گرد
آج کی شب چاندنی بھادوں کی ہے سیلاب کف
نقرئی ہر قہقہہ آفاق پہ ہے چاند کا
کلبلاتی ہے اِدھر ظلمات میں جمنا کی موج
اور کنارے پر دمکتا ہے طلائی ایک خواب
خواب جس میں شاہ نے اشکوں کو بخشا ہے ثبات

ایک بدوی عورت کا مرثیہ اپنے بیٹے کی موت پر

جواہر الادب

مترجم : اسمٰعیل رفیعی

لال میرے، آتش دل تیز ہے
اشک کی گرمی بھی آتش خیز ہے
موت کے شعلے سے کیا شعلہ لگا
میرا سینہ کس قدر گرما گیا
قاتلوں سے پوچھتی ہوں تیرا حال
ہے مگر تسکین بھی تیرا خیال
دینے والے یہ خبر دیتے نہیں
واپسی ممکن بھی ہے تیری کہیں
ہے مکدر زندگی، تو جب چلا
دل دکھی ہے، آنکھ سے آنسو رہا
منتشر ہے فکر، عقل حیران ہے
اشک ہیں بے ضبط، گھر ویران ہے

○○

قالت ليلى الاخيلية
المتوفاة 80ھ

جواھر الادب

مترجم: اسمٰعیل رفیقی

موت سے شرم کیا کرے گا جواں
زندگی سے نہ جس کو عار ہوا
جاوداں موت کیسی کیسی ہے
زندگی عیش کیا، سلامت کیا
ایک دن چھوڑ دے گا آہ وفغاں
دہر نے جس کو اشک بار کیا
عیش گھٹتا ہے موت کے آگے
دہر پر خاک کون ڈالے گا
بے شکیبی سے زندگی نہ ملی
شکوۂ دہر چھوڑنا ہو گا
• موت کا ایک دن معین ہے"
تازہ تازہ شباب ہو کہنہ

○○

عمرِ گریزاں

اس پیڑ پہ چڑھنے کے ناطے
ناخن ناخن خون ہوئے
ایک عمر لہو لہان ہوئی
انجان، جنم دن بیت گئے
ساون، بھادوں میت گئے
سوچا تھا
اس کی ٹہنی پر
ہم اپنا راگ الاپیں گے
سن کے بھید سجھائیں گے
ایسا گیت سنائیں گے
کہسار کے پتھر موم بنیں۔

اب گیت نہیں
پتھر ہے یہاں
جو آس لگائے بیٹھا ہے
آئے گا کوئی بتگر تو یہاں،
اس پیڑ کے
آسن بیٹھے گا
گیتوں کا بتِ خاموش کوئی
بولے گا نہیں
گائے گا نہیں
پر من کے بھید سجھائے گا

جب اس پر شبنم روئے گی
ہر شام، شفق کا لالہ ہو
جب شبنم اس پر مسکائے
پُر بھات،
افق کا نغمہ ہو۔

ہلالؔ جہانگیر

حضرت ہلالؔ جہانگیر مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ کی علمی و فطری پرورش میں مدراس کے ادبی ماحول کا بہت زیادہ دخل ہے۔ اگرچہ وہ دس پندرہ سال سے آندھرا پردیش میں قیام پذیر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہلالؔ جہانگیر نقوشِ عہدِ رفتہ کی ایک اہم کڑی اور یادگار ہیں۔ زبان و بیان کے سلسلے میں آپ کی پابندی ایمان کی حد تک قابلِ توجہ ہے۔ آپ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو حرمِ ادب کی ایک اینٹ کو بھی اس کی جگہ سے ہٹانا کسی صورت بھی گوارا نہیں کرتے۔

بھرپور نظر ہم نے رُخ پر ترے ڈالی ہے
پی کر تیری آنکھوں کی، پیاس اپنی بجھالی ہے

کیا ہوتا ہے، کیا جانے اب ردِ عمل اس کا
ہم نے تو ملانے کو آنکھ ان سے ملالی ہے

کیا قید لگاتے ہو تم ہم پہ خموشی کی
یہ قید تو خود ہم نے اپنے پہ لگالی ہے

در پردہ مخالف ہیں جو دوئیٔ فطرت سے
کیا دوں میں جواب ان کا فطرت مری عالی ہے

کیوں کر نہ مسلّم ہو اخلاصِ وفا اپنا
ہم نے تو ہلالؔ اُن سے اب دادِ وفا لی ہے

رفتہ رفتہ دردِ دل آرام جاں بنتا گیا
اے محبت یں ترے شایانِ شاں بنتا گیا
آسماں سے بجلیاں گرتی گئیں گرتی گئیں
اور مٹ مٹ کر ہمارا آشیاں بنتا گیا
لمحہ لمحہ تیرے ہاتھوں اے فریب آرزو
اک جہاں مٹتا گیا اور اک جہاں بنتا گیا
لوگ جو دیر و حرم سے منحرف ہونے لگے
میکدہ ان کے لئے دارالاماں بنتا گیا
اے ہلالؔ اک نغمہ جو چھیڑا تھا ان کی یاد میں
سوز اس کا زندگی بخشِ جہاں بنتا گیا

مزید دو شعر

مہرباں ہوتے گئے وہ ہم کو چپ لگتی گئی
شوق اپنا خود حجابِ درمیاں بنتا گیا
حسن کی رعنائیاں آخر نہ کچھ تو دے سکیں
عشق ہی وجہِ فروغِ داستاں بنتا گیا

مولانا فیضی صدیقی

مولانا مولوی محمد جعفر حسین فیضی صدیقی (فرزند ارجمند ایم عبدالمجید) بہ مقام مدراس 4 جنوری 1925ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدراس میں اور عربی، فارسی کی تعلیم مدرسہ باقیات الصالحات ویلور سے حاصل کی 1947ء میں اسی مدرسے میں مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1958ء میں حضرت شیخ آدم کے دستِ مبارک پر بیعت سے سرفراز ہوئے اور بعد میں اپنے شیخ کے وصال کے بعد 1967ء میں داداحیات قلندرؒ کے سجادہ نشین غوث محی الدین شاہ قادری کے طالب ہوئے۔ 1958ء میں تقدس مآب اعلیٰ حضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین

سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہ سے "سندِ مصافحہ" حاصل کی تھی۔

آپ نے مشرقی علوم اور مغربی ادب کا بہت غائر مطالعہ کیا ہے۔ بچپن ہی سے آپ کی طبیعت شعر گوئی اور نثر نگاری کی طرف زیادہ مائل تھی۔ غزلیں کم مگر نعتیں بہت زیادہ لکھی ہیں۔ 1950ء میں مولانا محوی صدیقی کے میل وشارم میں قیام کے دوران مولانا سے اپنے اشعار پر اصلاحیں لیں ــــ لیکن یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ آپ کی طبیعت کا میلان تراجم کی طرف بہت زیادہ تھا۔ "ہما" اور "ہدیٰ" دہلی کے رسائل میں آپ کے تراجم نمایاں طور پر جگہ پاچکے ہیں آپ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ آج تک تقریباً پانچ ناول لکھ چکے ہیں۔ آپ کا ایک ناول "صحرا کا راز" 1982ء میں قسط وار "سالار" بنگلور کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوچکا ہے۔ اس ناول کے بعد آپ نے جو ناول لکھے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

"منزل نامعلوم" "چینی قاتل" "سمندر کا ہنگامہ" "خوفناک سائنس دان"

ان تمام ناولوں کے موضوعات جاسوسی ہیں۔ تعجب اس بات کا ہے کہ مولانا کا تعلق بچپن سے ایک ایسے عربی مدرسہ سے ہے جہاں جاسوسی ناول پڑھنا تو درکنار اس ماحول میں جاسوسی کرداروں سے متعلق سوچنا اور بولنا بھی قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ مندرجہ بالا پانچوں ناول اگر منظرِ عام پر آجائیں تو تامل ناڈو کے اردو ادب کی تاریخ میں اضافہ ثابت ہوں گے۔ کیونکہ تامل ناڈو میں ناول نویسی کی تاریخ کا دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔ 1950ء کے بعد تامل ناڈو کی سرزمین سے دو ناول نگار "ننگا ماحول" (کے۔ آر۔ حسینی) اور "ہیرو" (رشید مدراسی) اپنے مطبوعہ ناولوں کے ساتھ منظرِ عام پر آئے تھے۔ لیکن ان دونوں ناولوں کی اشاعت کے بعد پتہ

نہیں یہ ناول نگار کس وادی میں روپوش ہو گئے ہیں۔

مولانا نے 1950 میں ویلور سے ایک ماہنامہ "جامِ جم" کا بھی اجراء کیا۔ سُنا ہے کہ اس ماہنامے کے گیارہ شمارے شائع ہوئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے مولانا نے غزلیہ شاعری کی بہ نسبت نعتیہ شاعری کی طرف بہت زیادہ توجہ دی ہے۔

ظلم و ستم کے سائے میں جینے کی تمنا کون کرے
اندوہ الم سے تنگ اگر مرنے کا تقاضا کون کرے
وہ شوق نہیں، وہ ذوق نہیں، وہ ہوش نہیں وہ جوش نہیں
کھوئے ہوئے دورِ مسرت کو، پانے کی تمنا کون کرے
ہے دردِ محبت بے درماں، اس بات میں دل ہے بے ساماں
فیضی کا مسیحا کوئی نہیں، پھر اس کا مداوا کون کرے

تجھ سے بچھڑ کے ساقی، برسوں گذر چکے ہیں
باقی ہے یاد اب بھی، برسوں گذر چکے ہیں
چھائی ہوئی ہے اب تک، وہ موہنی سی صورت
آنکھوں میں رات کٹتی، برسوں گذر چکے ہیں
پایاں ہے عمر فیضی، ہیں موندنے کو آنکھیں
اب آ بھی جا رے ساقی، برسوں گذر چکے ہیں

نیّر ربانی

مولانا نیّر ربانی ارجولائی 1925ء میں بہ مقام وشارم (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول وشارم سے اور اعلیٰ تعلیم محمڈن کالج مدراس سے حاصل کی۔ آپ بیک وقت شاعر، ادیب مقرر اور سیاح ہیں۔ آپ کی سیاحت کا یہ عالم ہے کہ آج تقریباً آدھی دنیا کا سفر کر چکے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم (بی۔ اے) میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد تقریباً ۱۱ سال تک اسلامیہ ہائی اسکول میل وشارم میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد مستقل طور پر ریاستِ کرناٹک کی درس گاہ دارالعلوم سبیل الرشاد سے منسلک ہو گئے۔ اور آج تک اسی عربی کالج میں علم و ادب کے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کا حلقہ اثر و رسوخ بہت وسیع ہے۔ مذہبی و سماجی معاملات

ہیں آپ کی خدمات بے لوث اور بے غرض ہیں۔ مذہب کے سخت پابند ہیں۔ اس کے باوجود زاہد خشک نہیں بلکہ رندانہ طبیعت پائی ہے۔ 1970ء سے 1976ء تک حضرت دانش فرازی نے بنگلور میں سکونت اختیار کی تو مولانا موصوف سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کی دل وجان سے قدر کی۔ بنگلور کا ادبی ماحول حضرت راز امتیاز کے بعد حضرت دانش فرازی کا آج بھی احسان مند ہے۔ کرناٹک کی نئی پود کی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کی پذیرائی میں جو اہم رول ان دونوں حضرات نے ادا کیا ہے اسے اردو ادب کا کوئی بھی مؤرخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔

نہیں جاتی نگاہوں کی یہ حیرانی نہیں جاتی
کسی کے جلوۂ رعنا کی تابانی نہیں جاتی

وفا ہے کامیاب اپنی جفا کی کچھ نہیں پروا
کسی صورت جنوں کی چاک دامانی نہیں جاتی

یہ ناممکن، غم فرقت میں میرا دل بہل جائے
دلِ آشفتہ کی ہرگز پریشانی نہیں جاتی

فروغ حسنِ کامل سے تجلی کا وہ عالم ہے
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

تمہاری بات نیّرؔ کون سنتا ہے زمانے میں
خدائی بات بھی جب ان دنوں مانی نہیں جاتی

کمالؔ مدراسی

محمد کمال الدین اکبر کمالؔ مدراسی ۱رجولائی 1925ء کو مدراس میں پیدا ہوئے کل ہند مشاعروں کے تعلق سے کمالؔ مدراسی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ کئی اساتذۂ سخن سے بیک وقت شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے آپ نے غزل ہی کا سہارا لیا ہے۔ کسی نہ کسی ادبی ہنگامہ کے محرک بنے رہتے ہیں۔ آپ کی غزلوں میں روایتی غزل گو شعراء کی ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

○

آج ہم مقدر کی برہمی سے ڈرتے ہیں
موت کا نہیں کچھ غم، زندگی سے ڈرتے ہیں

اور آدمیت کا اب زوال کیا ہوگا
آدمی زمانے میں آدمی سے ڈرتے ہیں

سوئے منزل اب تو ہم جائیں گے اکیلے ہی
رہبروں سے واقف ہیں رہبری سے ڈرتے ہیں

کہتے ہیں خوشی جس کو غم کا پیش خیمہ ہے
لوگ بچتے ہیں غم سے ہم خوشی سے ڈرتے ہیں

معنی اور مطلب سے کچھ غرض نہ ہو جس کو
اے کمالؔ ہم ایسی شاعری سے ڈرتے ہیں

○

جذبۂ بے اختیارِ شوق کام آ ہی گیا
گھر سے میں نکلا تو وہ بالائے بام آ ہی گیا

ہر قدم پر دے رہا ہے ہر نفس پیغامِ دوست
جستجو کی راہ میں ایسا مقام آ ہی گیا

مجھ کو رسوا کر کے وہ مشہورِ عالم ہو گئے
ہو کے میں برباد آخر اُن کے کام آ ہی گیا

ڈھونڈتی تھیں ایک مدت سے ٹھکانہ بجلیاں
شکر ہے میرا نشیمن اُن کے کام آ ہی گیا

کیا یہی مجبوریٔ جذبِ محبت ہے کمالؔ
خود بخود لب پر کسی کے میرا نام آ ہی گیا

ممتاز مدراسی

سید سعد اللہ ممتاز مدراسی 1926ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں پھر ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی تک کی تعلیم مسلم ہائی اسکول، مدراس سے حاصل کی۔ اور اردو شاعری کے ابتدائی مدارج حضرت قبلہ عبدالعزیز ماہرؔ کے سہارے طے کئے۔ آپ کا ادبی اور شعری سفر راجیؔ صدیقی کے ہمراہ شروع ہوا تھا۔ غالباً 1950ء سے 1952ء تک آپ دونوں حضرات مدراس کے خوش گوار ادبی ہنگاموں کے روح رواں تھے۔ اسی دور میں ممتاز مدراسی مولانا محویؔ کے حلقۂ تلامذہ میں بھی شریک ہوئے تھے۔ اور مولانا کی معیت میں ماہنامے "معیارادب" اور "الارشاد" کا اجرار میل وشارم (شمالی آرکاٹ) سے کیا تھا۔ ان دونوں ماہناموں نے جو ادبی خدمات انجام دی تھیں وہ تامل ناڈو کی اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ممتاز مدراسی نے (ایک فلمی کم ادبی زیادہ) جریدہ "فلمستان" کا بھی اجرار کیا تھا۔ اس پرچے میں ممتاز کی مدیر "شمع" یوسف دہلوی سے دلچسپ نوک جھونک نظر آتی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے چار پانچ سال بعد پاکستان گئے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے۔

○

آمیز کرکے اشک میں خونِ جگر کو میں
دلکش بنا رہا ہوں جہانِ نظر کو میں

قائم لبوں پہ موجِ تبسم نہ رہ سکی
تسکین دے سکا نہ کسی نوحہ گر کو میں

ممتاز آئینے پہ جماؤں نہ کیوں نظر
دیکھوں جب اس میں جلوۂ آئینہ گر کو میں

نیاؔز ملک

عبدالرؤف نیاؔز ملک 2؍ مارچ 1926ء کو بہ مقام وانمباڑی (شمالی آرکاٹ)، پیدا ہوئے۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے اربابِ علم و فن پیدا کیے فن کی ادبی، ثقافتی اور مذہبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ نیاؔز کالج کے زمانے سے شعر کہتے ہیں لیکن میرے علم کا جہاں تک تعلق ہے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے کبھی اس فن کی طرف جمعیتِ خاطر اور یکسوئی کے ساتھ توجہ نہیں دی۔ حالانکہ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن ابھی ان میں وہ انفرادیت پیدا نہیں ہوئی جس سے اُن کی ادبی شخصیت کا تعین ہو سکے۔ غزل مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے ہیں۔ اور شعر اور ترنم کے امتزاج سے مشاعرے میں کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔

○

رہِ طلب میں نشیب و فراز ہوتے ہیں — غمِ حیات کے گیسو دراز ہوتے ہیں
یہ میکدے کی فضا بھی ہے کتنی محشر خیز — گنہگار یہاں پاک باز ہوتے ہیں
لطافتوں کا سمندر ہو جام میں ساقی — کہ پینے والے بڑے دلنواز ہوتے ہیں
فقط یہ درس مقید ہو معبدوں ہی کیوں — حرم سے دُور بھی کتنے محاذ ہوتے ہیں

○

کون جانے کنارے کدھر رہ گئے — خیر مقدم کی خاطر بھنور رہ گئے
لکھتے لکھتے حکایاتِ اندوہِ غم — ہو کے اوراق دل رہ گئے
کیسے کیسے وہ جینے کے ارمان تھے — چند سانسوں پہ جو منحصر رہ گئے

دیر و کعبہ کا عقدہ کھلا جب نیاؔز
میکدے ہی فقط معتبر رہ گئے

حامد الباقوی

عبدالمجید حامد باقوی بہ مقام گڑیاتم (شمالی آرکاٹ) 1926ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گڑیاتم میں اور عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم مدرسۂ باقیات الصالحات، ویلور سے حاصل کی۔ مدراس یونیورسٹی سے "منشی فاضل" کے امتحانات بھی پاس کیے۔ فی الحال گڑیاتم کے سرکاری اسکول میں (تقریباً چالیس سال سے) درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ نعت گوئی میں اچھا خاصا ملکہ حاصل ہے۔ غزل کی طرف بھی توجہ دی ہے مذہبی مضامین بھی لکھے ہیں۔

○

آئی بہارِ صبحِ مسرت لیے ہوئے — مکہ میں داخلے کی اجازت لیے ہوئے
کیسے کہوں کہ سجدے کیے ہیں کہاں کہاں — نورِ جبیں تھا ذوقِ عبادت لیے ہوئے
آنکھوں میں سرمہ گرد و غبارِ حجاز کا — پہلو میں دل ہے چشمِ بصیرت لیے ہوئے
بیشک غلافِ کعبہ پہ موتی لٹائے ہیں — آنکھیں تھیں سلکِ نذرِ عقیدت لیے ہوئے
پڑتی ادب سے گنبدِ خضریٰ پہ تھی نظر — لب تھے درودِ پاک کی لذت لیے ہوئے
نظارۂ جمالِ محمد کے نور سے — دل جلوہ گاہِ طور تھا جنت لیے ہوئے

پھر بارگاہِ ناز میں پہنچے نیاز مند
حامد ہیں رات دن یہی حسرت لیے ہوئے

○

بدرجمالی

بدرالحسن بدرجمالی 17ر جولائی 1926ء کو بہ مقام ویلور (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ آپ نے 3 سال تک باقیات الصالحات میں تعلیم حاصل کی۔ مدراس یونیورسٹی سے بی۔ یس۔ سی۔ بی۔ ٹی کرنے کے بعد مدرسۂ اعظم مدراس میں بی۔ ٹی۔ اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے اردو اور فارسی زبان پر عبور حاصل ہے۔ آپ نے زبان وادب کا غائر مطالعہ کیا ہے آپ عصری تقاضوں اور اردو ادب کی نئی قدروں سے واقف ہوتے ہوئے بھی روایات کا نقش دل و دماغ میں بڑی حد تک مضبوط کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح آپ نے کبھی اپنی متعین کردہ راہ سے انحراف نہیں کیا۔ آپ نے جو کچھ کہا دیانت داری، خلوص اور لگن کے ساتھ کہا اور کبھی اس کا صلہ نہیں چاہا اور آپ نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ لوگ آپ کی شاعری کے متعلق کیا کہیں گے؟ آپ کی فکر کا کہاں تک استقبال ہوگا؟ آپ کے گل و بلبل، جام و مینا، طوق و سلاسل، آہ و فغاں، عشق و محبت والے احساسات اور جذبات کی پذیرائی کہاں تک ہوگی؟ آپ مدراس کے کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر مولانا کمالی ویلوری کے شاگرد عزیز ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں آپ کے مزاج کا وہ استقلال ملتا ہے جو بہت کم لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے۔

بڑے مزے کا تماشا ہے حسن کا برتاؤ — کبھی حسین لگاوٹ کبھی لطیف کھنچاؤ
شروعِ عشق سے بربادیوں کے ساتھ مجھے — وہ اک طرح کا تعلق وہ اک طرح کا لگاؤ
ترے تبسمِ رنگین کی پے بہ پے موجیں — کہ جیسے صبحِ بہاراں کا رنگ رنگ رچاؤ
خدا کرے کہ ترے حسن کا چراغ جلے — جلے جلے نہ جلے میری حسرتوں کا الاؤ

ابھی ہے یاد جمالی کو التفات ترا
وہ دلربائی و ناز و ادا وہ پیار وہ چاؤ

شکوۂ جورِ بتاں تک جائے گا — راستہ غم کا وہاں تک جائے گا
ہے رخِ گل اس قدر دہکا ہوا! — شعلہ اٹھ کر آشیاں تک جائے گا
پائے ہمت جستجو میں آپ کی — وسعتِ کون و مکاں تک جائے گا
یاد جب زلفِ رسا کی آئے گی — سلسلہ جانے کہاں تک جائے گا

ہے جمالی کو سکوں کی جستجو!
وہ درِ پیرِ مغاں تک جائے گا

بڑی حسین و طرب زا کتاب پڑھتا ہوں
میں اُن کا قصۂ اوجِ شباب پڑھتا ہوں

خط اُن کا ہاتھ میں ہے دل پہ بے خودی طاری
میں خط کہاں خطِ جامِ شراب پڑھتا ہوں

نظر سے اُن کی ملا کر نظر سرِ محفل
میں ہر سوال کا اپنے جواب پڑھتا ہوں

ردائے لالہ و گُل بھی کتاب کا ہے ورق
میں اس میں قصۂ حسن و شباب پڑھتا ہوں

کسے ہے شوق جمالیؔ غزل سنانے کا
بہ حکمِ صدرِ فضیلت مآب پڑھتا ہوں

تمنّا یوسفی

گنڈو عبدالصمد تمنّا یوسفی بہ مقام آمبور (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ آپ ایک ایسے مشاق اور منجھے ہوئے فن کار ہیں جنہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ تمنّا یوسفی نے کئی اہم ادبی شخصیتوں سے استفادہ کیا ہے۔ اِن کی تخلیقات میں کئی شخصیتوں کی چھاپ نظر آتی ہے اس کے باوجود اپنی مسلسل جد و جہد، زبان و بیان پر دسترس، اور فنی موشگافیوں سے واقفیت کی بنار پر تمنّا یوسفی نے اپنا ایک الگ مقام پیدا کرلیا ہے۔ تمنّا یوسفی مستحق ہیں اس بات کے کہ نقادان کی تخلیقات کی طرف خاص توجہ دیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ آج تک کسی نقاد نے ان کی تخلیقات کی طرف توجہ نہیں دی اور ہمارے فن کاروں نے بھی انھیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ مجھے یقین ہے کہ تمنّا یوسفی کا فن ایک نہ ایک دن اپنے آپ کو منوالے گا۔

○

آتا نہیں کیا ابر کرم ہم پہ ترس بھی
گھر گھر کے جو آیا ہے تو کھل کھل کے برس بھی

کیا کیجئے کچھ تشنگیٔ دل ہی عجب ہے
یوں کم نہیں امرت سے ترے ہونٹوں کا رس بھی

تقدیر کی دیوی تجھے ہم چھو نہیں لیں گے
کیا پاپ ہے بس دور سے اک تیرا درس بھی

کیا کہئے غمِ دل کی کشاکش کو تمنّا
مرنے کا ارادہ بھی ہے جینے کی ہوس بھی

○

یہ زمانے کے تیور یہ مجبوریاں
ہم پریشاں نہ ہوتے مگر ہو گئے

یوسفی اب زمانہ وہاں آگیا
عیب جتنے تھے سارے ہنر ہو گئے

○

عزیز تمنائی

عزیزالرحمان عزیزؔ تمنائی 19 جنوری 1926ء بہ مقام ولتور (نزد آمبور) پیدا ہوئے۔ آپ نے مدراس یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس پاس کرنے کے بعد فنِ طب کو ذریعۂ معاش بنایا۔ طالبِ علمی کے زمانے ہی سے اردو شاعری سے آپ کا گہرا تعلق رہا ہے آپ نے قدیم اور جدید ادب کا بڑی گہری نظر اور خاص دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی نکتہ رس نگاہوں نے سمت کے تعین میں نئے آفاق کا سہارا لیا ہے۔ آپ کی تخلیقات میں رکھ رکھاؤ، شائستگی، گیرائی اور گہرائی کے عناصر پوری چابک دستی کے ساتھ ملتے ہیں۔ ابتداہی سے آپ کا ذہن نئی اقدار، تاثرات اور تقاضوں کو قبول کرتا رہا۔ چنانچہ آج آپ کے یہاں ایک ایسی انفرادیت پیدا ہوگئی ہے کہ آپ کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ آپ کی فکر و فن کا اعتراف ہندو پاک کے بہترین اور چوٹی کے نقادوں نے کیا ہے اور خصوصاً جدیدیت کے تعلق سے آپ کی تخلیقی صلاحیت نے جو نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہ جائیں گے۔ آپ کے سانٹ کا مجموعہ "برگِ نوخیز" شائع ہوکر اربابِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کرچکا ہے۔ سانٹ کے مجموعہ کی اشاعت کے سلسلہ میں اولیت کا سہرا آپ کے سر ہے۔ شعوری طور پر عزیزؔ تمنائی نے جدید نظم کے تقاضوں کا پوری دیانت داری کے ساتھ حق ادا کیا ہے۔ آپ کی جدید نظموں کا مجموعہ "سمتیں" برسوں سے منظر عام پر آنے کے لئے بے چین ہے۔

عزیزؔ تمنائی کے سانٹ کے مجموعہ "برگِ نوخیز") کی 1962 میں

اشاعت کے بعد آج تک ہندوپاک سے اس صنف کا کوئی دوسرا مجموعہ منظرِ عام پر نہ آسکا۔ ویسے اس صنف کو منوہر لال ہادی نے بھی اپنے اظہارِ خیال کا وسیلہ بنایا اور بہت زیادہ سانٹ لکھے ہیں مگر اس صنف میں جتنے تجربے عزیزؔ تمنائی نے کئے اس کی نظیر دور دور تک نہیں ملتی 1970ء سے 1976ء تک مولف تذکرہ نے بھی اس صنف میں جدید رجحانات کے وقت کئی ایک تجربے کئے اور ان تجربوں کی تصویریں بالالتزام "برگِ آوارہ" حیدرآباد میں جگہ پاتی رہیں۔ آج بھی اس صنف میں وسعت اور کشادگی پیدا کرنے کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔ پتہ نہیں عزیزؔ تمنائی کے بعد ان امکانات کی روشنی کو آسمانی فضاؤں تک اونچا اٹھانے میں کون کامیاب ہوتا ہے؟۔

فی الحال اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس صنف کے خاتم عزیزؔ تمنائی ہی ہیں۔ اور اردو ادب کی آخری سانسوں تک "برگِ نوخیز" کی کرنیں تاریخ کے دل ودماغ کو منور کرتی رہیں گی۔

○

کتنی ظالم ہے اُجالوں کا کفن لاتی ہے
رات، سورج کی لحد میں مجھے دفناتی ہے
ان گنت رُوپ ہیں دامانِ نظر میں لیکن
ایک پرچھائیں ہر اک رُوپ میں لہراتی ہے
شب کے سناٹے میں تنہائی کو رُسوا کرنے
چاندنی، خواب حسینوں کے چُرا لاتی ہے
لمحہ لمحہ اُبھرتے ہیں نئے نقش و نگار
ہر صدا دل کے دھڑکنے کی محاکاتی ہے
یوں صبا دے گئی دہلیزِ سحر پہ دستک
میں یہ سمجھا کہ کوئی دیرینہ ملاقاتی ہے
رونقیں جس سے درِ میکدۂ صبح پہ تھیں!
اب وہی سجدہ گہِ شب میں مناجاتی ہے

ہر نفس خوابِ عدم کا ہے تمنائیؔ گماں
زندگی اپنی ہی پرچھائیں سے گھبراتی ہے

○

"زنبیل"

(سانٹ)

مجھ کو عیار کی زنبیل اگر مل جائے
سارے یہ جوہری ہتھیار اٹھا کر رکھ لوں
اور چپکے سے میں مریخ کی جانب چل دوں
سطحِ مریخ پہ کہتے ہیں بڑی ٹھنڈک ہے
نہ وہاں فتنۂ شیطاں نہ شرِ مزدک ہے
نہ سیاست کی ہے گرمی نہ سخن کی گرمی
نہ وہاں امن کی یا حبِ وطن کی گرمی
ارض کی بات ستاروں میں کہاں سے آئے
میں چلا جاؤنگا سب دیکھتے رہ جائیں گے
اہلِ فن، اہلِ فریب، اہلِ فساد، اہلِ فسوں
اسلحے بھول کے بن جائیں گے اربابِ سکوں
حادثے وقت کے سیلاب میں بہ جائیں گے
مسکراؤں گا میں مریخ سے اس دنیا پر
میری زنبیل میں شرمائیں گے سارے جوہر

" ابوالہول کی آنکھ "

(سانٹ)

دیکھتی آئی ہے صدیوں سے ابوالہول کی آنکھ
کتنے لوگ آئے گئے خاک میں روپوش ہوئے
کتنے ہنگامے اٹھے دب گئے خاموش ہوئے
وقت کے قافلے گذرے ہیں انھیں راہوں سے
یہی صحرا رہے آباد شہنشاہوں سے
کتنے رنگین فانوں نے جنم پایا ہے
کتنی صدیوں نے زمانوں نے جنم پایا ہے
اور تکتی رہی برسوں سے ابوالہول کی آنکھ
آج اس آنکھ میں ہلکی سی جھپک پاتا ہوں
ایک مستقبل خوش رنگ کی غماز ہے یہ
ایک فردائے خوش آئند کی آواز ہے یہ
خورد سال آنکھ میں ننھی سی چمک پاتا ہوں
افق کہنہ پہ پھوٹی ہے نئی تازہ کرن
جگمگا اٹھا ابوالہول کا تاریک وطن

"حساب"

گہری نیند میں سارے عناصر بکھر گئے
بچی کھچی پونجی کو
سوا نیزے کا سورج
چاٹ گیا
مجھ سے حساب طلب کرتے ہو !
میں تو ایک عظیم مفر ہوں

"قسمت"

چادر تان کے لیٹ گئی ہے
یوں لگتا ہے
حشر کی صبح یہ اٹھی بھی تو
میرے خلاف گواہی دے گی
اپنی صفائی پیش کرے گی

"زندگی"

مری چشمِ حیراں کو
آہستگی سے قرینے سے چھو کر
وہ یوں بے نیازانہ آگے بڑھی
تعاقب میں عمرِ رواں کٹ گئی

"لہو کا سمندر"

عمر بھر کی کشمکش کے باوجود
اس کی موجوں سے ابھی تک ہے تعلق برقرار
یہ سمندر اک نہ اک دن مجھ کو باہر پھینک کر
خود بخود پھر منجمد ہو جائے گا
مٹ جائے گا

"امید"

وہ کوئی سایۂ موہوم نہیں
شبِ تاریک کی سہمی ہوئی خاموشی میں
جو دبے پاؤں تعاقب میں چلا آتا ہے
وہ کوئی موج خوش آہنگ نہیں
جو سرِ راہ شعاعوں کا بچھائے ہوئے دام
تاک میں ہے کہ کوئی تشنۂ آب آئے گا
وہ کوئی ابرِ سیہ پوش نہیں
جس کے دامن سے الجھتی ہوئی چشمِ ایام
متلاشی ہے کسی چاند کسی تارے کی
وہ کوئی گرد نہیں دھند نہیں دود نہیں
وہ بہر سمت نمایاں تو ہے موجود نہیں

"عکس"

تم جو چاہو تو کسی نقطۂ لرزاں سے
کسی سمت چلو
اور کسی زاویۂ دیدۂ حیراں سے
کسی خط افق کو دیکھو
اور جو چاہو کسی مضراب سے
ہر سازِ نہاں کو چھیڑو
ایک ہی دائرۂ حد نظر
ایک ہی زیر و بم نغمہ بہ انداز دگر
رگِ احساس کو چھوتا ہوا لہراتا ہوا پاؤ گے
مثلِ آئینہ آفاق مسلسل حیراں
ایک ہی عکس سے ہر بار لپٹ جاؤ گے

غزل

اٹھا کے میرے ذہن سے شباب کوئی لے گیا
سپرد کر کے خاموشی کی مہر خوش نما مجھے
ہے اعتراف میرے ہاتھ میں جو ایک چیز تھی
شجر شجر ورق ورق پیامبر ہے آج بھی

اندھیرے چیختے ہیں آفتاب کوئی لے گیا
لبوں سے نعرہ ہائے انقلاب کوئی لے گیا
سنبھال کر رکھا تو جناب! کوئی لے گیا
اگرچہ ہر صحیفہ ہر کتاب کوئی لے گیا

شناخت ہو سکی نہ پھر بھی یہ مرا قصور تھا
ہمارے درمیاں تھا جو حجاب کوئی لے گیا

○

"قصۂ درد"

چاند نے مسکرا کر کہا
دوستو
قصۂ درد چھیڑے سرِ راہ کون ؟
پھر بھی تارے مصر تھے
کہ ہم آج کی شب سنیں گے
وہی ان سنی داستاں
دیر تک چاند سوچا کیا
دور آفاق کی سمت دیکھا کیا
اور تاروں کی آنکھیں جھپکتی رہیں
رات کے دامنِ تر کو
آہستہ آہستہ
لمحوں کا ٹھنڈا لہو
جذب ہو ہو کے رنگیں کرتا رہا
ناگہاں ایک نادیدہ زریں رقم
دست سیمیں بڑھا اور افق تا افق
ایک جنبش میں کھینچے ہزاروں کروڑوں طلائی خطوط
ڈوب کر رہ گئے شب کے سارے نقوط
چشمِ آفاق سے
اوس قطرۂ درد ٹپکا
کسی برگ نوخیز پر
عکس انجام رخسار آغاز پر

مطبوعہ "نئے نام"
سنہ ۱۹۶۷ء

نثار بھارتی

نثار بھارتی بہ مقام وانمباڑی (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ آپ نہ عالم ہیں نہ مفکر نہ کوئی فلسفی، سراپا شاعر ہیں۔ کم کہتے ہیں مگر بہت اچھا کہتے ہیں۔ آپ نے ابلاغِ خیال کے سلسلے میں کبھی دیانت داری کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ آپ بدلتی ہوئی قدروں اور عصری رجحانات سے آگاہ ہیں۔ روایت کا احترام آپ کے پاس ضرور ہے لیکن اندھی تقلید کی روش کو آپ نے کبھی نہیں اپنایا۔ آپ کا اپنا ایک منفرد لہجہ ہے اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ آپ کی آواز عبدالحمید عدمؔ سے ملتی جلتی ہے۔ آپ بڑے بانکے شاعر ہیں۔ اور آپ کے ذہن و فکر کا بانکپن آپ کی تخلیقات میں جا بجا نظر آتا ہے۔

آپ نے بھی عزیز تمنائیؔ کے ہمراہ سانیٹ کی صنف کو بہت اونچا اٹھایا ہے۔ اگر آپ چاہتے تو آپ بھی تامل ناڈو کی سرزمین سے اردو ادب کو ایک اور سانیٹ کا مجموعہ دے سکتے تھے۔ لیکن عزیز تمنائیؔ کا مجموعہ "برگِ نوخیز" نکلنے کے بعد نہ جانے کیا سوچ کر آپ نے خاموشی اختیار کرلی۔

آپ نے حضرت مولانا سید شاہ حبیب اللہ قادر چشتی شطاری رحؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔

قطعات

تاروں کو جھروکوں سے اشارہ کرنا　　پھولوں کی زبانوں سے پکارا کرنا
یہ کیسا ستانا ہے ستانے والے　　نزدیک جو آؤں تو کنارا کرنا

آنکھوں میں کئی رنگ سے بھرے جاتے ہو　　احساس کی رگ رگ میں اُترجاتے ہو
سر پیٹ کے رہ جاتی ہے ناکامیٔ شوق　　تم پاس سے جب ہو کے گزر جاتے ہو

○

"تلاش" سانیٹ

آج بھی اس کے تجسس میں پریشاں ہے نگاہ
جانے وہ کون تھی کیا نام تھا معلوم نہیں
بے خبر اتنی کہ تھی رہزنِ ہوش و تمکیں
تابشِ جلوۂ گل، رَوکشِ ماہ و پرویں
موجۂ بادِ صبا، نشۂ مے، صوتِ ہزار
نکہت و نور کا آئینہ، وہ طاؤسِ بہار
عشوہ و ناز سراپا، وہ جوانی کا خمار
اور در اصل، تصور کی بھی حیراں ہے نگاہ
اس کا جلوہ ہے بہ ہر سمت مگر وہ تو نہیں
اس کی آنکھوں سے ہے ہر انجم رخشاں کا وقار
لب و رخسار سے باقی مہِ کامل کا نکھار
اور آواز ہے ہر ساز کے پردے میں مکیں

میں نے اک بار ہی یارو اسے دیکھا ہے کہیں
تم بتاؤ، کہیں تم نے اسے دیکھا تو نہیں

○○

سیّد عثمان فہمیؔ عمری

سید عثمان فہمیؔ عمری جامعۃ دارالسلام عمرآباد کے فارغ التحصیل، کہنہ مشق شاعر اور بہترین ادیب ہیں ۔ آپ 23 ر مارچ 1926ء میں پتنگرم تعلقہ ترپاتور ضلع شمالی آرکاٹ میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد سید شریف مرحوم صوم وصلوٰۃ کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ علیم اللہ شاہ قادری کے مرید بھی تھے ۔ جامعہ دارالسلام کے تعلیمی دور میں اور علامہ شاکرؔ نائطی کی صحبتوں میں حضرت فہمیؔ نے شعر کہنا شروع کیا اور موصوف سے بھرپور اکتسابِ فن بھی کیا ہے غزل آپ کی پسندیدہ صنف ہے

○

کم ہوسکی نہ گردشِ چرخِ کہن ابھی — ہر حادثہ ہے زیست کا ہمت شکن ابھی
پہنچا نہیں جنوں ابھی معراجِ عشق کو — آئی نہیں وہ منزلِ دار ورسن ابھی
سازِ طرب پہ چھیڑیئے فہمیؔ کوئی غزل — پھیکا ہے رنگ محفلِ شعر وسخن ابھی

○

راجیؔ صدیقی

محمد محی الدین علی راجیؔ صدیقی 25ر نومبر 1927ء بہ مقام مدراس پیدا ہوئے۔ آپ ایک مرنجان مرنج شاعر ہیں۔ شعرگوئی کی فطری صلاحیت کے ساتھ فن کے نشیب و فراز پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ آپ کی طبعی متانت اور شستہ ذوق کی لطافت آپ کی تخلیقات میں جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔ کہنہ مشق شاعر ہیں آپ نے نئی نسل کے کئی شعراء کی رہنمائی بھی فرمائی ہے۔ ایک خاص لگن کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ بھرپور تغزل کی کیفیت آپ کے کلام کی بنیادی خصوصیت ہے۔ قدیم اور جدید ادب سے آگاہ ہونے کے باوجود صالح روایات کا بڑی پابندی کے ساتھ احترام کرتے ہیں۔ آپ کا لہجہ غزل کی دین ہے۔ فن پر گہری نظر ہونے کی وجہ سے آپ کا کلام اسقام وعیوب سے پاک رہتا ہے۔ کم کہتے ہیں لیکن بہت اچھا کہتے ہیں۔ نہ "جدت برائے جدت" کے قائل ہیں نہ محض "ادب برائے ادب" کے۔ یہ ادب برائے زندگی کے ساتھ ادبی رعنائیوں سے دامن نہیں بچاتے بلکہ دونوں کا حسین امتزاج آپ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ طبیعت میں بڑی سنجیدگی ہے۔

آپ کے شعری اُفق پر کہیں غالبؔ کی فکری پھلجھڑیاں انگڑائیاں لیتی ہیں تو کہیں میر تقی میرؔ کے لہجہ کی بھرپور رعنائیاں اُچھلتی، کودتی، ناچتی، گاتی خراماں خراماں پڑھنے والوں کے ذہنی آنگن میں اُترنے لگتی ہیں۔

راجیؔ صدیقی تامل ناڈو کے شعری ادب میں اپنی ایک الگ راہ متعین کرچکے ہیں۔

اس ہست وبود غم کا میں بھی کبھی خدا تھا　　سورج اُفق اُفق پر میرا چمک رہا تھا
وہ جان کر بھی مجھ سے انجان ہو رہا تھا　　پتھر کی طرح میں بھی اک بت بنا کھڑا تھا
صدیوں سے ڈھونڈ کر بھی جس کو نہ پا سکا تھا　　میرے ہی تن بدن میں اندر کا دیوتا تھا
اہل شعور دل کے کانوں سے سن رہے تھے　　گو مجھ کو چپ لگی تھی غم میرا بولتا تھا

کیا پوچھتے ہو راجیؔ آغازِ غم کے لمحے
سب جور آزمانے میں صبر آزما تھا

کون محفل میں تری بندۂ او ہام نہ تھا　　ایک میں تھا کہ مجھے تیرے سوا کام نہ تھا
دل کے گوشوں میں تجھے ڈھونڈ رہے تھے ہم لوگ　　آج کی طرح یہ بازارِ نظر عام نہ تھا
تو نہیں تھا تو تیری یاد کی باہیں تھیں دراز　　مجھ پہ عائد کبھی تنہائی کا الزام نہ تھا
تجھ کو اس وقت بھی کافر نہ کہا تھا میں نے　　کفر ہی کفر تھا جس دور میں اسلام نہ تھا

مجھ سے بیگانہ سہی چشم زمانہ راجیؔ
کس خرابات کے دفتر میں مرا نام نہ تھا

نگاہ مجھ سے ملائے گی چشمِ یار کہاں　　وفا پرست کہاں وہ وفا شعار کہاں
وہ میرے بس میں نہیں ہاں وہ میرے بس میں نہیں　　خود اپنی ذات پہ ہے مجھ کو اختیار کہاں
غروب ہو نہ سکا انتظار کا سورج　　دکھائے منہ ہمیں اب شامِ اعتبار کہاں
مزاج سرد ہوا جا رہا ہے راتوں کا　　جلاؤ داغ ستارے ہیں نور بار کہاں

صلیب ودار کا عالم ہے ہر طرف راجیؔ
پہنچ گیا ہے میری زیست کا دیار کہاں

پہلو میں لئے غم کا اُجالا نہیں آتا　　محفل میں تری ایک بھی مجھ سا نہیں آتا
گردش میں سماوات ہیں چکر میں زمیں ہے　　مرکز پہ زمانے کو ٹھہرنا نہیں آتا
پہچانتی ہے تم کو مرے نام سے دنیا　　حیرت ہے تمہیں نام ہی میرا نہیں آتا
اس دورِ پُر آشوب میں جینا ہے بڑی بات　　راجیؔ ہمیں جینے کا سلیقہ نہیں آتا

کاوشؔ بدری

وے پا عبدالرزاق پاشاہ کاوشؔ بدری بہ مقام آمبور (شمالی آرکاٹ) 3؍ فروری 1927 کو پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم آمبور میں اور بی۔ اے تک کی تعلیم محمڈن کالج مدراس سے حاصل کی۔ کاوشؔ بدری کی شاعری نے اس روایاتی ماحول میں آنکھ کھولی تھی جس کا شکار اکثر شاعر ہوتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے جدیدیت تک کے مرحلے کو آپ نے جس جاں فشانی اور محنت سے طے کیا وہ قابلِ قدر ہے۔ آپ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ عصری رجحانات کو اپنی تخلیقات میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً آپ نے موجودہ معاشرے کے استحصالی عوامل کے خلاف غزل کی زبان میں احتجاج کیا ہے۔ دراصل آپ کے نثری کارنامے ہوں یا نظم کے تیکھے نقوش آپ کا ہر تخلیقی عمل احتجاج ہی کا ایک لطیف اور تھرتھراتا روپ ہے۔ آپ نے زندگی کے تلخ حقائق سے کبھی مُنہ نہیں موڑا ہے اور نہ اس کے آگے سپر ڈالنے کا ارادہ کیا ہے۔ فن کے تعلق سے آپ نے غم کی ہمیشہ قدر کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بہت مناسب ہوگا کہ ہجومِ غم ہی نے آپ کو بہت اونچا اٹھایا ہے۔ آپ نے جہاں صالح روایاتی عناصر کا پاس رکھا وہاں آپ نے جدیدیت اور عصری آگہی سے تجاہل بھی نہیں برتا۔ خصوصاً ترسیلِ خیال کے سلسلے میں آپ نے بعض مقامات پر جرأتِ رندانہ سے بھی کام لیا ہے۔ یہ جرأتِ مندانہ اقدام آپ کے منحنی جسم کے اندر دھڑکنے والے حوصلہ مند دل کی غمازی کرتا ہے۔ آپ کی فنی بصیرت، شعری استعداد اور بھرپور صلاحیت کے نقوش ہند و پاک کے شعراء اور ادیبوں کے دل و دماغ میں ہمیشہ منور رہیں گے۔

کاوشؔ بدری نے تامل ناڈو کے اردو ادب میں جو اہم رول ادا کیا ہے

اسے تامل ناڈو کی ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ اور زندگی کی مسکراتی ہوئی کہکشاں کا تازہ لہو تامل ناڈو کے اردو ادب کے لئے وقف کردیا۔

آپ تامل ناڈو کے وہ جیالے فن کار ہیں جو ہر اُفق، ہر فضا، ہر جادہ اور ہر منزل سے بے نیازانہ گذر جاتے ہیں۔ اور آپ کے فکر کے سائے دور دور تک پھیل جاتے ہیں وہ غم کے سلگتے ہوئے صحرا میں بہاروں کو جنم دیتے ہیں اگر آپ اتنے ہی انہماک کے ساتھ معاشی اور اقتصادی زندگی کی تعمیر کے سلسلے میں کام لیتے تو آج آپ کا شمار بھی تامل ناڈو کے بڑے بڑے سرمایہ داروں میں ہوتا لیکن آپ کی زندگی دراصل ایثار اور مسلسل قربانیوں کی ایک ایسی بسیط تاریخ ہے کہ جسے کبھی زمانہ فراموش نہیں کرسکتا۔ حالانکہ آپ کا آبائی وطن آمبور ہے لیکن ان کی ادبی زندگی اور ادبی سفر کا کم و بیش تمام تر حصّہ ابتدائی دور کو چھوڑکر، شہر مدراس میں گذرا۔ آپ مدراس یونیورسٹی میں بطور Assistant مقرّر ہوئے اور چند سال پہلے آپ کا تبادلہ انّا یونیورسٹی مدراس کو ہوا جہاں وہ (S uperintendent) کے عہدے پر فائز ہوئے عنقریب وظیفہ یاب ہونے والے ہیں۔

کاوش بدری صاحب کے ادبی کارناموں میں ماہ نامہ "فن کار" 1950ء اور ماہ "منزل" 1953ء بھی شامل ہیں۔ جو آپ کی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ ہندو پاک کے مقتدر فن کاروں کی تخلیقات ان ماہناموں میں جگہ پاتی تھیں۔ یہ کاوش صاحب کے ادبی سفر کی پہلی اونچی اڑان تھی۔

کاوش بدری صاحب کے ابتدائی بزرگ ہم سفروں میں حضرت دانش فرازی کا نام ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔ چونکہ حضرت دانش فرازی کاوش کے ماموں بھی تھے۔ اس حیثیت سے کاوش بدری صاحب نے دانش فرازی صاحب سے اپنے ابتدائی دور میں ادبی طور پر بہت زیادہ استفادہ کیا تھا اور آگے چل کر آپ نے مولانا رحیم احمد فاروقی صاحب سے بھی اکتساب نور کیا۔

کاوشؔ بدری صاحب نے میرے دادا پیر حضرت قبلہ مولانا مولوی خواجہ حبیب اللہ شاہ قادری چشتی نقشبندی سہروردی کے دستِ مبارک پر 1971ء میں بیعت کی (طویل نظم "کاویم" اپنے پیر و مرشد کے نام ہی معنون ہے) اور اپنے شیخ کے وصال کے بعد آپ حضرت مولانا مولوی الحاج غلام احمد کلیمی صاحب (حیدرآباد) کے 1979ء میں طالب ہوئے۔

آپ کا ایک اور اہم کارنامہ "تامل ناڈو کی تاریخ ادب اردو" ہے جو زیرِ تالیف ہے۔ آپ کی یہ تالیف منظر عام پر آجائے تو تامل ناڈو کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور ان کے پس منظر میں سانس لینے والی پرنور شعاعوں کی صحیح تاریخ ہمارے سامنے آئے گی۔

مختلف اصنافِ سخن پر آپ کو جتنی دسترس حاصل ہے اتنی شاید کسی اور فن کار کو نصیب نہیں۔ لیکن آپ کی استعداد اور تخلیقی صلاحیت کا جوہر آپ کی غزلوں میں کھلتا ہے تعجب اس بات کا ہے کہ آج تک آپ کی غزلوں کا مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے۔

آپ کی تین تصانیف "مثنویٔ قبلہ نما" (1965ء / ۱۳۸۵ھ)، "شردھانجلی" (1964ء / ۱۳۸۴ھ) "کاویم" (1977ء / ۱۳۹۸ھ) منظر عام پر آچکی ہیں۔

○

ایک سجدہ خوش گلو کے آگے سہواً ہو گیا
اس پہ کوئی معترض ہوگا تو قصداً ہو گیا

کفر کا فتویٰ ہوا صادر تو خوش قسمت تھا میں
تذکرہ میرا بھی ہر مسجد میں ضمناً ہو گیا

آناً و فاناً کسی نے دست گیری کی مری
کام تھا مشکل کا اہلاً و سہلاً ہو گیا

خواب میں اک بار دیکھا تھا کبھی میں نے جسے
دو بدو اس سے تصادم اتفاقاً ہو گیا

مستحقِ جنت کا اک کاوشؔ نہیں وہ بھی تو ہے
قتل میرا ایک جاہل سے جو شرعاً ہو گیا

سخت دشوار سہی شہر بدر ہو جانا
فاتح رہگذر فتح و ظفر ہو جانا

ذہن نادیدہ منظر کا مرقع ہو جائے
گفتۂ ناسخن فکر و نظر ہو جانا

پاؤں پکڑو تو نہ موج آئے نہ دم خم ٹوٹے
ہاتھ دھو کر کسی معشوق کے سر ہو جانا

رک نہ پائے کوئی تھک ہار کے منزل کی طرح
سایہ بردار نہ ہو ایسا شجر ہو جانا

ہے مکمل وہ حقیقت جو کہانی ہو جائے
بات ادھوری ہے اگر شرح معانی ہو جائے

اتنا سوچو کہ لگا ہوں سے سفیدی ٹپکے
اتنی پی جاؤ کہ خود خون بھی پانی ہو جائے

لطف تو آئے گا غزلوں میں تفکر نہ سہی
کم سے کم تذکرہ عہد جوانی ہو جائے

بھولی بسری ہوئی یادوں کے پلندے کھولو
اس بہانے ہی مری یاد دہانی ہو جائے

گوشہ عرش پہ کاوش ہے دعا میں مشغول
لب پہ جاری مرے "ما اعظم شانی" ہو جائے

دل مرا مندر تھا لیکن صحن مسجد ہو گیا
ایک کثرت کا پجاری بھی موحد ہو گیا

زنگ آلود نظر آنے لگا فولاد علم
چھوڑ کر لوہار کو پاسنگ مرشد ہو گیا

کثرتِ احباب میرے حق میں قاتل بن گئی
اب یہ عالم ہے ہجوم فکر واحد ہو گیا

بیعتِ جام و سبو خود اس پہ لعنت بن گئی
ایک مرید باسند صد حیف مفسد ہو گیا

نامہ و پیغام کاوش خود بخود چلنے لگے
دل بنا معشوق میرا ذہن قاصد ہو گیا

نم ہو کے لفظ ہستی شبرنگ ہو گیا ہے
کاغذ کا حسن مثل ارژنگ ہو گیا ہے

میزان فکر و فن میں تلنا تھا تولنا تھا
اس دھن میں لعل یکتا پاسنگ ہو گیا ہے

کر کے طوافِ سدرہ وہ گنگنا سکے گا
بننا تھا پھول جس کو سارنگ ہو گیا ہے

وحدت کی وسعتوں کو کثرت کا نام کیوں دیا
یک رنگ کارگاہِ صد رنگ ہو گیا ہے

ساری کتابیں کاوش تم حوض میں ڈبو دو
جو حرف معتبر تھا فرہنگ ہو گیا ہے

پاؤں پھیلاؤ جتنی چادر ہے
بے حیائی سے موت بہتر ہے

عطر چھڑکا ہے شیشۂ غم نے
دامنِ دشتِ فن معطر ہے

اتنا کس بل نہیں ہے ڈوری میں
حد سے آگے بڑھو تو خنجر ہے

سر پہ طرّہ گلے میں ہار بھی ہے
کاوشؔ تم جس گلی کا چکر ہے

ظاہر پہ خاک ڈالیو باطن سجائیو — اپنے سوا کسی کو نہ خاطر میں لائیو
ملتی ہے جس مقام سے دانشوری کو بھیک — ہوش و حواس کے وہیں سجدے لٹائیو
آواز ہم حروفِ تہجی کی سُن چکے — کچھ خاص بات ہے تو نظر سے سنائیو
ملیو تو کھل کے مہرِ درخشانِ ذات سے — دامانِ مہر و ماہ سے دامن بچائیو
ساری کتابیں پھینک کے دریا میں کاوشؔ
جاہل کی طرح دشت میں نیکی کمائیو

مناسب کو مناسب لکھ رہے ہیں — اقارب کو عقارب لکھ رہے ہیں
تمیزِ نیک و بد باقی نہیں ہے — ہر اک کے ساتھ صاحب لکھ رہے ہیں
صفاتِ ذات سے ہم ہو گئے نادم — محاسن کو معائب لکھ رہے ہیں
فقط انجام پر جن کی نظر ہے — مسرت کو مصائب لکھ رہے ہیں
سبھی مغلوب ہیں صنفِ غزل میں — کہاں ہم مثلِ غالبؔ لکھ رہے ہیں
نہ تائب ہو سکا کاوشؔ ابھی تک — اسی کو لوگ تائب لکھ رہے ہیں

اجملؔ سعیدی

سید محی الدین اجملؔ سعیدی (ولادت 1927ء) مدراس کے ان کہنہ مشق شعراء میں سے تھے جن کا ذکر اس کتاب میں نہایت لازمی ہے۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے آخر عمر تک انھوں نے کئی مستند شعراء سے مشورۂ سخن کیا۔ حضرت دانشؔ فرازی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد ان کی شاعری میں جدیدیت کے چراغ بھی روشن ہوئے تھے اور ان کی سوچوں نے نئی کروٹ بھی بدلی تھی۔ گویا ان کی پوری شاعری، شاعری کے قدیم روایات کی پاس داری اور نت نئے دلکش رنگوں کی بوقلمونیوں سے آراستہ ہے۔ سلطان قدیرؔ کی طرح اجملؔ سعیدی بھی عوامی شاعر کی حیثیت سے تامل ناڈو کے احباب کے ذہنی اُفق پر چھائے ہوئے تھے۔ 1985ء میں انتقال ہوا۔

○

کہیں بھی رنگ مری فکر کا نہیں ملتا
کسی کے لہجہ سے لہجہ مرا نہیں ملتا

فصیلِ شب پہ جلاتے رہو لہو کے چراغ
اُفق پہ نورِ سحر کا پتا نہیں ملتا

میں اپنی عمر کو قسطوں میں قتل کرتا ہوں
یہ اور بات مجھے خوں بہا نہیں ملتا

وہ خانقاہ ادب ہو کہ مکتبِ دانش
یہاں سے اہلِ بصیرت کو کیا نہیں ملتا

ہر اک ساز کی آواز منفرد ہے مگر
کسی میں سوز مری روح کا نہیں ملتا

نہ جانے منزلِ مقصود کب ملے اجملؔ
رہِ ادب میں تیرا نقشِ پا نہیں ملتا

فدوی باقوی

مولانا نثار احمد فدوی باقوی فرزند حبیب اللہ ندوی باقوی (جو اپنے وقت کے جید عالم، ماہر لسانیات اور مفتی و فقیہ تھے) 1928ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ نے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم باقیات سے حاصل کی۔ 1945ء سے 1953ء تک تجارت کے سلسلے میں کیرالا (ترور) گئے۔ اور اس کے بعد دوبارہ 1953ء کے آخر میں باقیات ویلور آئے اور یہیں منتظم کتب خانہ کے عہدے پر فائز ہوگئے اور آج بھی اسی عربی کالج میں بحیثیت سوپرینڈنٹ کام کررہے ہیں۔

مولانا فدوی باقوی کا شمار تامل ناڈو کے ان ارباب فن میں ہوتا ہے جنہوں نے تامل ناڈو کے ادبی ماحول کو خاص توجہ اور بصیرت کے ساتھ نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ آپ فن پر بڑی اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ آپ کا مطالعہ وسیع ہے فکر بلند اور عزائم راسخ۔ آپ کی شاعری کا لہجہ قدیم ہونے کے باوجود تنوع، جدّت اور سحر طرازی کا حامل ہے۔ نثر اور نظم دونوں پر بھرپور عبور حاصل ہے آپ کی تخلیقات میں اگرچہ عصری آگہی اور جدید حسیت کے عناصر بہت کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن آپ نے نوجوان شعراء کی ذہنی، ادبی اور علمی تربیت فرمائی ہے ان کے لہجہ کا تیکھاپن، جدیدیت سے بہت قریب تر ہے۔

1974ء میں مولانا فدوی باقوی کی تالیف "محدثِ جنوب" باقیات الصالحات کے صد سالہ جشن کے موقع پر منظر عام پر آچکی ہے۔ یہ کتاب وہاب العلوم، شمس العلماء اعلیٰ حضرت عبدالوہابؒ کی مختصر سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب سے بانیِ مدرسہ عبدالوہاب کی مذہبی، علمی اور دینی خدمات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا فدوی باقوی کے مختلف تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "حاصلِ مطالعہ" اور "سیارگانِ جنوب" ہنوز زیرِ ترتیب ہیں ۔ ان دونوں کتابوں میں مولانا کی معرکتہ الارار تحقیقات شامل ہیں ۔ اگر یہ دونوں کتابیں اشاعت کی منزل سے گذر کر منظرِ عام پر آجائیں تو یقیناً مدراس کے اردو ادب کی تاریخ میں اضافہ ثابت ہوں گی ۔

○

آغاز نہ تھا جس کا وہ انجام کو پہنچے | ناکردہ خطا، ہم ترے الزام کو پہنچے
ہر داؤ ستم گر کو یہاں ہم نے ہرایا | آرام سے ہر منزلِ آلام کو پہنچے
دُنیا کو یہ غرّہ کہ نہیں دی کوئی قیمت | دیوانوں کو ہے ناز کہ ہم دام کو پہنچے
دنیا نہیں فدوی میں اسے شعر کی صورت | جو فکر نہ کیفیتِ الہام کو پہنچے

○

آئینہ دل، گردِ ملال | حسنِ نظر کا درد، مآل
خواب و خیالِ انسان کیا | انساں خود اک خواب و خیال
آج بھی بالادست ہیں ناکس | دست نگر ہیں اہلِ کمال
زاغ و زغن کا قبضہ چمن پر | بلبلِ محزوں بے پر و بال
بھولنے والی اس دنیا میں | یاد ہے کس کی، کس کا خیال
سانچے میں سب کو ڈھالنے والے | ڈھال سکے تو خود کو ڈھال

روئے گا فدوی ہم کو زمانہ
"قدرِ نعمت بعدِ زوال"

ہستی کی خدا جانے یہ کونسی ہے منزل | جینا بھی ہمیں مشکل، مرنا بھی ہمیں مشکل
ہے سربسر اپنی بھی، پھر ہے نہیں اپنی بھی | اللہ رے تری محفل! اللہ رے تری محفل!
ہر عشرت ہستی سے ہم خود ہی گریزاں ہیں | ہم ہر غمِ دنیا میں خود آپ ہوئے شامل

فضا حریف، زمانہ رقیب ہے اپنا
حوادثات سے رشتہ قریب ہے اپنا
ہو کوئی وقت لبوں پر طرب کے نغمے ہیں
وسیع ظرف، دل کم نصیب ہے اپنا
ہمیں کہاں ہوئی محسوس اپنی تنہائی
غم حبیب بجائے حبیب ہے اپنا

جتنا آگے قدم بڑھاتا ہوں
بڑھتا جاتا ہے بُعد منزل کا
غیر کا ذکر کیا محبت میں
کھلتا جاتا ہے خود بھرم دل کا
دونوں تکتے ہیں مجھ کو حسرت سے
میں نہ طوفاں کا ہوں نہ ساحل کا

« رباعیات »

جز معصیت و گناہ، کچھ بھی نہ کیا
ہوں بندۂ روسیاہ، کچھ بھی نہ کیا
اک عمر دراز کاٹ دینے پر بھی
اے ربِّ غفور! آہ، کچھ بھی نہ کیا

بخشے جو نہ تو مجھے تو ہے کونسی راہ
دے تو نہ اماں تو ہے کہاں جائے پناہ
ہونے ہی کو ہوں بحرِ معاصی میں غرق
اے ربِّ رحیم! ایک رحمت کی نگاہ

اے خالق بے نیاز! ربّ اکبر
ہے ملتجی تیرا بندہ تیرے در پر
کچھ دے کہ نہ دے اے مگر اے داتا
تو اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کر

آسائش جسم و تندرستی نہ سہی
داتا! نہ سہی سکونِ ہستی نہ سہی
کیجو نہ مجھے غیر کا مرہونِ کرم
دولت نہ سہی فراغ دستی نہ سہی

ملک ضیاؔ

اے ایل۔عبدالمالک ملک ضیاؔ 1928ء میں بہ مقام وانمباڑی (شمالی آرکاٹ)پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے شعرشاعری کی طرف مائل تھے۔ راز چاندپوری اور سیماب اکبرآبادی کی شاگردی میں اپنے شعری جذبوں کو سرسبز اور شاداب بنایا—— بالخصوص نعت گوئی میں اپنی عقیدتوں کے وہ نورانی گہر چمکائے جس کی چمک سے آج بھی شہر وانمباڑی ضوفشاں ہے۔صنفِ غزل میں بھی آپ نے نت نئے جوہر دکھائے ہیں۔

○

ہر آدمی کا دیکھئے چہرا لہولہو ہر گام پر ہے ایک نظارا لہو لہو
سورج کا قتل جیسے سرِشام ہوگیا دریا لہو لہو ہے کنارا لہو لہو
ہم دونوں ایک رشتۂ جاں سے ہیں منسلک ہوجائیں گے جدا تو سراپا لہولہو
یہ عقدہ ہم پہ کھل نہ سکا آج تک ضیاؔ
کیوں ہے سلگتی دھوپ میں سایا لہولہو

○

فوقی نائطی

عبدالغفار فوقی نائطی بہ مقام مینمبور 29 ، دسمبر 1928ء کو پیدا ہوئے۔ اردو کی ابتدائی کتابیں علامہ شاکر نائطی کے گھر پر پڑھیں۔ فارسی، عربی کی تعلیم جامعہ دارالسلام سے حاصل کی اور یہیں سے سند یافتہ ہونے کے بعد مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل پاس کیا۔ پھر مسلم علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ 1947ء سے 1951ء تک مدراس کارپوریشن اسکول میں اردو کے استاد رہے۔ 1968ء میں مدورے وقف بورڈ کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر آپ کا تقرر ہوا اور آج بھی اسی کالج میں علم و ادب کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ 1943ء میں آپ نے اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔ شاعری کے ابتدائی دور میں علامہ شاکر نائطی کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے۔ ہم نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا ہے کہ آپ نے آج تک اپنے خول سے باہر نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ بعض لوگوں کے متعلق یہ سوچتے ہوئے واقعی رنج ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں فراغ دلی سے جن صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ ان کے مصرف سے بالکل بے بہرہ ہیں اگر فوقی چاہتے تو اردو ادب کی دنیا میں نمایاں کارنامے انجام دیتے لیکن نہ جانے کن وجوہات کی بناء پر آپ نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا ہے جس کا تعلق ادب کے اونچے آفاق سے نہیں ہے۔

جب چھوڑ چلے تم ہی پھر کون ہمارا ہے
اک دل ہے سو پہلو میں وہ درد کا مارا ہے

موجوں کا تلاطم ہے گرداب حوادث بھی
طوفاں کے قریں کشتی اور دور کنارا ہے

گھبرا نہ زمانے میں آلام سے اے فوقی
دل میں جو محبت ہے سو طرح کا یارا ہے

نورسؔ خیامی

سید قاسم نورسؔ خیامی 29ر جون 1929ء کو بہ مقام مدراس پیدا ہوئے۔
آپ کے والد سید مدار صاحب سدرن ریلوے میں آڈٹ انسپکٹر کے عہدے
پر فائز تھے۔ آپ محمڈن کالج مدراس سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد
مدراس کارپوریشن میں بحیثیت ریونیو انسپکٹر مامور ہوئے۔

نورسؔ خیامی تامل ناڈو کے اُن جواں فکر فن کاروں میں سے ہیں جنہوں
نے خاص انہماک اور لگن سے اردو کی خدمت ہی نہیں بلکہ اپنے تخلیقی عمل کے
راستے کو بھی ہموار کیا۔ شاعری کی طرف نورسؔ کا رجحان فطری ہے۔ طالب
علمی کے دور ہی سے انہوں نے شعر کہنا شروع کیا اور اسی دور میں کاوشؔ
بدری کی معیّت میں ماہنامہ "فن کار" کا اجرا کیا۔ تامل ناڈو کا یہ وہ ماہنامہ
ہے جس پر ہندوستان کے مشاہیر نے اپنی بہترین رائے کا اظہار کیا۔
نورسؔ کو خصوصاً موسیقی سے ایک وہبی لگاؤ ہے جس کی وجہ سے
اُن کی تخلیقات میں غنائیت کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ
نورسؔ کے یہاں فکری عمق کا کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن ان کا جمالیاتی
ذوق اتنا شستہ اور شائستہ ہے کہ رومانیت کی چھاپ سے ان کا قلم
ملوث نہیں ہوتا۔ نورسؔ کی تمام تر شاعری داخلیت سے تعلق رکھتی
ہے۔ جذبات کی ترجمانی میں نورسؔ کا لہجہ جانا پہچانا ہے۔ وہ کبھی معلق
الفاظ غیر مانوس تراکیب اور سنگلاخ بندشوں سے کام نہیں لیتے بلکہ
ان کے یہاں دل کو چھو جانے والی سادگی ملتی ہے۔ اور پھر بے ساختگی کا
وہ عالم کہ وجدان جھوم جھوم اٹھتا ہے۔

نورسؔ کو مختلف اصنافِ سخن پر بیک وقت دسترس حاصل ہے انہوں نے
غزل، نظم، قطعات اور گیت بھی لکھے ہیں لیکن خوبی یہی ہے کہ ہر ایک

ہیں اُن کی فنی شخصیت کا شائبہ ضرور نظر آجاتا ہے۔ آج بھی وہ خاص لگن اور انہماک کے ساتھ اردو ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اس کی زندہ مثال ان کا مرتب کیا ہوا جریدہ "روپ رنگ" ہے۔

جولائی 1964ء میں نورسؔ نے اپنی تخلیقات کا ایک خوب صورت مجموعہ "گیسوئے شب" شائع کیا جس کا اربابِ ذوق نے بڑے اچھے انداز میں استقبال کیا۔

○

حیف اس پر جو غرضمند ہو غمخوار نہ ہو
دعوئ عشق زباں پر ہو وفا دار نہ ہو

دل سے کہئے کہ نہ چھوٹے کہیں دامانِ شکیب
بات وہ خود ہی سمجھ جائیں گے اظہار نہ ہو

مل گئے وہ تو یہ سمجھے کہ ملی ہے منزل
دل یہ کہتا ہے کہیں جادۂ دشوار نہ ہو

ہونٹ تک آہی گیا ساغرِ صہبائے بہار
اب یہ دستورِ چمن ہے کوئی سرشار نہ ہو

ان کا پردہ ہی غنیمت تھا نظر کو نورسؔ
اب یہ حسرت کہ کوئی کشتۂ دیدار نہ ہو

○

ہم کو معلوم نہیں ہے کسی قاتل کا پتہ
تم اگر آنکھ ملاؤ تو ملے دل کا پتہ

بجھ گئے چرخ پہ جس وقت ستاروں کے چراغ
اہلِ غم پوچھتے آئے تری محفل کا پتہ

نیلی نیلی ان آنکھوں میں ہے ساگر گہرا
کشتئ دل کا مقدّر نہیں ساحل کا پتہ

کشتۂ خنجرِ تسلیم و رضا ہوں اب تک
آگہی جادۂ ہستی کی نہ منزل کا پتہ

ناخدا لاکھ بھی ہشیار رہی لے نورسؔ
ناؤ پوچھے گی خدا سے ترے ساحل کا پتہ

○

مولانا ناصر باقوی

حضرت مولانا شیخ التفسیر سید شاہ عبدالجبار قادری بتاریخ ۱؍جولائی 1929ء کو ہرووڈنور (ضلع کڑپہ آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ویلور آئے اور 1941ء میں باقیات الصالحات میں داخلہ لیا۔ 1949 میں اسی مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد یہیں مدرس ہوئے۔ آپ اعلیٰ حضرت سجادہ نشین خانوادۂ قطبِ ویلور کے خلیفہ بھی ہیں۔

آپ کا رجحان شاعری سے زیادہ نثر کی طرف رہا ہے۔ علمی اور دینی مضامین بہت زیادہ لکھے ہیں۔ امام غزالی کی کتاب کا ترجمہ عربی سے اردو میں کیا ہے اس ترجمہ کا ایک نسخہ بنام "جان پدر" مولفِ تذکرہ کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے قرآن کی مختلف آیات کی تفسیر بھی کی ہے جو "ایھاالولد" اور "تفسیر الکتاب" نامی کتابوں میں منظرِ عام پر آچکی ہے۔ فی الحال مولانا مدرسۂ باقیات الصالحات میں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

دل کے پھپولے ناخنِ دوراں میں آگئے
آنسو ڈھلک کے گوشۂ داماں میں آگئے

تو خیز شباب اُن کا، چھوٹی سی کہانی بھی
بے درد زمانے نے افسانہ بنا ڈالا

حسرت سہروردی

نطہر قلندر حسرت سہروردی 1930ء میں ترچنا پلی میں پیدا ہوئے۔ عربی، اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں اور اردو میں بی۔ اے کی ڈگری محمڈن کالج مدراس سے حاصل کی۔ تقریباً 20/25 سال سے درس و تدریس کے فرائض اپنے ہی وطن کے مشہور و معروف جمال محمد کالج میں انجام دے رہے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی سے ایم لیٹ کی ڈگری بھی حاصل کی ترچنا پلی کے تامل ماحول میں اردو کو زندگی دینے اور اس کے چراغ کو بجھنے سے بچائے رکھنے میں آپ نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ جسے تامل ناڈو کی ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

آپ ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں ایک اچھے خاصے نثر نگار بھی ہیں۔ آپ کو مختلف اصنافِ سخن پر بھرپور دسترس حاصل ہے۔ آپ کی تخلیقات میں جمالیاتی قدروں کا اظہار بڑی سج دھج اور سبھاؤ کے ساتھ ملتا ہے۔ آپ کی تخلیقات میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ غنائیت کی جلوہ سامانیاں اور ذوق کی تسکین کا ہر نظارہ موجود ہے۔ آپ نے آج تک اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں جس انہماک، لگن اور دیانت داری سے کام لیا ہے یہ ایک نغز گو فن کار کے لئے بہت بڑی بات ہے۔

آپ نے تامل ناڈو کے عظیم شاعر ولور کے "ترو کرل" کا نثری ترجمہ تمل زبان سے نابلد ہوتے ہوئے 1965ء میں پیش کرکے اردو ادب پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔ تامل زبان کا یہ عظیم شاعر تامل کلچر کی وہ زندہ علامت ہے جو کی آج بھی تامل ناڈو میں پوجا کی جاتی ہے۔ اس شاعر کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس نے تقریباً تین ہزار سال پہلے بنی نوع انسان کو ایک خاندان تصور کیا تھا۔ تامل کلچر اور اس کی آفاقیت نے

اس شاعر کا نام اور کام آج تک زندہ رکھا ہے۔ اس ترجمہ کے علاوہ آپ کا مجموعہ کلام " بوئے گل نالۂ دل "1973ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے اس مجموعہ میں مختلف اصنافِ سخن کے جواہر پارے موجود ہیں۔

یادوں کے سہارے جی رہا ہوں ○ ماضی سے لہو نچوڑتا ہوں
آگے نہ مرے نہ کوئی پیچھے اب کس کو تلاش کر رہا ہوں
پایا ہے کھودیا ہے کیا ہے یگ یگ سے یہی میں سوچتا ہوں
ہر منزلِ بندگی سے گذرا تب جا کے کہیں خدا بنا ہوں
حسرت کو تلاش کرنے والو
خود میں بھی اُس کو کھوجتا ہوں

دنیائے محبت کے یہ دستور رہے ہیں ○ اپنے جو ہیں اپنوں سے بہت دور رہے ہیں
جو لوگ سردار، سرطور رہے ہیں وہ لوگ زمانے میں بھی مشہور رہے ہیں
بد نام زمانہ ہیں مگر خود ہیں زمانہ ہم اہلِ وفا آج کے منصور رہے ہیں
جینا ہے تو جینے کا سلیقہ بھی تو سیکھو ہر دور میں جینے کے بھی دستور رہے ہیں
کیا سمجھیں گے وہ آگہئ عصر کو حسرت
جو لوگ زمانے سے بہت دور رہے ہیں

○

دامانِ قفس گوشۂ صاحب نظراں ہے
مدت سے مری یاد میں یہ نوحہ کناں ہے
جلوؤں پہ بھی پہرے ہیں تخئیل پہ بھی پہرے
آزادئ افکار کی دُنیا وہ کہاں ہے
اب تک ہے مجھے یاد نگاہوں کا وہ عالم
تخئیل کی دنیا مری اے دوست جواں ہے
پورب کا نہ پچھم کا نہ اُتر کا ہوں حسرت
دکن کا ہوں دکن کی زباں میری زباں ہے

○

حافظ باقوی رائچوٹی

عبدالرزاق حافظ بہ مقام رائچوٹی (آندھراپردیش) جولائی 1930ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رائچوٹی میں اور مولوی عالم کی سند، باقیات صالحات ویلور سے حاصل کی۔ ادیب فاضل اور بی۔ اے کے امتحانات مدراس یونیورسٹی سے پاس کیے۔ برسوں اردو لکچرر کی حیثیت سے سی۔عبدالحکیم کالج، میل وشارم میں کام کرتے رہے۔ حال ہی میں آرٹس کالج، مدراس میں اردو پروفیسر مقرر ہوئے۔

آپ نے بچوں کے لئے بہت ساری نظمیں لکھیں جن کے نمونے ان کتابچوں "چاند تارے" اور "پھلواری" میں موجود ہیں۔ آپ "مخیر اعظم" کے مولف بھی ہیں۔ اس تالیف میں آپ نے نواب سی۔عبدالحکیم کے سیاسی سماجی، دینی اور مذہبی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے — یہ تالیف کتاب گھر پریس، میل وشارم، شمالی آرکاٹ سے 1975ء میں شائع ہوئی۔

آپ کا ایک نعتیہ مجموعہ "ذکرِ حبیب" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ مولف تذکرہ کو اس کا تیسرا ایڈیشن (سن اشاعت 1952ء) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایڈیشن، دارالاشاعت، مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ کے پیشِ لفظ میں خود حافظ کے استادِ محترم علامہ محوی صدیقی رقم طراز ہیں۔

"حافظ بہت شریف، سعادت مند اور دین دار نوجوان ہیں وہ مجھ سے دیرینہ تلمذ رکھتے ہیں۔ اگرچہ درمیان میں کئی سال تک اصلاح کلام کا سلسلہ بند رہا لیکن حافظ کی مشقِ سخن نعت گوئی اور غزل گوئی برابر جاری رہی۔ زیرِ نظر مجموعہ "ذکرِ حبیب" میں حافظ نے اشعار کے لباس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ جس

والہانہ عقیدت و محبت کو پیش کیا ہے وہ بہت مبارک اور قابلِ تحسین ہے۔"

یہ تاثرات شاید علامہ محوی نے "ذکرِ حبیب" (18، دسمبر 1962ء کے پہلے ایڈیشن میں پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کے متعلق ایک اہم بات یہ بھی لکھی ہے کہ حافظؔ کا کلام فنی اور لسانی کمزوریوں سے پاک صاف ہے اور بہت سی شاعرانہ خوبیوں کا حامل ہے۔"

حافظؔ کے کلام کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پر ضرور پہنچا ہوں کہ وہ فنی اور لسانی کمزوریوں سے پاک ضرور ہے مگر شاعرانہ خوبیوں کا حامل یقیناً نہیں ہے۔ آئے دن یہ دیکھا گیا ہے کہ فن کار فنی اور لسانی طور پر بھرپور دسترس رکھتا ہے وہ کبھی شاعری میں اپنی ذات؛ اور شخصیت کو اونچا اٹھا کر کسی صنفِ سخن کو وسعت دینے کی کوشش نہیں کرتا۔

ہر ایک گُل ہے خارِ مغیلاں ترے بغیر — میرے لئے ہے خلد بھی زنداں ترے بغیر
تیرے ہی ذکرِ پاک سے دنیا ہے برقرار — ورنہ ہر ایک موج تھی طوفاں ترے بغیر
اعجاز تھا یہ تیرے ہی فیضانِ نور کا — اڑتا نہ ورنہ تختِ سلیماں ترے بغیر
اس کی چمک دمک تری مرہونِ حسن ہے — ہوتا سیاہ مہرِ درخشاں ترے بغیر
آجا کہ یادِ مصحفِ رُخ ہے جگر گداز
بے چین ہے یہ حافظِ قرآں ترے بغیر

اصغر ویلوری

اسمٰعیل بیگ اصغر ویلوری بہ مقام ویلور (شمالی آرکاٹ) 29ر جولائی 1931ء کو پیدا ہوئے۔ مدراس یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایم اے بی۔ ایل اٹکل یونیورسٹی سے پاس کیا سدرن ریلوے میں بحیثیت مشیر قانون ملازم ہوئے۔ آپ بھی مدراس کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ شعرگوئی سے والہانہ، دلی وابستگی آپ کے شستہ ذوق کی دلالت کرتی ہے۔ مصروفیات کے باوجود آپ نے فکرِ سخن سے گریز نہیں کیا۔ آپ کی تخلیقات میں آپ کے مزاج کا اضطراب اور افتادگی کی چھاپ پائی جاتی ہے۔ اور آپ ان خوش گو شعراء میں سے ہیں جن سے تامل ناڈو کی شعری فضا سازگار ہوئی۔ آپ کا شعری مجموعہ "حروف" 1992ء میں شائع ہو چکا ہے۔

نغمے یہ کیسے لب پر آئے ○ غم کے بادل دل پر چھائے
صدمے جھیلے دھوکے کھائے　　دل کی خاطر رنج اٹھائے
ہم نے سب کا غم اپنایا　　کون ہمارا غم اپنائے
کچھ تو بتا سمجھانے والے　　کوئی دل کو کیا سمجھائے
کہنا ہے جو کچھ کہہ لے اصغر
بھید نہ لیکن کھلنے پائے

○

تیرے عاشق عام بہت ہیں　　ہم ہی کیوں بدنام بہت ہیں
ہار کو تم نہ جیت سمجھنا　　الفت میں اوہام بہت ہیں
جن میں دل کا خون ہے شامل　　ان اشکوں کے دام بہت ہیں
دل کی قیمت دل ہی جانے　　دل کے سودے عام بہت ہیں
خشک اگر ہیں ہونٹ تو کیا غم　　ہاتھ ہیں خالی جام بہت ہیں

ساحل رشید

پیرنم عبدالرشید ساحل رشید بہ مقام وانمباڑی (شمالی آرکاٹ) 1931ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وانمباڑی میں حاصل کی۔ پھر اس کے بعد 1966ء میں Diploma in Teacher's Training دو سالہ کورس گورنمنٹ ٹریننگ ہائی اسکول مدراس سے پاس کیا۔

آپ کا ذہنی سفر مختلف راستوں، سمتوں اور وادیوں سے گذر کر ایک نئے اُفق کی طرف تیزی سے جاری تھا۔ کم عمری میں آپ نے جن تجربات کی بھٹی میں تپ کر اپنے وجود کو تباہ کیا۔ اس کی ایک طویل داستان ہے لیکن اس دبلے، پتلے، جوان فکر فن کار کے اندر ایک ایسی روح کارفرما تھی جو سیلابِ حوادث کو خاطر میں لاتی تھی نہ شدید زمانے کی پرواہ کرتی تھی۔ آپ کی افتادِ طبع نے نہ جانے کتنے گاؤں اور کتنے شہروں کی خاک چھانی ہے۔ کسی شئے کو پانے کی تڑپ آپ کو سکون اور اطمینان سے ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیتی تھی وہ آگے اور آگے ہی بڑھتے گئے۔ اور آپ کی زندگی کے سفر میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جہاں پہنچ کر ہر انسان اپنی ذہنی توانائیاں کھو بیٹھتا ہے۔

ابتدا ہی سے آپ نے شعر وادب کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ابلاغِ خیال کے سلسلے میں آپ نے نہ صالح روایات سے روگردانی کی اور نہ جدیدیت کی اندھی تقلید، آپ کی فطانت اور آپ کا سلجھا ہوا توانا شعور ہمیشہ آپ کی راہوں میں نئے چراغ روشن کرتا رہا۔ اور آپ کی سوجھ بوجھ نے ترقی پسند تحریک سے لے کر جدیدیت کی شاہ راہ تک تمام محرکات و عوامل کا نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ تجزیہ کیا تھا۔ آپ کا وجود ایک برقِ مجسم تھا۔ آپ کی اضطرابی کیفیت دیکھ کر آپ

کے اندر چھپے ہوئے اُس فن کار کا پتہ لگانا مشکل ہوگیا تھا جو مہر بہ لب تھا اور نکتہ رس کے ساتھ ساتھ دیدہ ور بھی۔

ساحل رشید نہ صرف اچھے شاعر تھے بلکہ بہترین نثر نگار بھی تھے نثر نگار طنز و مزاح کی جانب فطری میلان تھا۔ 1962ء میں انہوں نے اپنے طنزیہ خاکوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا۔ اور اس کی اشاعت کے لئے بھی کافی تگ و دو کی تھی لیکن اس مسوّدے کا کیا حشر ہوا کچھ پتہ نہیں۔

○

سوچا ہے، اجتنابِ غمِ عاشقی کریں
ہر ایک ادائے دہر سے اب دوستی کریں

دیر و حرم سے دور کہیں بندگی کریں
تاریک کچھ مکاں ہیں ابھی روشنی کریں

جوشِ جنوں کی خواہشِ بیجا کو چھوڑ کر
ہر آرزو کو وقفِ غمِ زندگی کریں

دنیا ہماری زیست پہ اب بھی ہے خندہ زن
چلئے کہ اب زمانے سے ہم دل لگی کریں

بوجھل ہیں غم کے سائے، ہیں آلام مضمحل
جو بات بھی ہو آیئے مل کر ابھی کریں

○

میری تحریریں جہاں تک ہیں تری تقدیر ہے
میں کتابِ دو جہاں ہوں تو مری تفسیر ہے

تو حجاباتِ دو عالم تو وجودِ بیکراں
آئینہ کا آئینہ تصویر کی تصویر ہے

میرے آنسو کے ستارے آسماں تک رو پڑے
نغمۂ صبحِ ازل کیا نالۂ شبگیر ہے

ماہ و انجم کے اجالے نقطۂ موہوم ہیں
آسماں تک پھیلنے کو خاک ہی اکسیر ہے

ہر صدا میری کسی کے واسطے اک آسماں
انجمن تک ساز ہے یہ دار تک شمشیر ہے

○

اک نظر دیکھا تو ایک ایک نظر دیکھا ہے
تجھ کو سر تا بہ قدم روئے سحر دیکھا ہے

بجھتے بجھتے بھی چراغوں نے اُجالے پھینکے
صبح کو دیکھا تو اک رقصِ شرر دیکھا ہے

تیری باہوں کا اُجالا، تیری انگڑائی کا رنگ
جیسے برسات میں جلتا ہوا گھر دیکھا ہے

تیرا آنچل ہے کہ کعبہ کی مقدّس چادر
تجھ کو دیکھا ہے تو اللہ کا گھر دیکھا ہے

کم نظر نے تو نہ پہچانا مگر یاد رہے
دیکھنے والوں نے ساحلؔ کا ہنر دیکھا ہے

○

نقشِ پا مرے کامگار ہوئے
راستے سارے پائیدار ہوئے

کتنے نقشے تھے ننگِ شہرِ نگار
چند خاکے ہی شاہکار ہوئے

رنگ بکھرے ہیں تیرے آنچل سے
خار و خس آج لالہ زار ہوئے

جیسے پت جھڑ نے لی ہے انگڑائی
یوں گنہ ہم سے بے شمار ہوئے

جال بُنتے تھے ہم خیالوں کے
تان ٹوٹی تو دل فگار ہوئے

میرا جلوہ خُدا کا سایہ ہے
دونوں مجھ سے ہی آشکار ہوئے

○

منیرؔ رشیدی

منیرؔ رشیدی 5 ر مارچ 1932ء کو تسنگری (شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے۔ 1948ء میں اردو شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ ابتدا میں حضرت فہمیؔ کشنگری اور ابو البیان حمادؔ سے بھرپور استفادہ کیا۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرچکے ہیں۔ ان کی تخلیقات وہ نازک آبگینے ہیں جو پتھر سے ٹکرانے کے باوجود پھوٹتے نہیں بلکہ اور نکھر جاتے ہیں۔ آپ کا مجموعۂ کلام "شبستان" 1968ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اس مجموعے نے مختلف اربابِ فن سے خراجِ تحسین بھی حاصل کیا۔ یہ اور بات ہے ابھی ان کے مقام کے تعین میں چند مرحلے اور باقی ہیں۔

اڑا کے خاک بہ فیضِ بہار گذرے ہیں
تری تلاش میں دیوانہ وار گذرے ہیں

ہم اپنا بوجھ اٹھائے گناہ کے مانند
اسیرِ فکرِ غمِ روزگار گذرے ہیں

قدم قدم پہ ہمیں پرخلوص دوست ملے
جگہ جگہ شجرِ سایہ دار گذرے ہیں

خزاں کی فکر عبث کیوں عوام کرتے ہیں
نئی بہار کا ہم اہتمام کرتے ہیں

ہوئے تباہ ترے ہاتھ اپنا ظرف تو دیکھ
قصور اپنے مقدر کے نام کرتے ہیں

ہمیں ہے کیف میسر نشیلی آنکھوں سے
یہی سبب ہے کہ مئے کو حرام کرتے ہیں

عزیزو! گردشِ ایام رک نہ جائے کہیں
سنا ہے آج وہ عزمِ خرام کرتے ہیں

بڑا سکون ملا ہے ہمیں منیرؔ جو ہم
جہاں میں رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

فرحت کیفی

سید علی رحمت اللہ فرحت کیفی بہ مقام مدراس 21 ر نومبر 1933ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہائی اسکول ٹرپلیکن مدراس میں حاصل کی۔ طالب علم کے دور میں حضرت عبدالعزیز عادل مدراسی اردو منشی مسلم ہائی اسکول کی ہمت افزائی سے شعری ذوق پروان چڑھا اور بالخصوص راز امتیاز کی صحبتوں نے ان کی شاعری کو جلا بخشی۔ ان کی پرکشش شخصیت ان کی تخلیقات میں واضح طور پر نظر آتی تھی۔ مختلف اصناف سخن پر دسترس رکھنے والا یہ جواں فکر شاعر جمالیات کا پرستار ہی نہیں بلکہ جمالیاتی عناصر کو اپنی تخلیقات کے سہارے پرستش کے قابل بناتا تھا۔ فرحت کیفی نے کاوش بدری اور راز امتیاز کے ساتھ رہ کر فن اور ادب کے جدید تقاضوں کو پورا کرنے میں ہمیشہ اپنے خونِ جگر سے کام لیا ہے۔ فرحت کیفی کے یہاں علائم کا استعمال متوازن ہے وہ اپنی تخلیقات کو چیستاں نہیں بناتے ہیں بلکہ ایسی میانہ روی اختیار کرتے ہیں کہ ہمارا ذہن کچھ وقفہ کے بعد ان کے مافی الضمیر کو چھو جاتا ہے۔

فرحت کیفی نے اپنے ترائیلوں کا مجموعہ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" مطبوعہ 1974 شائع کر کے تامل ناڈو کی ادبی تاریخ کو سربلند کیا ہے۔ یہ ان کا ایک تاریخی کارنامہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو فرانسیسی صنف سخن (ترائیلے) سے روشناس کرایا ان سے پہلے احمد ندیم قاسمی اور نریش کمار شاد نے اس صنف میں طبع آزمائی کی لیکن فرحت کیفی نے اس صنفِ سخن میں توانا لمحوں کی کسک، اضطراب، وسعت، گہرائی اور لہجہ کی لطافت کے اُفق کو تلاش کرنے میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے اس صنفِ سخن کو اردو میں نہایت چابکدستی، خلوص اور مہارتِ فن کے ساتھ اس قدر آگے بڑھایا کہ ان کے ترائیلے کے مجموعہ پر "اوراق" کراچی میں تبصرہ کرتے

ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے کہ اردو میں ترسیلے کے بانی فرحت کیفی ہیں اور خاتم بھی وہی ہوں گے۔

ترائیلوں سے ہٹ کر فرحت کیفی نے گیتوں اور غزلوں پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ ان کے گیتوں اور غزلوں میں بھی جدت و اختراع ندرت وانحراف اور جذب وکشش کے آثار موجود ہیں۔

فرحت نے حمایت علی شاعر (پاکستان) اور قمر اقبال (اورنگ آباد) سے بہت پہلے تین مصرعوں والی ایک خودساختہ صنف میں کافی عرصے طبع آزمائی کی۔ اس صنف کا نام انہوں نے "گجرا" رکھا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ فرحت کیفی کے وہ "گجرے" دستیاب نہیں ہوسکے ورنہ نمونتاً ضرور پیش کرتا کاوش بدری کی وساطت سے ایک انکشاف یہ ہوا کہ فرحت کیفی سے پہلے 1961ء میں مولانا اسمٰعیل رفیق نے اس قسم کی تین مصرعوں والی "مثلث" نظمیں تامل زبان کے عہد آفریں اور عظیم شاعر تروولّور کی نظموں کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھی تھیں۔ لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ گذشتہ آٹھ دس سالوں میں جن شعراء نے اس صنف میں تھوڑی بہت طبع آزمائی کی وہ بہت زیادہ مشہور ہوگئے مولف تذکرہ نے بھی حال ہی میں (1986ء) مولانا اسمٰعیل رفیق اور فرحت کیفی کی اتباع کرتے ہوئے اس قسم کی نظموں کا ایک بھرپور مجموعہ بنام "ترسیلے" پیش کیا ہے۔

اردو کے شعری ادب میں اس طرح کے نت نئے تجربے کرنے والوں میں تامل ناڈو کے شعراء ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے آس پاس کے عصبیت شکار نقادوں نے تامل ناڈو کے شعری کارناموں کو ہمیشہ ناقابل اعتنا سمجھا۔

فرحت کیفی سے اردو ادب کو بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں لیکن افسوس ہے کہ یہ آفاق گیر ذہن رکھنے والا فن کار وقت سے پہلے 21 جون 1979ء میں ایک ایسی منزل کی تلاش میں محوِ سفر ہوا جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔

دور کی کوڑی کیسے لاؤں اندھا آنکھوں والا میں
ایک کنوئیں میں بیٹھا کب سے کھوج رہا اجیالا میں

میں ہوں اپنا آپ تو کیسے سب کو نظر نہ آتا میں
دھرتی ہوں میں نیل گگن میں دریا ہوں میں صحرا میں

کوئی مجھ کو اپنا جانے پگ دو پگ ہی ساتھ چلے
راہی ہوں انجان ڈگر کا جنم جنم کا پیاسا ہوں

اس دھرتی کا چپہ چپہ میرا قریہ میرا دیس !
ذہن و دل سیلانی دونوں اور ہوں اک بنجارا میں

نیند کی ماتی ساری دنیا آنکھیں موندے لیٹ گئی
میرا سراپا جاگ رہا تھا خود کو ڈھونڈ رہا تھا میں

دنیا مجھ کو پاگل سمجھے ہے فرحت جی یونہی سی
دنیا اسون نیر بہاتی رہتی اور ہنساتا میں

کون کہتا ہے ڈھل گیا سورج
سانجھ آئی تو جل گیا سورج

کتنی صدیوں کی بے کفن لاشیں
ایک پل میں مسل گیا سورج

دشتِ غم میں ٹھہر گئی ہے رات
اور آگے نکل گیا سورج

صبح آئی تو مسکرا اٹھا
شام تیور بدل گیا سورج

روشنی کو اچھال کر ہر سو
ظلمتوں کو نگل گیا سورج

دن کا قد بڑھ گیا ہے اے فرحت
جانے کیسے پھسل گیا سورج

زلف کی چھاؤں میں دو پل سہی ٹھہرا جائے
سوچتا ہوں کہیں لمحوں کو نہ موت آ جائے

میں کوئی خواب نہیں ہوں کہ تسلسل ٹوٹے
کوئی وعدہ بھی نہیں ہوں کہ جو توڑا جائے

کہیں ملتے نہیں ڈھونڈے سے بھی ٹوٹے ہوئے دل
ورنہ کیا وجہ ہے کعبہ نہ بنایا جائے

آنکھ سے آنکھ ملی تو مجھے محسوس ہوا
جیسے بھولے ہوئے اک گیت کی یاد آ جائے

قابلِ غور ہے اب حال مرا ہم نفسو !
چارہ گر کے لئے اک آدمی بھیجا جائے

سب اپنی روانی میں ہی ہنس بول رہے تھے
برکھا جو چلی اب کے تو شکوے نہ گلے تھے
چہرے پہ نئے وقت کا غازہ بھی ملے تھے
ہم گردشِ ایام کے پیچھے جو پڑے تھے
اخبار میں کیوں قیس کی تصویر چھپی تھی
کیوں شہر میں لیلیٰ کے طرفدار بڑے تھے
ہر بار ہمیں موت ہراساں نظر آئی
ہم کوچۂ قاتل میں کئی بار گئے تھے
جب وقت کے قدموں کی مدھر چاپ سنی تھی
ہم اپنی ہی آواز کا رس گھول رہے تھے

دیکھی ہے صبح و شام نہ شب اپنے شہر میں
موسم بھی جانے آئے تھے کب اپنے شہر میں
منڈلا رہی ہیں موت کی پرچھائیاں تو کیا
جب زندگی ہے بحث طلب اپنے شہر میں
دن کٹ گیا ہے دل کے خرابے میں کھوجتے
کیسے بتائیں ہجر کی شب اپنے شہر میں
اک المیہ سے کم نہ سہی زندگی مری
کیا کم ہے شورِ رنج و تعب اپنے شہر میں
فرحت کسی کا درد کہاں تک چھپاؤ گے
کب تک رہو گے مہر بلب اپنے شہر میں

جو بات کہنی ہے کہہ دو کھسر پھسر نہ کرو
جو تلخیاں ہیں انھیں اور تلخ تر نہ کرو
دھنک سی پھیل گئی ہے تو مے بھی برسے گی
نشاطِ غم کی قسم اب کہیں سفر نہ کرو
دل و نگاہ کا رشتہ طویل ہے یارو
دل و نگاہ کے رشتے کو مختصر نہ کرو
میرا وجود کسی حادثے سے کیا کم ہے
قیامتوں کا کوئی ذکر بھول کر نہ کرو
میرے ہی زخم کی جو آرتی اتار گئی
یہ کیا کہ ایسی نظر کو ہی معتبر نہ کرو
کسی خیال کسی یاد کو خضر سمجھو
رہِ جنوں میں خرد کو تو راہبر نہ کرو

اپنے ہی دکھ کے ساگر میں ڈوبو گے پچھتاؤ گے
کس کس کا غم دور کرو گے کس کس کو سمجھاؤ گے
بیتے دنوں کے قصے اب کیا لے بیٹھے ہو آؤ چلو
اپنے خول کے اندر رہ کر سب کچھ بھول نہ پاؤ گے
دل کے زخم کی بات جدا ہے اور الگ ہے روح کا کرب
وہ تو نظر آ ہی جائے گا یہ کیسے دکھلاؤ گے
چاندنی کرنیں لو دیتی ہیں اس نکتے پر غور کرو
آگ کے آگے بیٹھے بیٹھے کب تک جسم تپاؤ گے
انگڑائی لی آپ نے لیکن اندر دھنش سا پھیل گیا
میرے تصور کے آنگن میں کیا کیا کھیل رچاؤ گے
کس کی جنم پتری پوچھو ہو فرحت کیفی جاؤ بھی
اپنے گریباں میں جھانکو تم کب تک خیر مناؤ گے

کبھی دھیمی کبھی اونچی صدائیں
ہر اک یُگ کے لئے بالکل نیا میں
کبھی اخبار کی سُرخی بنا دو
نہیں کچھ اور بس اک حادثہ میں
ہم انساں تھے رہے اپنی ہی ضد پر
خدا کہتا رہا دیکھو خدا میں
مجھے اک گوشۂ دل میں چھپا لو
اُبھر آؤں گا بن کر اک دعا میں
زمانہ اَن سُنی کر دے تو کیا غم
مجھے کہنا تھا سو کہتا رہا میں
یہ ہے اک پتھروں کا شہر فرحتؔ
یہاں کس کے لئے لب کھولتا میں

تمام شہر بھرے ہم گلی گلی تنہا
رہِ حیات میں یوں رہ گئے کبھی تنہا
عجیب راہ پہ لے آئی زندگی مجھ کو
جہاں پہ میں بھی اکیلا سا آپ بھی تنہا
نہ دھڑکنوں کا تموج نہ قرب کا احساس
تمام رات یونہی بیت جائے گی تنہا
اب اور مجھ سے تقاضائے دوستی نہ کرو
زمانے بھر کی کہاں تک ہو دل دہی تنہا
ہے اُس منڈیر پہ اک ادھ کھلا گلاب کا پھول
جہاں پہ میری نظر جھانکتی رہی تنہا
یہ اور بات ہے مشہور ہے زمانے میں
خود اپنے شہر میں فرحتؔ ہے واقعی تنہا

جب بھی تخلیق کے آباد نگر میں ہم تھے
شورشِ شام میں ہنگامِ سحر میں ہم تھے
ہم صفیرو کئی صدیوں کے سفر میں ہم تھے
پھر بھی اس دور کے ہر عیب و ہنر میں ہم تھے
اس حسیں لمس سے نازک تھا تصور اپنا
صورتِ اشک بھی اک دیدۂ تر میں ہم تھے
زندگی ڈھونڈتی پھرتی تھی افق تا بہ افق
اور دھرتی پہ نگاہوں کے سفر میں ہم تھے
گردشِ جام کبھی گردشِ ایام میں گم
یعنی اپنے ہی خیالات کے گھر میں ہم تھے

اک جھلک سے بھی کم ہی تھی صاحب
خوابِ تھی خوابِ زندگی صاحب
جب ڈسے ناگ اجنبیت کا
زندگی کیسی زندگی صاحب
ہم چلے جائیں گے کہیں چپ چاپ
اور رہ جائے گی کمی صاحب
میں سمندر ہوں لفظ و معنی کا
اک جزیرہ ہے زندگی صاحب
موت جب بھی اُداس، گُم سُم تھی
زندگی ہمکلام تھی صاحب

خود کو گمنام سمجھتے رہے فرحتؔ کیفی
ویسے اخبار کی ہر تازہ خبر میں ہم تھے

کس قدر سادہ لوح تھا فرحتؔ
جو ہے رسوا گلی گلی صاحب

شبِ تار میں جلتا بجھتا ہوں میں
اندھیرو تمھارا مسیحا ہوں میں
بتاؤ نظر کیسے آتا ہوں میں
کوئی مرثیہ ہوں نہ نغمہ ہوں میں
بہاروں سے پہلے ہی کھلتا ہوں میں
چمن در چمن ایک صحرا ہوں میں
مجھے چاندنی راس کیا آئے گی
کہ سورج کے مانند جلتا ہوں میں
سرِ راہ مجھ کو نہ آواز دو
کہ ہر موڑ پر جا کے رُکتا ہوں میں
تری یاد آنے لگی تو اے دوست
کچھ ایسے لگا جیسے زندہ ہوں میں
تعارف بس اتنا ہے فرحتؔ مرا
وہ منجدھار ہے تو کنارا ہوں میں

آنکھ کس کی ٹٹولتی ہے مجھے
چاندنی کیوں جلا رہی ہے مجھے
راستے کھو گئے تو کیا غم ہے
میری منزل پکارتی ہے مجھے
زندگی باوجود حسرتِ دید
سونی سونی سی لگ رہی ہے مجھے
لمحہ لمحہ پگھلتا جاتا ہے
وقت کی نبض ڈھونڈتی ہے مجھے
زندگی چھوڑتے نہیں بنتی
موت آنکھیں دکھا رہی ہے مجھے
واقعہ کیا ہے روشنی جانے
ظلمتِ شب تو ڈھونڈتی ہے مجھے
فرحتؔ کیفی! خواب کی کشتی
کس جزیرے میں لے چلی ہے مجھے

○ خاک ہو کر یہ سوچتے تھے ہم
بزم میں کیوں جلے بجھے تھے ہم
ہر طرف اک مہیب سناٹا
کس کو آواز دے رہے تھے ہم
موج در موج اک چہرہ تھا
جب بھنور میں اتر گئے تھے ہم
کیوں اندھیرے دل کے زخم کو فرحت
روشنی میں ٹٹولتے تھے ہم

○ وقت کو احساس کی فٹ رول سے ناپا گیا
زندگی کو تجرباتی روم میں پایا گیا
جانے کیسے دن پھرے میرے دلِ وحشی کے بھی
غم سے کچھ اکتا گیا ہے درد سے گھبرا گیا
کھو گیا دل بیچ آوازوں کے جنگل میں کہیں
اور اک دن شہر کے مجمع میں وہ پایا گیا
کوئی چٹھی بھی نہیں ہے پارسل بھی تو نہیں
درد کس نے لے لیا اور غم کہاں بانٹا گیا

○ غم کا قرآن بن گئے ہم لوگ
دل کا فرمان بن گئے ہم لوگ
زخمی لمحوں پہ جانے کیا بیتی
وقت کی جان بن گئے ہم لوگ
جب تیری یاد بن گئی مرلی
اک مدھر تان بن گئے ہم لوگ
زندگی کے سفر پہ جب نکلے
ساز و سامان بن گئے ہم لوگ

○

وہ تھی میرے دل کی بپتا یا تیرے دل کی آواز
تنہائی کے دشت میں گونجی جانی پہچانی آواز
ذہن کے پس منظر میں پنہاں دھندلائی سی تصویر
دل کے ویرانوں میں ارزاں کھوئی کھوئی سی آواز
کتنی صدیاں وقت کے گہرے سناٹے سے گذری ہیں
نظروں نے چاپ سنی کانوں سے ٹکرائی آواز

○

جاؤ بھاگے ہوئے لمحوں کو گرفتار کرو
وقت ہے زیر و زبر وقت کو ہموار کرو
وقت کے پیڑ پہ کیوں اونگھ رہی ہیں صدیاں
جاؤ شاخوں کو جھنجھوڑو انہیں بیدار کرو
زندگی یاس کے کوچوں سے گذر جائے گی
درد کو جنس کہو، دشت کو بازار کرو

○

دکھوں کی چھبی

نئے یگ نئے دور کا آدمی ہوں
مجھے اب نہ الجھاؤ دیر و حرم میں
خودِ آگاہ و پیغمبرِ آگہی ہوں
نئے یگ، نئے دور کا آدمی ہوں
میں محنت کشوں کے دکھوں کی چھبی ہوں
ہے وشواس انسانیت کے دھرم میں
نئے یگ نئے دور کا آدمی ہوں!
مجھے اب نہ الجھاؤ دیر و حرم میں

○

○

برگِ آوارہ

زندگی ایک لمحہ ہے تفریح کا
کوئی بے چین ہے، کوئی مسرور ہے
زخم کھلنے لگے، درد بٹنے لگا
زندگی ایک لمحہ ہے تفریح کا
برگِ آوارہ کی طرح اڑنے لگا
اُف وہ لمحہ جو صدیوں میں مستور ہے
زندگی ایک لمحہ ہے تفریح کا
کوئی بے چین ہے کوئی مسرور ہے

○

اعجاز شاکری

شیخ احمد علی اعجاز شاکری 20 رجون 1934ء کو بہ مقام مدراس پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مدرسہ اعظم میں حاصل کی۔ ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی پاس کرنے کے بعد۔ Diploma in Teacher's Training میں کامیابی حاصل کی اور کارپوریشن ہائی اسکول میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے مدراس یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ ایم۔ اے اور بی۔ ٹی کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ اسکول کے دور سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل تھے۔ شادی کے بعد آپ کی شاعری میں ایک نیا موڑ آیا۔ ساحر لدھیانوی اور جاں نثار اختر کی نظموں کی لچک اور مہک آپ کی طویل نظموں میں بہت زیادہ کار فرما ہے۔ ان کی شاعری ان کی اپنی ذات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے قاری کو ان جزیروں کی سیر کراتی ہے۔ جس کی فضا نورانی اور کیف آور ہے۔ ان کی تخلیقات روایات کے ملبے تلے سانس لیتے ہوئے بھی دل و دماغ میں اتر جانے والے احساسات، جذبات اور متنوع کیفیات سے معمور ہیں۔ فی الحال آپ نے اپنی صلاحیتوں کا رُخ اخباری صحافت کی طرف موڑ دیا ہے۔ اردو کی صحافتی تاریخ میں عبدالمجید شرر آلندوری اور راز امتیاز کے بعد اعجاز شاکری کے نام کو بھی تامل ناڈو کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

یہ میری بھول تھی میں نے جو احترام کے ساتھ
وفا کا نام لیا تھا تمھارے نام کے ساتھ

کچھ اس طرح سے پلائی شراب ساقی نے
جبینِ عرش جھکی جا رہی تھی جام کے ساتھ

جنوں نے گردشِ افلاک تھام لی لیکن
بھٹک رہی ہے خرد ذوق ناتمام کے ساتھ

ہوئے ہیں زخمِ جگر آج اپنے پھر تازہ
بہار آئی ہے اب کے نئے نظام کے ساتھ

غلط ہے دعوئے بے جا ہے یہ تیرا اعجاز
کہ شاعری کوئی منسوب ہے مقام کے ساتھ

●●

ظہیر جعفری

سید مسعود الحسن ظہیر جعفری 20 دسمبر 1934ء میں بہ مقام مدراس پیدا ہوئے۔ آپ کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ آپ کے والدِ مرحوم سید نورالحسن جعفری ظاہر دہلوی نوراللہ مرقدہٗ ایک اچھے شاعر تھے۔ آپ کی شاعری نے اس وقت آنکھ کھولی جب کے آپ کے والدِ بزرگ وار اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ان سے استفادہ کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ ابتدا میں ظہیر اپنا کلام مرزا غلام عباس علی عباس مرحوم کو دکھاتے رہے۔ ان کے بعد شاعرِ اہلِ بیت علامہ نجم آفندی مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہو گئے۔ انہیں کے فیضانِ کرم سے آپ کی شاعری نے نئی زندگی پائی۔ انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر آپ کا فطری رجحان زیادہ تر مذہب کی طرف ہے۔ "سلام" لکھنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ انیس اور دبیر کے زمانے میں سلام میں جو جدتیں پیدا کی گئیں تھیں اس کے بہترین نقوش آپ کے سلاموں

میں جلوہ افروز ہیں۔ منقبت، نوحوں اور سلاموں کا مجموعہ "آنسوؤں کے سجدے" (مطبوعہ 1975ء) منظرِ عام پر آچکا ہے۔ سلاموں کے علاوہ انہوں نے منقبت، نوحے اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ جو آج بھی بڑی عقیدت سے "مجلس عزا" میں پڑھے جاتے ہیں

انہوں نے صالح روایات کا پاس رکھتے ہوئے ترقی پسند جمالیات کو بھرپور خلوص کے ساتھ اپنایا حالانکہ ان کی تخلیقی صلاحیت کا دائرہ نہایت محدود ہے لیکن ان کی تخلیقات میں جو خلوص ملتا ہے اس سے آپ کی ادبی شخصیت کے تعین میں بڑی مدد ملتی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے انہوں نے دور دراز مقامات کا سفر کیا ہے۔ علم و ادب کے اکابرین سے ملاقاتیں کی ہیں اور آپ کو ادبی اور علمی نشستوں میں شریک ہونے کے مواقع بھی حاصل ہوئے ہیں لیکن تاثرات کے سہارے کبھی تقلیدی شاعری نہیں کی بلکہ آپ کا اپنا ایک خاص لہجہ ہے جس سے پہچانے جاتے ہیں۔

○

وہ کڑی دھوپ نہیں درد کے سائے بھی نہیں — ہائے وہ زخم جو ہم نے ابھی کھائے بھی نہیں
زندگی ڈھونڈتی پھرتی ہے ٹھکانہ اپنا — اب ٹھہرنے کو وہ یادوں کی سرائے بھی نہیں
نام پوچھا تھا کبھی میرا پتہ پوچھا تھا — میرے اپنے بھی نہیں تھے وہ پرائے بھی نہیں
سوچتے پھرتے ہیں کچھ لوگ ابھی جن کا جواب — وہ سوالات ابھی ہم نے اٹھائے بھی نہیں

کانپتی صبحوں کا دل اتنا دھڑکتا کیوں ہے
میری راتوں نے ابھی دیپ بجھائے بھی نہیں

○

حالاتِ زندگی میں تغیر محال تھا ○ یہ صرف میرا وہم و گماں تھا خیال تھا
اب موت آگئی ہے تو کتنا سکون ہے تاخیر ہو رہی تھی تو کتنا ملال تھا
یہ تشنگی کی حد ہے سمندر کے روبرو میری زبانِ خشک پہ کوئی سوال تھا
دامن بچا کے آگ سے اب سوچتا ہوں میں شعلوں میں تھوڑی دیر ٹھہرنا کمال تھا
تنہائیوں کی دھوپ میں ڈھلتے نہ کیوں ظہیر
تنہائیوں کی دھوپ سے بچنا محال تھا

○○

خطیب محمد حیدر حسین رازؔ امتیاز

خطیب محمد حیدر حسین رازؔ امتیاز بہ مقام میلاپور مدراس 1934ء میں ایک دینی، مذہبی اور علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اردو شاعری آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ فارسی، عربی اور اردو کی تعلیم خود اپنے ابا حضور سے حاصل کی۔ مسلم ہائی اسکول مدراس سے ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی پاس کرنے کے بعد سیلس ٹیکس ڈپارٹمنٹ میں بحیثیت کلرک آٹھ، دس برس کام کرتے رہے۔ اچانک کاوشؔ بدری کی صحبتوں میں رہ کر ایک خوبصورت صبح اپنی اچھی خاصی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ اور جس کام کے شکنجہ (تامل ناڈو کی تین سو سالہ ادبی تاریخ کی ترتیب) میں پھنس کر ملازمت کو خیر باد کہا وہ کام آج تک منظرِ عام پر آنے سے رہا۔

رازؔ امتیاز تامل ناڈو کے سلجھے ہوئے نقاد کہنہ مشق صحافی جدید افسانہ

نگار اور نغز گو شاعر ہیں۔ جدیدیت کے نشیب و فراز کو شعوری طور پر اپنانے والے فن کاروں میں رازؔ امتیاز کا نام سرِ فہرست ہے۔ رازؔ امتیاز کی شاعری دراصل دل کی شاعری ہے اپنے جذبات کی ترجمانی میں انہوں نے ہمیشہ سچائی کے سہارے جس اسلوب کو اپنایا ہے وہ ان کی فنی، ادبی اور علمی شخصیت کی انفرادیت کو پورے طور پر اجاگر کرتا ہے۔ رازؔ امتیاز کے یہاں علائم کا استعمال نہایت متوازن ہے وہ اُن فن کاروں میں سے نہیں جو جدّت برائے جدّت کے قائل ہیں۔ اُن کے یہاں فکر کی گہرائی، ذوق کی شائستگی، زبان کی لطافت اور تجربہ کا رَس ملتا ہے۔ غزل میں وہ جس لطیف رمزیت، ایمائیت سے کام لیتے ہیں۔ اس تعلق سے اگر انھیں اس دور کا مومن خاں مومنؔ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ عصری رجحانات کی آگہی نے رازؔ کے زاویۂ فکر کو وہ توانائی بخشی ہے کہ ان کی ہر آواز ایک فرد کی آواز نہیں بلکہ پورے معاشرے کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ رازؔ امتیاز مختلف اصنافِ سخن پر بھرپور دسترس رکھتے ہیں۔ ہر صنفِ ادب میں ان کی اپنی ایک الگ آواز ہوتی ہے انہوں نے مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے فن اور شخصیت میں ایک توازن پیدا ہوگیا ہے۔ انہوں نے کبھی کسی مصلحت کے تحت اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں نہیں لایا۔ چونکہ وہ اس کا مصرف ایک باشعور فن کار کی طرح سمجھتے ہیں اور پھر ان کے یہاں خوش سلیقگی اور بے ساختگی کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ رازؔ کے یہاں ماورائی تصورات کی افراط ان کے مقام کو متعین کرنے میں ممد اور معاون ہے۔ رازؔ کا آہنگ وجدان کے خاموش تاروں کو اس طرح چھیڑتا ہے کہ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دور تک بسیط فضا کے دامن میں نقرئی خوابوں کے زخم خوردہ پھول آنسوؤں کے سہارے مسکرانے لگتے ہیں۔ رازؔ امتیاز کا احساس ایک ایسا آبگینہ ہے جو ہلکی سی ٹھیس سے ٹوٹ جائے لیکن انہوں نے اس آبگینہ کو ضبط و توازن کی فضا میں پتھر کی سی صلابت بخشی ہے جو گردشِ ایام کی تلخی، غیر متوقع

حوادث اور نامساعد حالات کے باوجود اپنی جگہ اٹل ہے۔ ان کی سوچ کی لہر زندگی کے سمندر کی تہہ میں بازیافت کی کشاکش کی ہمیشہ شکار رہتی ہے۔ اسی لئے ان کی تخلیقات میں فکری توازن کا وہ ماحول ہوتا ہے جو محبوب بھی ہے اور قاتل بھی۔ خواہ وہ نظم ہو یا نثری تخلیقات ان کے یہاں احساس کا ایسا تیکھا پن نظر آتا ہے جو ہندوستان کے نقادوں میں مجنوں گورکھپوری کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔ راز امتیاز شخصیت اور فن کی فضامیں کئی نت نئے پہلوؤں کے باوجود تنہا نظر آتے ہیں اور کوئی ان کا شریک نہیں ہے۔ یہی انفرادیت راز امتیاز کو تامل ناڈو کے دوسرے فن کاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ راز امتیاز نے بہت کم لکھا ہے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ اردو کے ادب عالیہ کی تاریخ میں اونچا مقام حاصل کر سکے۔ انہوں نے کبھی زمانے کے تغیرات سے سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ ان کے انحرافی جذبہ نے ہمیشہ سمت کے تعین میں بھرپور مدد کی۔

راز امتیاز کا جنون بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتا ہے اور یہ کبھی عقل کے محو تماشہ ہونے کے قائل نہیں رہے۔ اس لئے ان کی نظر میں بڑی وسعت، احساس میں کسک اور فکر میں بہت زیادہ گہرائی و گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔ راز امتیاز کے مثبت زاویۂ فکر نے ہمیشہ شعر و ادب کے منفی پہلوؤں کی نشاندہی میں اس سچائی کو اپنایا ہے جو تلوار کی دھار سے بہت زیادہ تیز ہے۔ راز امتیاز نے کبھی زخموں کی زبان سے گفتگو کی ہے تو کبھی زبان کو زخموں کی کثافت سے بھی ہمکنار کیا ہے۔ یہ تامل ناڈو کی بدقسمتی ہے کہ ایسا فن کار جو تنقیدی اور شعری ادب کو بہت کچھ دے سکتا تھا اسے صحافت کی کھردری باہوں نے سمیٹ لیا۔

جن روز ناموں اور جریدوں کو آپ کے منفرد صحافتی اسلوب اور تخلیقی دروں بینوں نے رفعت و وقار بخشا ان میں روز نامہ "سالار" بنگلور (ایڈیٹر محمود ایاز) روزنامہ "علمبردار" بنگلور (ایڈیٹر راز امتیاز)

روزنامہ " اتحاد " مدراس (ایڈیٹر رآز امتیاز) ماہنامہ " ساون " مدراس (ایڈیٹر راز امتیاز) پندرہ روزہ " ساون " مدراس (ایڈیٹر رآز امتیاز) ہفت روزہ " ادبی رپورٹ " مدراس (ایڈیٹر رآز امتیاز) ہفت روزہ " فلم دیش " مدراس (ایڈیٹر محمد یعقوب) ہفت روزہ " پاکیزہ " مدراس (ایڈیٹر بیگم جواہر نگار فاروقی) ہفت روزہ " نجمہ " (ایڈیٹر یوسف ہمایوں) قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے اردو صحافت کی جو نمایاں اور طویل عرصے تک خدمات انجام دیں ان کا اعتراف کرتے ہوئے کرناٹک اردو اکیڈمی نے آپ کو 1984ء میں گزشتہ بیس سال کے دوران افق صحافت کا روشن ترین ستارہ قرار دیتے ہوئے اعزاز و انعام سے نوازا۔ اکیڈمی نے رآز امتیاز کو " عظیم دروں بینوں کا مالک " ایڈیٹر اور کالم نگار قرار دیا اور پانچ ہزار کی نقد رقم بھی پیش کی۔ جنوب میں یا غالباً ملک بھر میں یہ پہلا اعزاز تھا جو اردو کے کسی صحافی کو دیا گیا۔

رآز امتیاز کی تخلیقات میں زندگی کی وہ صداقت ملتی ہے جس کے اظہار کے وقت بعض فن کاروں کے یہاں مصلحت کی دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ دراصل زندگی کی مسلسل جاں گداز کشاکش سے پیدا ہونے والی تلخ سچائی کا دوسرا نام رآز امتیاز ہے۔

رآز امتیاز کی ہر رائے جچی تلی ہوتی ہے۔ اور ان کی شخصیت نے تامل ناڈو کی تنقیدی خلا کو پُر کیا ہے۔ رآز کی شخصیت اور فن دونوں میں ایک ایسی محبوبیت کا عنصر ملتا ہے جو اَن مٹ اور لازوال ہے۔

رآز امتیاز بڑے خوددار، غیور اور حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ سنگین سے سنگین حالات میں بھی ان کی بلند حوصلگی نے ضبط اور توازن کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اردو ادب کی تاریخ رآز امتیاز کی خدمات اور ان کی تخلیقی صلاحیت کے آہنگ کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

غزلیں

- یہ رات بھی نہیں ہے مگر جاگتے ہیں ہم
وہ چاند بھی نہیں ہے مگر باورے ہیں ہم
کانٹوں کے گاؤں میں تھی ہمیں پھول کی تلاش
پانی سے، روشنی سے، ہوائے، لڑے ہیں ہم
تو سر جھکائے کونسے کمرے میں بند ہے!!
کب سے ترے مکان کی چھت پر کھڑے ہیں ہم
رونے کی رسم توڑ کے وہ ہنس پڑا تھا کیوں
کس دشت کے قبیلے سے کیا پوچھتے ہیں ہم
باہر کسی کنوئیں پہ نظر آگیا تھا کون؟
اندر سمندروں میں کسے ڈھونڈتے ہیں ہم
جیسے وہ ہاتھ ہاتھ میں ڈالے ہو ساتھ ساتھ
اس سے بچھڑ کے شہر میں یوں گھومتے ہیں ہم

- یہی ہے میری خطا دل اچھالتا تھا میں
کہ خاک و خون میں شیشے پگھالتا تھا میں
خبر نہیں کہ کوئی سرخرو ہوا یا نہیں
ہر ایک سمت لہو تو اچھالتا تھا میں
بچا بھی پایا نہ سر، سانس لے لیا اس نے
کہ مین میخ جوئے میں نکالتا تھا میں
تمام انفس و آفاق مجھ سے تھے رنگین
ہر اک خیال کو دل میں کھنگالتا تھا میں
بجز مرے مرا انجام سب پہ روشن تھا
کہ آستین میں اک سانپ پالتا تھا میں
نظر سے اس کی گرا تو سمجھ میں آیا راز
دلوں کا بوجھ تھا جس کو سنبھالتا تھا میں

- مسرتوں سے غموں سے گذر کے آیا ہوں
میں تیرے پاس سبھوں سے گذر کے آیا ہوں
کرے گا کون بھلا میری تشنگی کا یقیں
سمندروں کی تہوں سے گذر کے آیا ہوں
پھر ایک بار اسی سے مقابلہ ہے ٹھنا
تمام بارہ گھروں سے گذر کے آیا ہوں
میں ایک تال ہوں لیکن مری للک بھی تو سن
ٹکوں ٹکوں کے سُروں سے گذر کے آیا ہوں
میں خون خون ہوں تفہیم کی جراحت سے
ورق ورق کی رگوں سے گذر کے آیا ہوں
تمام صبحوں کے سورج ہیں میرے تلووں میں
میں آبلوں کی رُتوں سے گذر کے آیا ہوں
کہ جن حدوں سے گذر کر کوئی نہ آیا راز
میں اُن تمام حدوں سے گذر کے آیا ہوں

- سمندروں میں جزیرے اتارنے والے
کہاں ہے تو! مری موجیں سنوارنے والے
وہ آدمی نہیں پتھر سہی، مگر دیکھو
ہزار نقش ہیں دل کو ابھارنے والے
یہ منتروں سے اترتا تو تجھ سے کیا تھا کلام
یہ زہر پینا پڑے گا! اتارنے والے!

اب اس گلی سے بھلا کس کی لاش گذرے گی　　کہ جھانکتے بھی نہیں وہ پکارنے والے
خزاں کی گود ہری کر سکے نہ آج تلک　　چمن کو اپنے لہو سے بہارنے والے
بس ایک موسم سیلاب ہے ہماری عمر　　کہاں سے لاؤ گے پھر پار اتارنے والے

اجڑ گئیں مری بستی کی بھینی گلیاں
بچھڑ گئے مجھے راز د پکارنے والے

● خلش سی رہتی تھی دل میں قلق تو کوئی نہ تھا　　کہ دوستوں پہ مرے میرا حق تو کوئی نہ تھا
گئے تھے ہم بھی جہاں ذکر ہو رہا تھا ترا　　بہت تلاش کیا سینہ شق تو کوئی نہ تھا
جبینیں سب کی تھیں تر اس کے روبرو لیکن　　ہماری طرح سے غرق عرق تو کوئی نہ تھا
میں امتحان کے احوال کس کو سمجھاتا　　کہ مدرسے میں مرا ہم سبق تو کوئی نہ تھا
ہمی پکار نہ پائے اسے نہ جانے کیوں　　ہزار حرفِ ندا تھے، ادق تو کوئی نہ تھا
یہ شام درد کی سرخی کسی کے اشک سے ہے　　ہمارے خون میں رنگِ شفق تو کوئی نہ تھا

ذرا سی حاشیہ آرائی راز کر لے بس
کتابِ زیست میں سادہ ورق تو کوئی نہ تھا

● میں اتنے سارے ستاروں کا کیا کروں گا بھلا　　مری زمین کو بس ایک کہکشاں دے دو
یہ دوستی تمھیں جینے نہ دے گی ضد نہ کرو　　مرے خلاف تم اخبار میں بیاں دے دو
یہ اس کا کمرہ ہے یونہی رکھا ہے برسوں سے　　بس اور کچھ نہ کرو، عود کا دھواں دے دو
کہاں ہیں میرے بزرگ ان سے میں کہوں رو کر　　کہ میرے کانوں میں پھر سے ذرا اذاں دے دو
بڑے زمانے سے بے سائباں ہے ذہنِ رسا　　اسے بھی کاٹ کے تھوڑا سا آسماں دے دو

پھر اس کے بعد کوئی امتحاں نہیں ہے راز
قبولِ تہمتِ یاراں کا امتحاں دے دو

● بستی سے چھپ کے تم کو نہ آنا تھا میرے پاس
بے پردگیٔ دل کے سوا کیا تھا میرے پاس
اس محفلِ خیال میں کیا کام تھا مرا
نوحہ نہ مرثیہ نہ قصیدہ تھا میرے پاس
مقتل میں انتظار کے تنہا کہاں تھا میں
یارانِ شہرِ سنگ کا میلہ تھا میرے پاس
کب تک وہ رکھ رکھاؤ کا رشتہ نہ ٹوٹتا
پتھر تھا اُن کے ہاتھ میں شیشہ تھا میرے پاس
جس نے مری نصیب کی چادر اڑھائی تھی
وہ روشنی میں بھیگ کے آیا تھا میرے پاس
دستِ عدو کی شرط کوئی شرط بھی نہ تھی
اک دن تو جامِ زہر کو آنا تھا میرے پاس

● ساری دنیا سے ملے، کوئی بھی تم سا نہ ملا
اتنا اپنا نہ ملا، اتنا پرایا نہ ملا
وحشتِ ذات کی معراج یہی ہو کہ نہ ہو
عرشِ غم جھک کے ملا بھی تو رقیبا نہ ملا
تیری ٹھنڈک مرے کس کام کی اے چاندنی رات
میرے سورج ہی کو دن بھر کہیں سایا نہ ملا
ایک ہی رات میں کیا کر گئے ہجرت سب لوگ
کیا مرا خون بھی اس شہر میں سستا نہ ملا

ہم کہ اک عمر کھنگالا کئے ساتوں ساگر
اپنی ہی پیاس میں ڈوبے تو کنارا نہ ملا
رات خوابوں کے فسادات میں کھویا تھا جسے
صبح آئینے کے مرگھٹ میں وہ افسانہ ملا

● ہنستے ہنستے مجھے یہ زہر پلا دیتا ہے
وقت تاریخ کو افسانہ بنا دیتا ہے
اوّل اوّل تو مرے نام پہ اٹھ جاتے ہیں لوگ
آخرِ شب مرا قصّہ بھی مزا دیتا ہے
اپنے ہی خون کا پیاسا نہ ہو وہ شخص کہیں
ہر جگہ خون کی ندیاں جو بہا دیتا ہے
پوچھتا پھرتا ہوں کوئی مکاں ہے خالی
اور ہر ایک ترے گھر کا پتہ دیتا ہے
برف کا تودہ ہے وہ کون کرے گا باور
اُن کی اَن میں جو آگ لگا دیتا ہے
رات بھر جاگتا رہتا ہوں میں جس کی خاطر
وہ مجھے صبح کی سولی پہ سُلا دیتا ہے

● مجھ سے پہلے میرے اندر مرنے والا کون تھا
زندگی جھوٹی کہانی تھی تو سچّا کون تھا
بے رخی کیسی سزا اور مہربانی کیسا صلہ
سارے چہرے تھے اُسی کے اور کس کا کون تھا
کیا خطا کی وقت نے جو ہم کو یکجا کر دیا
مجھ سے بدتر کون تھا اور تم سے اچھا کون تھا

وہ اگر کمرے میں سوتا تھا اکیلا رات بھر
صبح تک چوکھٹ پہ میرے ساتھ بیٹھا کون تھا
اس ہجومِ شہر میں کوئی نہیں تو کیا ہوا
اس بھرے گھر میں بھی اے دل سوچ تیرا کون تھا
کیا سمجھ کے تم نے میرا سر اڑایا تھا بھلا
مجھ سے بڑھ کر میرا دشمن اہلِ دنیا کون تھا

• تجھ سے آگے گذر گئے ہم لوگ
زندگی ! تجھ پہ مر گئے ہم لوگ
سن کے آج آئینے کی خاموشی
اپنی آنکھوں سے ڈر گئے ہم لوگ
کس کے دامن میں گرنے والے ہیں
کس کی آنکھوں میں بھر گئے ہم لوگ
بن گئے نقشِ پائے وحشتِ شوق
خاک وخوں پر نکھر گئے ہم لوگ
وقت کو دیکھ کر بہت پیچھے
دشتِ غم میں ٹھہر گئے ہم لوگ
بیچ جنگل میں مل گیا تالاب
چاند بن کر اُتر گئے ہم لوگ

● میری غزلوں سے کوئی بات چلی تو ہو گی
میرے جی اٹھنے کی افواہ اُڑی تو ہو گی
اتنا میلا بھی نہیں دل کہ نہ پہچان سکو
ہاں! مہ و سال کی کچھ گرد جمی تو ہو گی
زیست ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تو نہیں ہے اے دوست
کوئی دیوار ترے گھر کی گری تو ہو گی
اک جواں مرگ کے پندار کی کیا عمر سنائیں
دکھ سے چھوٹی ہی سہی سکھ سے بڑی تو ہو گی
اس نے چھوڑا تو سہی ملکِ تمنا لیکن
آخری سانس تلک جنگ لڑی تو ہو گی
آنکھ سے دور ہی ڈوبے تھے سبھی چاند مگر
دل کے ساحل سے کوئی لاش لگی تو ہو گی

● اور کب تک وہ بھلا رنجِ تباہی دے گا
رفتہ رفتہ مجھے جینا بھی سکھا ہی دے گا
کیا خبر تھی کہ وہ شہکار بنا کر مجھ کو
ایک دن حرفِ غلط کہہ کے مٹا ہی دے گا
تم نے کس موڑ پر چھوڑا ہے اِسے کیا معلوم
دل تو اک اندھا سوالی ہے دعا ہی دے گا
پھیلتا آئے گا یہ شہر ابھی کتنی دور
کیا مرے گاؤں کو مٹی میں ملا ہی دے گا
ظلم سہنا بھی سکھایا تھا اسی نے مجھ کو
ظلم کرنے کی ہدایت بھی خدا ہی دے گا
میرے شعروں سے مرے غم کا اجالا لے کر

کیا زمانہ مجھے سجدوں کی سیاہی دے گا

● سنا ہے وقت وہ تصویر بھی اُتار گیا
تو ٹھیک ہی ہوا آنکھوں سے کچھ غبار گیا
دعائیں دے اے مصور کہ کیا مکان تھا جو
جلا تو جل کے ترے فن کو بھی نکھار گیا
ہمارا عہدِ درخشاں تو ہو گیا تاریک
فضول بحث کہ کس کس کا اعتبار گیا
یہاں تو سارے ہی آشفتہ سر سے لگتے ہیں
وہ شخص کس لئے پتھر مجھی پہ مار گیا
جو سب نے دیکھی وہی سب نہ تھی حیات مری
کہ اپنے ساتھ بھی اک عمر میں گذار گیا
ہر اک متاع لٹا دی متاعِ غم کے سوا
میں زندگی کے لئے زندگی سے ہار گیا

● وہ بے وفا ہے مگر رحم کر گیا بھی، تو کیا
میں اپنی آنکھ کے پانی میں مر گیا بھی تو کیا
مرے وجود کو چھو جائے وہ تو کھیل ہو ختم
ذرا خیال سے لگ کر گذر گیا بھی تو کیا
گو زخم زخم ہے سینہ مگر ملال نہیں
میں جاگتا ہوں، وہ سوتے میں ڈر گیا بھی تو کیا
تری نگاہ بنوں یا تری نگہ میں رہوں
سمٹ گیا بھی تو کیا میں بکھر گیا بھی، تو کیا

مجھی سے روح کا سودا بھی اس کو کرنا تھا
بدن چُرا کے وہ ناداں مکر گیا بھی تو کیا
بچا کے لے گیا خود کو تو کیا بخیل نہ تھا
وہ ہست و بود کا کشکول بھر گیا بھی تو کیا

○

پلکیں تھیں تری یا کہ تھا احساس کا طور
چھن چھن کے اتر آتا تھا کونین کا نُور
صدقے میں تری آنکھ کے تُل جاتا تھا
وجدان کی میزان میں ہستی کا سرور

○

بے ساختہ لمحوں میں تھے عالم عالم
تھر تھر کبھی کانپے تو تھے درہم برہم
ہر زاویۂ تکوین کا ضامن یعنی
ہستی، ترے ہونٹوں کی لکیروں کا کرم

○

جلال مدنی

محمد جلال الدین مدنی فرزندِ محمد زین العابدین بلرامپور ضلع مدورے میں 1935ء میں پیدا ہوئے۔ امریکن کالج مدورے سے انٹرمیڈیٹ اور بی۔کام کرنے کے بعد (Chartared Accountancy) امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ ان امتحانات سے سبکدوش ہونے کے بعد (Chartared Accountancy Institute) کے ممبر ہوئے سیلم شہر میں پراکٹس شروع کی اور آج تک اسی پیشہ کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں۔

بچپن ہی سے اردو شاعری کی طرف مائل تھے۔ ماحول مختلف ہونے کے باوجود شعر و شاعری کا ذوق اور اس کی خاموش چنگاریاں ان کے

ذہن و دل میں دبی ہوئی تھیں اور ان چنگاریوں کو آنچ کا روپ دینے میں" بزمِ ادب" کشنگری نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ آپ کو غزل اور نظم دونوں صنفوں میں ملکہ حاصل ہے۔ آپ کی شاعری کہیں یادوں کی دلآویز خوشبو بکھیرتی ہے تو کہیں زخم خوردہ احساسات اور بیتے ہوئے لمحوں کے سوئے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے۔ آپ کا لہجہ روایات سے قریب ہوتے ہوئے بھی دل کو چھو جانے والی کیفیات سے معمور ہے۔ آپ ہلکے پھلکے خیالات کو بھی بڑے اچھے شعری پیکر عطا کرنے کے رموز سے آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی غزلوں کی آواز جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ موصوف نے بہت کم کہا ہے لیکن جو بھی کہا ہے اس میں زندگی اور زندگی کے تجربوں میں سانس لینے والی تلخیوں اور سچائیوں کا ذائقہ موجود ہے۔ آپ کا شعری سرمایہ اگر منظرِ عام پر آجائے تو یقیناً سیلم شہر کی بھرپور نمائندگی کر سکے گا۔

○

درد جب حد سے بڑھ گیا ہوگا
دل کو آرام آچکا ہوگا

باقی کیا ہوگا زندگی کے لئے
غم بھی جب مجھ سے چھن گیا ہوگا

وقت کی مصلحت نہ جو سمجھے
حال اُن کا جلالؔ کیا ہوگا

○

امر اُسی کی ہوئی زندگی زمانے میں
سپھل ہوا جو محبت میں سر کٹانے میں

ہمارے خون سے لکھا گیا فسانہ مگر
نہیں ہمارا کہیں نام تک فسانے میں

جلالؔ اُن کو بھی غم ہے ہمارے مٹنے کا
جو پیش پیش رہے تھے ہمیں مٹانے میں

○

سالک نائطی

ظہیر حسین سالک نائطی فرزند حضرت علامہ غضنفر حسین شاکر نائطی کے سب سے بڑے فرزند ہیں۔ 1936ء کو آپ عمرآباد میں پیدا ہوئے۔ حضرت شاکر نائطی کی توجہ خاص سے سالک نائطی نے بڑی تیزی سے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی چاروں زبانوں میں مہارتِ تامہ حاصل کی۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر نیو کالج، مدراس سے بی، اے، کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کم سنی میں ہی (کوئی دس بارہ سال کی عمر میں) آپ نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے والد بزرگوار کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ علامہ شاکر نائطی نے اپنے فرزندوں کو بچپن ہی غالب کی غزلیں از بر کرائی تھیں اور اسی طرح سالک نائطی اور ان کے چھوٹے بھائی کاظم نائطی دونوں میں شعر گوئی کا خاص ذوق پیدا کر دیا تھا۔

سالک نائطی آج ٹمل ناڈو کے ان چند گنے چنے ممتاز شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی شاعری میں تمام فنّی محاسن پائی جاتی ہیں۔ سالک نائطی کی زبان بڑی شستہ اور دل آویز ہے اور لہجے میں قدیم و جدید رنگ آمیزش بڑی دل فریب ہے۔ سالک نائطی جس محفل میں ہوتے ہیں اس محفل میں جان سی پڑ جاتی ہے اور وہ تمام کی توجّہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ آپ صوفی منش ہیں۔ اور اپنے والدِ بزرگوار ہی سے خلافت حاصل کی ہے۔ آج کل آپ خانقاہِ علیمیہ میں سجّادہ نشین ہیں۔ سالک نائطی چھپنے چھپانے کی طرف بہت کم دھیان دیتے ہیں۔ اگر ان کا کلام منظرِ عام آجائے تو ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دے گا۔

سہ

- یہ سچ ہے وہ سکون کی جاگیر لے گیا — کیا جانے والا ساتھ ہی تقدیر لے گیا
  تشریح درد کے لیے اب لفظ بھی نہیں — وہ مجھ سے میری شوخیٔ تحریر لے گیا
  دیکھا کہ شوقِ قتل نہ پورا ہوا ابھی — مقتل کی سمت اپنی وہ شمشیر لے گیا
  اس کی درازِ عمر کی کیا مانگئے دعا — تاثیر سے ہی پہلے وہ تاثیر لے گیا

- سناٹے گنگناتے تھے لے لے کے تیرا نام — کل رات مجھ سے تھا مرا ماحول ہم کلام
  اک عمر مجھ کو یاد نہیں کس طرح کٹی — اور اب غمِ حیات یہ بھاری ہیں صبح و شام
  اب کے برس بھی بیت گئی رُت بہار کی — لیکن نہ تم ہی آئے نہ بھیجا کوئی پیام
  سالک نہیں ہیں اجنبی شہرِ غزل میں ہم — یہ اور بات ہے نہیں مشہور اپنا نام

اقبال رمز

محمد اقبال حسین رمز (برادر رازؔ امتیاز) بہ مقام کرشنا پیٹ ، مدراس 9 ر ستمبر 1936ء کو پیدا ہوئے ۔ ابتدائی عربی ، فارسی اور اردو کی تعلیم خود اپنے ابّا حضور خطیب محمد غلام دستِ گیر نوراللہ مرقدہٗ سے حاصل کی ۔ بچپن ہی سے شاعری سے دلی لگاؤ تھا ۔ شاعری کی بسم اللہ نعت گوئی سے کی۔ مارچ 1967ء میں مولانا مولوی سید محمد عمر آمر کلیمی سے بیعت کا شرف حاصل ہوا اور 14 مارچ 1985ء میں آپ کو شیخ نے اپنے سلسلے کی خلافت سے بھی نوازا ۔

بیعت کے بعد شیخ نے محمد اقبال حسین کو حسان تخلص عطا کیا ۔ اور آپ اب حسان الآمری کے نام سے جانے جاتے ہیں ۔

○

عشق نبی کا جب سے چسکا لگا ہوا ہے ۔۔۔ قلب و نظر میں ہر پل طوفان سا بپا ہے
مابین میرے ان کے کچھ فاصلے نہیں ہیں ۔۔۔ صدیوں سے میرا انکا رشتہ جڑا ہوا ہے
منکر نکیر نے جب دیکھا تو ہنس کے بولے ۔۔۔ سونے دو اس کو یارو دولھا نیا نیا ہے
سب کو ترستے دیکھا سب کو لرزتے دیکھا ۔۔۔ رحمت برستے دیکھا جب ان کا در کھلا ہے

شاہوں کے شاہ ہیں وہ عالم پناہ ہیں وہ
حسّان تو ان کے در کا ادنیٰ سا اک گدا ہے

○

حیاتؔ مدراسی

محمد عبداللہ حسین حیاتؔ مدراسی فرزندِ محمد عبدالغفور صاحب شوکت 1928ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ 1950ء میں اجمل سعیدی کی صحبتوں میں شاعری شروع کی۔ 1954ء میں ضیا فتح آبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہوئے۔ برسوں انہیں کلام دکھاتے رہے ضیا فتح آبادی جب دہلی واپس چلے گئے تو حضرت آثیم کرنولی کی طرف بغرضِ اصلاح رجوع ہوئے۔ حضرت دانش فرازی اور کاوش بدری سے ابھی استفادہ کرنے کے بھرپور مواقع انھیں نصیب ہوئے ہیں۔ ان دونوں حضرات سے استفادہ کرنے کے بعد آپ کی شاعری میں نیا شعری احساس جاگ اٹھا اور جدید رجحانات کے تحت شعر کہنے لگے۔

○

ہر طرف زندگی، ماتم ہے — آخر اس دور کو ہوا کیا ہے
آبروئے وفا کی ہے توہین — شکوۂ ظلم ناروا کیا ہے
یہ تو صدقہ ہے تیرے گیسو کا — یہ مہکتی ہوئی ہوا کیا ہے

○

مرے جنوں کا شجر جب بھری بہار میں تھا — تمام گلشنِ جاں میرے اختیار میں تھا
میں چل پڑا تھا زمان و مکاں کی قید سے دور — بدن مرا در و دیوار کے حصار میں تھا
اگرچہ جسم مرا بٹ گیا تھا حصّوں میں — دیار میں جو تھا عالم وہی مزار میں تھا
وہی تو تھا مرا سرمایۂ حیات، حیاتؔ — جو درد و کرب تری چشمِ اشکبار میں تھا

○

محمد عبدالغفور شوکت (المتوفی 1957ء) بہت اچھے خطاط بھی تھے جنہوں نے شریفؔ مدراسی اور شاطرؔ مدراسی کی غیر مطبوعہ نظمیں اور مخمس کی خطاطی کی تھی۔ جس کا ایک نسخہ حیاتؔ مدراسی کے پاس آج بھی موجود ہے۔

کاظم نائطی

کاظم حسین شاکر کاظم نائطی فرزندِ علامہ شاکر نائطی ، 14 ر نومبر 1938ء بہ مقام عمرآباد (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم خود اپنے والد سے حاصل کی۔ بچپن ہی سے علمی، ادبی اور مذہبی ماحول ان کو ورثہ میں ملا تھا۔ اردو شاعری کی وسیع کائنات گویا ان کے گھر کی چار دیواری میں بھرپور سانس لے رہی تھی۔ شاعری کے نشیب وفراز اور اس میں پروان چڑھتے ہوئے تمام تر خدوخال سے کلی طور پر واقف ہی نہیں بلکہ ان پر قدرت بھی حاصل ہے۔ اچھے اور سلجھے ہوئے تنقیدی شعور کا خزانہ ان کے اندر موجود ہوتے ہوئے بھی اس کے صحیح مصرف سے وہ بالکل نابلد ہیں۔ دھان، پان کے اس فن کار نے علیم صبا نویدی کی صحبتوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے گذشتہ سال ایک تنقیدی مجموعہ "لہجہ تراش" 1984ء میں (علیم صبا نویدی کے فن اور شخصیت کا منفرد جائزہ) اردو ادب کو دیا جس کے متعلق ڈاکٹر علیم اللہ حالی رقم طراز ہیں۔ " کاظم نائطی نے عام تنقیدی لب ولہجے سے ہٹ کر شگفتہ اور دل خوش کن اندازِ تحریر اپنایا ہے جس کی وجہ سے اُن کی تنقید، فکر واحساس دونوں سے اپنا رابطہ پیدا کرلیتی ہے۔" اردو شاعری کی ہر صنف ان کے ذہنی ذائقہ سے مکمل آشنا ہے۔ اردو افسانوی ادب کے اُفق کو بھی انہوں نے نہایت لگن اور خاص احساس سے چھُونے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس صنف میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا اندازہ ہمیں ان کے افسانوی مجموعے کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہی ہوگا۔

میں جو اکثر شور وغل میں خود کو تنہا لے گیا
مجھ سے ہوکر حشر بھی اپنا سا چہرا لے گیا

ہاں میں اپنی پشت کے سورج سے تھا کچھ بے خبر
مجھ کو کتنی سَرد دیواروں پہ سایا لے گیا

اس طرح خاموش لب کی دستکیں کام آگئیں
لوٹنے والا صداؤں کا پلندا لے گیا

شور، ہنگامہ، صدائیں، وحشتیں شکوے گلے
اٹھ گیا کاظم تو یہ سارا تماشا لے گیا

غزلیں

○

نہیں خیال کہ لوٹ آؤں اپنے گھر کی طرف   سفر ہنوز ہے اک لغزشِ دگر کی طرف
کسی خیال نے دھندلا دیا انھیں یکسر   بڑھے تھے کتنے ہی منظر مری نظر کی طرف
نہیں یہ خدشہ کہ اب لاش سر اٹھائے گی   کھڑے ہیں پھر بھی کئی لوگ میرے سر کی طرف
جو پوچھتے ہیں کہ جلتا ہے کس طرح خاشاک   اچھال دے کوئی اس شہر کو شرر کی طرف
ہتھیلیوں پہ سمندر اٹھائے گا کاظم
کہیں جو پھیل گیا دشت، چشمِ تر کی طرف

○

زمیں زمیں جہاں پھیلا ہوا نیا پن تھا   اُفق اُفق مرا اُڑتا ہوا سا دامن تھا
یہ آئینہ نہیں عکسِ اُمید کا خرمن   شکستہ چہرہ مرا حسرتوں کا مسکن تھا
رجالِ غیب سمتوں کا کچھ خیال نہیں   ہر ایک سمت کسی کی طرف مرا من تھا
مرے وجود میں سب کچھ تھا پھر بھی لگتا تھا   کسی بسیط خلا پر نفیس چلمن تھا
تھے بانسری سے یہ دیوار و در کے سب روزن   تمام وقت مرے گھر میں رقصِ ناگن تھا
یہ سچ ہے سانچ کو کاظم نہیں آنچ کوئی
یہ زہر ہی تو مری زندگی کا کارن تھا

○

کوئی منظر ترا چہرا نہیں ہونے والا   نُور جو بن گیا، سایا نہیں ہونے والا
سب نمائش ہے اگر شوق نہیں ذوق نہیں   لاکھ جُھک جائیے سجدا نہیں ہونے والا
عرصۂ دہر کو اذہان سے ناپیں پھر بھی   عرصۂ زخم سے گہرا نہیں ہونے والا
جب گنہ لذت و جرأت سے ہوا دوچار   خوف کچھ باعثِ توبہ نہیں ہونے والا
لذتِ جسم زمیں چکھ گئی ہوگی ورنہ   شہر میں زلزلہ ایسا نہیں ہونے والا
گفتگو خشک جو ہونے لگی اُٹھا کاظم
وہ کسی طور سے پیاسا نہیں ہونے والا

○

نجم الہدیٰ

ڈاکٹر پروفیسر نجم الہدیٰ صدر شعبۂ اردو، فارسی اور عربی، مدراس یونیورسٹی، مدراس (فرزندِ مولوی نور الہدیٰ، ضبط موتی ہاروی) موتی ہاری بہار میں 1938ء میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ اور بہار یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم۔ اے کے امتحانات امتیازی طور پر پاس کئے۔ 1971ء میں ایل۔ ایل۔ بی اور 1973 میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لیں۔ 1961ء سے 1962ء تک بہار یونیورسٹی میں لکچرر اور ریڈر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ یکم جولائی 1977ء میں مدراس یونیورسٹی میں بطورِ ریڈر، صدر شعبۂ عربی وفارسی واردو آپ کا تقرر عمل میں آیا اور تقریباً چھ سال کے بعد شعبے کی پروفیسرشپ حاصل ہوئی۔

تقریباً 32 سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج تک آپ کا کوئی مجموعہ کلام منظر عام نہ آسکا لیکن تنقیدی اور تحقیقی کام بہت زیادہ کیا ہے۔ اس موضوع پر پانچ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

آپ کے تنقیدی مضامین میں جو فنی بصیرت، فکری عمق اور تجرباتی توانائی کے جوہر پارے روشن ہیں وہ آپ کے شعور ولاشعور کی وسعتوں کی شناخت میں کافی ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ بالخصوص آپ کی نثری تحریریں جذب وکشش کی کیفیات سے مملو ہیں۔ شاعری سے زیادہ آپ کی شخصیت کے اعلیٰ وارفع جوہر آپ کی تنقیدوں میں کھلتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تامل ناڈو کے اکثر پروفیسر آپ کی شخصیت اور ادبی صلاحیتوں کے تعلق سے ہنوز تعصب اور عصبیت کا شکار ہیں۔ لیکن آپ کی وسیع النظری اور فراخ دلی کے بہترین نقوش مولف تذکرہ پر ہند و پاک کے اکابرینِ ادب (مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر، شمس الرحمن فاروقی

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر فضل امام، ڈاکٹر احمد سجاد، ڈاکٹر عبدالمغنی، اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید وغیرہ) کے لکھے ہوئے گرامی آرار اور مضامین پر مشتمل تالیف "آسمانِ فن کا سفیر" کی ترتیب و تدوین سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے مرتب کی حیثیت سے موصوف نے جو ابتدائی کلمات سپردِ قلم کئے ہیں وہ موصوف کے دل کی سچی آواز ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سچائیوں کی لہر کئی ایک دلوں میں زہر بن کر اتر گئی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر دور میں سچ کہنے اور لکھنے والا جیالا فن کار بدنامِ زمانہ رہا ہے۔ اگر اس الزام کی آنچ نجم الھدیٰ پر بھی آتی ہے تو اس آنچ سے آپ کی شخصیت اردو ادب کی تاریخ میں کبھی جھلس نہیں سکتی۔ مولفِ تذکرہ پر مرتب کردہ کتاب کے علاوہ آپ نے تامل ناڈو کے بہت سے شعری مجموعوں پر مقدمے اور پیشِ لفظ لکھے ہیں۔ مدراس ——— کے اکثر احباب آپ کی بھاری بھرکم شخصیت سے بے حد متاثر ہیں لیکن اس شخصیت کی علمی وسعتوں میں جنم لینے والی فکری تابانیوں اور رعنائیوں سے مدراس ابھی تک پوری طرح آشنا نہیں ہوا ہے۔

○

نعت

مری سوئی ہوئی قسمت اگر بیدار ہو جائے
جمالِ مصطفےٰ کا خواب میں دیدار ہو جائے

مجھے دنیا و مافیہا سے مستغنی بنا دے گی
مری جانب اگر چشمِ کرم اک بار ہو جائے

ملے وہ دولتِ عشقِ الٰہی آپ کے در سے
کہ گنجِ شائگاں میری نظر میں خوار ہو جائے

عطا ہو مجھ گدائے بے نوا کو وہ سخن سنجی
کہ جذبِ اندروں شائستہ اظہار ہو جائے

مجھے ہر ما سوا سے توڑ کر اپنا بنا لو تم
مرے مولیٰ مجھے حاصل تمہارا پیار ہو جائے

وہی نجم الھدیٰ جو آپ کے در کا بھکاری ہے
سہارا آپ دیں تو اس کا بیڑا پار ہو جائے

دل کی باتیں کون سنائے، کون یہاں سننے والا ہے — جو ہے اپنی ذات میں گم ہے، ہر انساں خود بول رہا ہے
وقت مسلسل بھاگ رہا ہے، ہر پل پیچھے چھوڑ رہا ہے — صبح کا منظر شام کو بدلا، شام جو ہے وہ صبح فنا ہے
رنگ بھی دھوکا، لمس بھی دھوکا، ذائقہ بھی بس لمحہ بھر کا — بوئے گل اور سمع ترنم، تیز ہوا کا جھونکا ہے
ہستی اپنی کیسی ہستی، اک تسلسل صبحِ ازل کا — اوّل و آخر، باطن و ظاہر، سب تو ہی ہے بیچ میں کیا ہے
دنیا دنیا، لذت لذت اپنی مسرت ڈھونڈنے والے
تیرے ہی دل میں وہ مضمر ہے، باہر دھوکا ہی دھوکا ہے

آذر بیا بانی

سید نعیم الرحمان آذر بیا بانی بہ مقام دھن کنڈھ (نیلور ڈسٹرکٹ) ۱۲ جون 1939ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی سید یوسف قادری بیا بانی کرنولی (المتوفی 1980ء) موضع نیلور کے مشہور حکیموں میں سے ایک تھے۔ طبابت ہی کے سلسلے میں مدراس آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ آذر بیا بانی کی ابتدائی تعلیم، تربیت مدراس کے ماحول میں ہوئی۔ علیگڈھ سے ادیب کامل اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے بی۔ او۔ یل اور ایم۔ اے کی سندیں حاصل کیں۔ اور پھر مدراس کو خیر باد کہتے ہوئے نیلور کے کسی ہائی اسکول میں اردو منشی کے عہدے پر مامور ہو گئے اور آج بھی نیلور ہی میں بیٹھے علم وادب کے چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر کم ہونے کے باوجود مشق ومزاولت اور پختگی کی روشن دلیل ہے۔ چونکہ آذر بذاتِ خود ایک فن کار ہیں۔ فن اور تخلیقی تقاضوں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اور اس کا حق بھی پورے انہماک کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کی تخلیقات ہندوستان کے مقتدر رسائل میں جگہ پا چکی ہیں۔ ان کے یہاں آگے بڑھنے اور اپنے مقام کے تعین کے سلسلے میں بڑے اچھے امکانات پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کا تعلق آندھرا پردیش سے ہے لیکن ان کی ذہنی، ادبی اور ثقافتی نشو ونما میں تامل ناڈو کا ماحول، تہذیب اور حضرت دانش فرازی کی صحبتوں کا بہت بڑا دخل ہے۔

○

یہ مت پوچھو ہم نے تمھارے شہر میں کیا کیا دیکھا ہے
آگ لگی ہے رستہ رستہ، سایہ سایہ جلتا ہے

کس کی کھوج میں نکلا تھا میں یہ تو مجھے معلوم نہیں
میرے تعاقب میں سنتا ہوں پیچھے آگ۔ کا دریا ہے

رات نہانے کیا آئی ہے جاگ اٹھے ہیں جبیں کے زخم
اور کسی گوشے میں بیٹھا دیر سے کوئی روتا ہے

پتہ پتہ پر لکھی تھی جس نے کل رودادِ حیات!
ننگے پیڑ کی بانہوں میں وہ غم کا مارا رویا ہے

آذرؔ جانے کھو بیٹھا ہے کیا کیا شہر کی گلیوں میں
گھوم رہا ہے رستہ رستہ، چہرہ چہرہ تکتا ہے

○

کہاں ثبات و قرار میں تھا
ہر ایک خود سے فرار میں تھا

پرت پرت عکس ریز آنکھیں
نفس نفس انتظار میں تھا

تھی خوب آنکھوں کی خوش نگاہی
خمارِ منزل غبار میں تھا

اتر پڑا رات کے بدن میں
جو زہر دن کی پکار میں تھا

وہی ہے روئے سیاہ آذرؔ
ہزار وہ جوئبار میں تھا

●●

اشرف سعودی

مولانا اشرف سعودی، فاضل دیوبند شیخ الحدیث ومفتی دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور فرزندِ ارجمند حضرت مولانا ابوالسعود احمد بہ مقام بلنچپور (شمالی آرکاٹ) 1940ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے دینی وعلمی فضا میں آنکھ کھولی۔ شعرگوئی سے آپ کا دہبی لگاؤ ہے۔ جدید نظمیں اور غزلیں بہت زیادہ لکھی ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں آپ کا لہجہ عام روش سے مختلف ہے۔

مولانا ان معدودے چند علمائے دین میں سے ہیں جنہوں نے ادب کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں کا پاسبان بنانے کے باوجود اسے پروپگنڈہ بننے نہیں دیا۔ آپ کی تخلیقات فن اور قدر دونوں کے حسین ترین امتزاج کا نمونہ ہیں۔

مولانا اشرف سعودی سہ ماہی "سلسبیل" کے مدیر بھی ہیں جو 1980 سے بنگلور سے شائع ہورہا ہے۔ اس جریدے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف اردو کے ایک اچھے صحافی بھی ہیں۔ "سلسبیل" بہ یک وقت مذہبی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہے اور قدر ومنزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

○

گنگناتی فضا میں پھولو ہو ۔۔۔ دندناتی فضا کو بھولو ہو
اے سمندر میں تیرنے والے ۔۔۔ کیا کبھی تھاہ کو بھی چھولو ہو
ہم تو پیتے ہیں چشمِ مست کی مئے ۔۔۔ تم یہ کیا ساغر وسبو لو ہو
سب حقائق ہیں دفن زیرِ زمیں ۔۔۔ تم محیطِ جہاں ہیولو ہو

جان دیدیں گے اس پہ ہم اشرف
تم جو اردو کا اب لہولو ہو

○

ریت سمجھو، رواج پہچانو
زندگی کا مزاج پہچانو

کج کلاہی کرے ہماری کیا
سر پہ کس کے ہے تاج پہچانو

کب تک آخر مطالعہ ہوگا
نگہ احتجاج پہچانو

پہلے تشخیص تو مرض کی ہو
پھر طریقِ علاج پہچانو

سیر چشموں کے فن کی قدر کہاں
صاحبِ احتیاج پہچانو

زعم باطل کو چھوڑ کر، اپنا
صفحۂ اندراج پہچانو

کیا قیامت کی چال ہے اشرف
کل نہیں اس کو آج پہچانو

نعت

آتشِ عشقِ نبیؐ میں جل کے سکھ پانے کا نام
زندگی ہے آپؐ پر قربان ہو جانے کا نام

مسجدِ نبوی، مرے سرکار کا جلوت کدہ
گنبدِ خضرا ہے اُنؐ کے تخلیہ خانے کا نام

شمعِ بزمِ کُن فکاں کے نعت خوانوں میں تو اب
آ رہا ہے مرحبا اشرف سے پروانے کا نام

حسن فیّاض

اردو شاعری کے جدید تقاضوں اور قدیم روایات کی پاس داری کی کوکھ سے جنم لے کر ٹمل ناڈو کے ادبی حلقوں میں بڑی متانت، سنجیدگی سے چھا جانے والی معتبر شخصیت کا نام حسن فیّاض ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب ٹمل ناڈو کے شعری ادب کے اولین شہسواروں میں میر ولی فیّاض ؔ کی دہلوی سے ملتا ہے۔ آپکے والدِ ماجد کا اسمِ گرامی بھی میر علی فیّاض (متوفی 1982ء) تھا جو اردو ادب و شعر کے دلدادہ تھے۔ گویا حسن فیّاض کو بھی شعری اور ادبی ذوق کا خزانہ میراث میں ملا ہے۔

حسن فیّاض کی شاعری میں جو فکری عنصر کار فرما ہیں وہ اُن کی شاعری کے گہرے مطالعہ سے ظاہر نہیں ہو پاتے ہیں بلکہ قاری کو ان کے ذہنی و علمی پس منظر کے ساتھ ساتھ ان کے ارد گرد نمو پانے والے اچھے اور بُرے اثرات تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔ گویا میں یوں کہوں بے جا نہ ہوگا کہ حسن فیّاض کی شاعری کی تہہ میں جو فکر کی دبیز پرتیں ہیں اُن پرتوں پہ ہنستی کھیلتی، مہکتی ہوی ایک عمدہ اور دلکش کائنات ہے، اس کائنات میں حسن فیّاض سے ملاقات دشوار سہی ناممکن نہیں ہے۔

ایک خاص بات حسن فیّاض میں یہ ہے کہ وہ کسی فلسفی کی طرح سوچتے ہیں اور ذہن ہی ذہن میں منطقانہ رویّہ اپناتے ہوے وجہ وجوازِ فکر تلاش کرتے ہیں پھر اپنے محاسب آپ بن کر شعر کو اچھا سے اچھا بناتے ہیں۔ شاید اسی لیے ان کی شاعری میں موضوع میں عمق، اسلوب میں امتیازی شان اور اظہار میں شستگی اور صفائی ملتی ہے۔

ے

ترے گیسو مرے شانوں پہ بکھر جانے دے	عمر کی عمر مری یونہی گزر جانے دے
پھر بتاؤں گا تجھے لذّتِ غم کیا شے ہے	مجھ کو اشکوں کے سمندر سے ابھر جانے دے
یا کسی اور طرف موڑ دے طوفانوں کا رُخ	یا مری زیست کا شیرازہ بکھر جانے دے
اے حسن لی ہے مری جان کسی نے لیکن	اس کا الزام کسی اور کے سر جانے دے

آرزو ایک بلا ہے وہ کہاں بولتی ہے	وہاں آتی ہے قیامت وہ جہاں بولتی ہے
تان کر لمبی یہ کیا آپ پڑے سوتے ہیں	سنئے کیا سرعتِ وقتِ گزراں بولتی ہے
زمزمہ سنجیٔ بلبل بھی نہ مرنے پائے	اس گھڑی ناز و ادا سے مری جاں بولتی ہے
دُوریاں گھٹتی ہیں دیواریں بھی گرتی ہیں	بولی تو کون سی مجھ سے مری جاں بولتی ہے

سہیل راشد

محمد شبیر احمد سہیل راشد 15ر جنوری 1943ء کو بہ مقام وانمباڑی (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے والدین کب مدراس آئے۔ لیکن سہیل راشد کی شعری اور فکری پرورش مدراس کے ادبی ماحول میں ہوئی سہیل راشد نے اردو شاعری کی تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نعت ان کی محبوب صنف ہے۔ اس صنف میں ان کی بہترین شعری صلاحیتیں اُجاگر ہوئی ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ "منزل نما" 1965ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔

○

ہو گئے بدنام تیرے شہر میں — کیا ملا آرام تیرے شہر میں
دردِ ناکامی ہجومِ بیکسی — پا چکے انعام تیرے شہر میں
کوئی اپنے میں رہے باقیدِ ہوش — اک خیالِ خام تیرے شہر میں

○

جو پسِ پردہ تھے کل تک خودنما کیوں ہو گئے — بت ابھی بننے نہ پائے تھے خدا کیوں ہو گئے
اپنا افسانہ تھا اپنے دور کی روداد تھی — اہلِ محفل پھر خدا جانے خفا کیوں ہو گئے

○

شاہ مدراسی

حبیب اللہ شاہ مدراسی 19ر نومبر 1943ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ نیو کالج مدراس سے بی۔ ایس۔سی (Botany) میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے کے بعد اسی کالج میں درس و تدریس کے عہدے پر مامور ہوئے۔ تعلیمی شعبے کے اس تعلق نے آپ کی تخیل میں وسعت، نظر میں بلندی پیدا کی ہے۔ نوجوان ہیں لیکن آپ کا ذہن ابھی قدیم اسالیب کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکا آپ کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر غزل سے وابستہ ہے۔ کم کہتے ہیں لیکن خوش گو ہیں۔ تخلیق کی پیکر تراشی میں خاص انہماک اور لگن سے کام لیتے ہیں۔ غزل میں تصوف کے مسائل پیش کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ آپ نے حیات و کائنات کے مختلف زاویوں کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے اور ان کی روشنی میں اپنی تخلیقات کی ضو بڑھائی ہے۔ آپ کا کلام کسی قسم کے تصنّع سے پاک ہے۔ اکثر غزلوں میں غم اور خوشی کی کیفیات کو پیش کرنے میں بڑی تجربہ کارانہ صلاحیتوں سے کام لیا ہے۔

تامل ناڈو میں جدیدیت کے عناصر پوری توانائی کے ساتھ کارفرما ہیں اور انہیں اپنانے والوں کا ایک قافلہ بھی سرگرم سفر ہے لیکن اس قافلہ سے دور حبیب اللہ شاہ نے اپنی آواز کی پرورش میں جن مسائل کا سہارا لیا ہے وہ بہت مستحسن ہیں۔

○

کیفیت غم کی بڑھی ہے جب خوشی کے نام سے
دل تڑپ کر رہ گیا ہے زندگی کے نام سے

وہ بھی دن تھے، شام غم میں تھی تمنائے سحر
آج ہم گھبرا رہے ہیں روشنی کے نام سے

کر چکا ہے گانۂ ہستی مرا ذوقِ جنون　　ہوش اب اڑنے لگے ہیں آگہی کے نام سے
ہم شبِ غم میں لپٹ کر چاندنی سے سو گئے　　اس قدر سہمے ہوئے تھے تیرگی کے نام سے
شاؔہ یوں ہے محوِ حیرت اے خدا اس دہر میں
کھا گیا ہے جیسے دھوکا زندگی کے نام سے

○○

یعقوب اسلم

یعقوب اسلم 18 ر جولائی 1945ء کو بہ مقام آلنگائم (شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ یعقوب اسلم دارالسلام عمرآباد کے فارغ التحصیل ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو زبان سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں رندی اور سرشاری کے وہ عناصر ملتے ہیں جن سے ہر شعر میں شرابِ دو آتشہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کلام کے مطالعہ سے ان کی غیر معمولی ذہانت اور تبحرِ علمی کا پتہ چلتا ہے۔ آج کل ان کی شعری تخلیقات میں نئے احساس، نئی فکر اور نت نئے زاویوں کی دھیمی آنچ آسمانوں کی

طرف سر اٹھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ روایت کی پاس داری نے انہیں ایک زمانے تک اپنی ذات کے خول سے باہر نکلنے نہیں دیا تھا۔لیکن آج ان کی شاعری کے تیور نئی جلوہ سامانیوں سے آراستہ اور مزین دکھائی دیتے ہیں۔

ان کی مندرجہ ذیل تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

1۔ اردو گرامر 3۔ ضرب الامثال

2۔ اردو خطوط اور مضامین 4۔ معیاری کہانیاں (بچوں کا ادب)۔

5۔ چہروں کی دیوار (افسانوی مجموعہ) (6) رسولِ عربیؐ (شعری مجموعہ)

چیختے لفظوں نے ہر بات چھپا دی ہوگی دل کی آواز سنائی نہیں دیتی ہوگی
ذرہ ذرہ نے کہا ہے کہ وفادار تھا میں یہ میرے جرم کی اک زندہ گواہی ہوگی
جس کا دستور نہ ہو، رسم نہ ہو، ریت نہ ہو میں نے وہ بات کبھی تم سے نہ چاہی ہوگی
دل جلا میرا مگر مجھ کو یہ اندیشہ ہے آنچ دامن پہ تمھارے کہیں آتی ہوگی
اپنی منزل پہ پہنچ کر بھی میں گمراہ ہوا
میری قسمت جو مرے ساتھ ہی آئی ہوگی

لفظ بھٹکے ہوئے آہو ہیں پھسل جاتے ہیں اژدھے ہیں جو معانی کو نگل جاتے ہیں
وقت کی دھوپ میں جل جاتے ہیں اچھے اچھے موم کی طرح کبھی سنگ پگھل جاتے ہیں
اپنے دامن کو گوارا نہیں دھبوں کے نشان ہر برائی سے جو ہم صاف نکل جاتے ہیں
لوگ بنگلوں میں بھی کرتے ہیں گھٹن کا احساس پلنے والے جو ہیں فٹ پاتھ پہ پل جاتے ہیں
اک نئے دور کی آواز سنا کر اسلم
حوصلے والے زمانے کو بدل جاتے ہیں

○

لمبی طویل بات کا مفہوم مختصر
لفظوں کی کائنات کڑی دھوپ کا سفر

آؤ کوئی شجر کوئی سایہ کریں تلاش
شعلوں کی طرح جلتا رہے کون عمر بھر

بے نام سا کسیلا دھواں زندگی کا نام
بے کیف سی انوکھی صدا جسم و ذہن پر

اُمید و آرزو کی تو ہے داستاں طویل
محرومیوں کے کرب کا احوال مختصر

خود کو چھپانا چاہے تو اسلم وہ کیا کرے
خانہ تلاشی ہوتی رہی جس کی عمر بھر

○○

○

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سمندر رکھنا
سامنے سب کے شکایت کا نہ دفتر رکھنا

تجربہ سب سے بڑا دوست ہوا کرتا ہے
سر پہ گزرے ہوئے لمحات کی چادر رکھنا

زیست کی راہ پہ دلدل بھی ہیں کانٹے بھی ہیں
ہر قدم اپنا بہت سوچ سمجھ کر رکھنا

کون جانے کہ کہاں کس کی ضرورت پڑ جائے
دوست تو دوست ہیں دشمن بھی بنا کر رکھنا

جو سرکتے ہوئے لمحات میں ثابت ٹھہرے
گھر کی بُنیاد میں اک ایسا بھی پتھر رکھنا

شام ہوتے ہی جلا دینا نہ ساری شمعیں
آخرِ شب کے لیے چند بچا کر رکھنا

جُھوٹ سے کوئی غرض ہم کو نہ سچ سے مطلب
بولتے وقت مگر ہاتھ تو دل پر رکھنا

موت سڑکوں پہ کھلے عام پھرا کرتی ہے
اپنا نام اور پتہ جیب میں لکھ کر رکھنا

سر پہ ایک چھت ہو تو افلاس بھی چُھپ جاتا ہے
سر و سامان نہ سہی رہنے کو اک گھر رکھنا

راز کی بات بھری بزم میں کہنا ہے غلط
ساتھ پتھر ہوں تو شیشوں کو بچا کر رکھنا

خاکساری میں نہاں تھوڑی سی نخوت بھی رہے
لوگ جیسے ہوں اسی طرح کے تیور رکھنا

اپنے کھلیان بھی بھر جائیں گے اک روز اسلم
کھیت کی خاک پر دانوں کا مقدّر رکھنا

ضمیر عرفان

سید پیر رضائی ضمیر عرفان آستانوی ابن سید عبدالستار بہ مقام گڑیاتم، شمالی آرکاٹ 30 ر جنوری 1948ء (جس دن مہاتما گاندھی شہید ہوئے) کو پیدا ہوئے۔آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبا حضور سے حاصل کی۔تقریباً بیس سال سے شعر کہتے آئے ہیں۔لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ آج تک وہ گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مولف تذکرہ نے آپ کا کلام سنا ہے۔ حال ہی میں آپ نے غالب کی زمین میں ایک غزل سنائی جو بے حد پسند آئی۔ گھڑی سازی آپ کا پیشہ ہے۔

○

شیشہ نہ ہوا شیشۂ سیما میرے آگے — ہر رنگ حقیقت ہوی دھوکا میرے آگے
بے دید ہوا طاقتِ دیدار کا عالم — بے ہوش ہوئے طور پہ موسیٰ میرے آگے
اس دل میں مچلتے ہوئے ارمان بہت ہیں — اچھلا ہے تری زلف کا سودا میرے آگے

○

ظہیر احمد راہی فدائی

مولانا ظہیر احمد راہی فدائی 9 ر نومبر 1949ء کو کڑپہ (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کی ذہنی اور علمی تربیت کلّی طور پر ویلور (مدراس) میں ہوئی۔ آج سے بیس سال پہلے حصولِ علم کے سلسلے میں ویلور آئے۔ اور یہاں کے عربی کالج باقیات صالحات سے نو سالہ کورس کی تکمیل کے بعد اسی کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

راہی فدائی اُن جدید فن کاروں میں سے ہیں جن کے یہاں بھرپور توانائی کے ساتھ جدید غزل کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہے کہ راہی فدائی نے علائم کے استعمال میں کبھی وسیع خلاؤں کی طرف رنگوں کو نہیں اُچھالا وہ جو کچھ کہتے ہیں اسی میں ان کے سلجھے ہوئے شعور کو یقیناً دخل ہوتا ہے ورنہ ان کی تخلیقات بھی پہیلیوں کے منصب پر فائز ہوکر ہمارے ذہن کو اندھی دشاؤں کی طرف بھٹکنے پر مجبور کردیتیں۔

ان کا مجموعہ "تصنیف" (مطبوعہ 1984ء) منظرِ عام پر آکر خراجِ تحسین حاصل کرچکا ہے۔ اس مجموعے پر پیش لفظ عظیم نقاد جناب شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے۔ موصوف نے راہی فدائی کی شاعری کے ست رنگ پہلوؤں اور ان پہلوؤں سے پھیلنے والی نت نئی شعاعوں کا بڑے اچھے اور تیکھے انداز سے جائزہ لیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ موصوف کے خیالات سے اکثر اکابرینِ اردو ادب کو اختلاف ضرور ہے۔

نداق حادثۂ کشت وخوں سے گذرا ہے　غرورِ فکرِ خیالِ زبوں سے گذرا ہے
رگوں میں دھول جمی ہے نظر میں سنگِ گراں　شعورِ معرکۂ اندروں سے گذرا ہے
افق پہ چاند شفق سی حیا سحر کا نکھار　خنک نشاط کا لمحہ سکوں سے گذرا ہے
غلط قیاس پہ نادم ہے زائچہ خود ہی　وفورِ شوقِ رہِ بدشگوں سے گذرا ہے
عجوبہ ہائے زمانہ کو دیکھئے راہی
مزاج سادہ جہانِ فسوں سے گذرا ہے

شرافتوں کے رنگ میں شرارتیں خلط ملط　سرِ مذاق ہوگئیں حماقتیں خلط ملط
ہوا چلے نہ تند خو، فضا رہے نہ ترش رو　نفس نفس ہوا کریں حلاوتیں خلط ملط
بلند قد پہ مطمئن ہیں مبتلائے حسنِ ظن　انا کے ساتھ غیر کی عنایتیں خلط ملط
بزعمِ خویش آپ نے بہ بانگِ دہل کہہ دیا　وفورِ جوش میں ہوئیں وضاحتیں خلط ملط
حسب نسب بھی راہیا، بدل رہے ہیں زاویہ
فرشتہ خو کی تھاہ میں غلاظتیں خلط ملط

انسان سے نہ ڈر بچھو　چھت پر سے اُتر بچھو
فطرت سے بغاوت کیوں　کام اپنا تو کر بچھو
قدرت یہ خدا کی ہے　آدم کا پسر بچھو
اوپر نہ کہیں نیچے　سر میں ہے مگر بچھو
پھرتے ہیں سڑک پر اب　بے خوف و خطر بچھو
اپنوں سے ہوا خالی　لگتا ہے یہ گھر بچھو
آخر میں نہ ہو جائیں　سب زیور و زر بچھو
ہم راہ جو ہو راہی
ہر راہ مگر بچھو

سید اکبر باشاہ اکبر زاہد

سید اکبر باشاہ اکبر زاہد اکتوبر 1952ء میں وانمباڑی میں پیدا ہوئے۔ بی کام کرنے کے بعد انہوں نے تجارت پیشہ اپنایا۔ 1968ء میں پہلا افسانہ "تخلیق" لے کر ادبی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ آج اکبر زاہد افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ افسانہ نگاری سے ہٹ کر انہوں نے شاعری کی طرف خاص توجہ اور انہماک سے کام لیا ہے۔ آئے دن ان کی غزلیں "سالار" کے ادبی ایڈیشن میں جگہ پاتی رہتی ہیں۔ غزلوں سے زیادہ ان کی شخصیت نثری نظموں میں واضح اور نمایاں نظر آتی ہے۔ ویسے ان کے مختصر افسانے بھی آج کی نئی سوچ بوجھ کے آئینہ دار ہیں۔ غزلیں شاید انہوں نے بہت کم لکھی ہیں لیکن جو بھی لکھی ہیں اردو شاعری سے ان کے خاص لگاؤ کا نتیجہ ہیں۔

ان کے افسانے "فن کار" حیدرآباد "تیز گام" دہلی، "سالار" بنگلور میں شائع ہو چکے ہیں۔

○

جب بھی دل آسمان ہوتے ہیں
اہلِ دل میزبان ہوتے ہیں

نقشِ پا، راکھ اور چنگاری
منزلوں کی زبان ہوتے ہیں

راہ دے دے گا اب سمندر بھی
حوصلے درمیان ہوتے ہیں

اب بھی زاہد وفا کی بستی میں
حسرتوں کے نشان ہوتے ہیں

○

گو مرحلے ہیں ہزاروں، ہے حوصلہ پھر بھی
حیات ہے تو رہے گا یہ سلسلہ پھر بھی

مہر بلب تھی فضا میں اپنی تنہائی
اندھیری رات کا سناٹا بول اٹھا پھر بھی

یہ اور بات ہے کہ ہر دل عزیز ہوں لیکن
کشیدگی کا سبب کچھ نہ کچھ رہا پھر بھی

اب ان سے کوئی توقع نہیں مگر زاہد
یہ راز کیا ہے مچلتا ہے مدعا پھر بھی

○

مظفر شہ میری

مظفر علی مظفر شہ میری فرزند حاجی عثمان علی مرحوم 30 اپریل 1953ء کو کدری، ضلع اننت پور، آندھرا پردیش میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور بی اے اور ایم۔اے (اردو) کی ڈگریاں آندھرا پردیش سے حاصل کیں
مظفر شہ میری کا پیدائشی رشتہ حالانکہ آندھرا پردیش سے تھا لیکن ان کی ادبی زندگی کی نشو ونما اور فکری سانسوں کے رنگ و روغن کو نئی توانائی تامل ناڈو نے بخشی ہے۔
گذشتہ چار پانچ برسوں میں نئے ابھرنے والے نقادوں میں کاظم نائطی جلال عرفان، غیاث اقبال کے ساتھ ساتھ مظفر شہ میری کے نام تامل ناڈو کی سرزمین کے لئے واقعی ایک نئی امید کی کرن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص نئے موضوعات پر مظفر شہ میری کی تحریریں بڑی فکر انگیز اور معلومات افزار ہیں۔ ان کی تخلیقات ہندوستان کے مقتدر رسائل میں جگہ پا چکی ہیں۔ اردو نثر کی بہ نسبت انہوں نے اردو شاعری پر بہت کم توجہ دی ہے۔ لیکن جو بھی شعری تخلیقات ان کی منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اتنا ضرور احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے جدیدیت کے ڈھنڈورچیوں میں اپنا نام نہیں لکھوایا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کا شعری احساس روایت کی چھاؤں میں سانس لیتے ہوئے بھی آج کے نت نئے راستوں کے سفر کا ذائقہ دے جاتا ہے۔ ان کے اظہار میں جہاں زندگی کی دھوپ چھاؤں کی کسک ہے وہاں غم وخوشی کی مٹھاس بھی ہے۔
مظفر آج کل اسلامیہ کالج وانمباڑی میں اردو پروفیسر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

روشنی کے میلے لگتے تھے جہاں
اب اندھیروں کا تماشہ ہے وہاں
زندگی کے ڈھونڈ لاؤ کچھ نشاں
عود اور کافور کے اب درمیاں
جھوٹ کے بازار میں دفتر مرا
ظلم کی گلیوں میں ہے میرا مکاں
آگ ایسی لگ چکی ہے ہر طرف
سانس میری بن گئی اس کا دھواں
ان اندھیروں میں جلادیں اک دیا
حوصلہ اتنا بھی اب ہم میں کہاں؟

میں تو اپنے حجاب ہی میں ہوں
اک مسلسل عذاب ہی میں ہوں
لے کے دنیا اسے کہاں رکھوں!!!
جب کہ میں اک حباب ہی میں ہوں
ان کا اندازِ گفتگو توبہ
جیسے روزِ حساب ہی میں ہوں
کس کا احسان مجھ پہ ہوتا ہے
میں تو اپنے شباب ہی میں ہوں
جو مظفر مرے جناب میں ہے
میں تو اس کی جناب ہی میں ہوں

سراج زیبائی

سراج زیبائی 1955ء میں وانمباڑی (شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اردو شاعری کی نمازیں حضرت دانش فرازی کی امامت میں ادا کیں۔ حضرت دانش فرازی صاحب کی سرپرستی نے آپ کو اٹھارہ اور انیس سال کی عمر میں صاحب دیوان شاعر بنا دیا۔

مجھے جلائے گی کیا سازشوں کی چنگاری
میں غم کی آگ کا دریا ہی جب کھنگال گیا
اُفق نے بڑھ کے اُجالوں کی بھیک مانگی تھی
میں دل کے داغ خلاؤں میں جب اُچھال گیا

محمد جسیم الدین خالد

محمد جسیم الدین خالد بہ مقام رائے پور، سمستی پور (بہار) میں 15ر مئی 1967ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں مدراس آئے اور ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ان کی ذہنی اور علمی تربیت میں تمل ناڈو کے علمی و ادبی ماحول نے بہت اہم رول ادا کیا ہے حالانکہ یہ بہار کے رہنے والے ہیں لیکن ان کی ذہنی نشو و نما تمل ناڈو کے نامور شعراء اور ادباء کے درمیان ہوئی ہے۔ تمل ناڈو کے جن نامور شعراء اور ادباء کے درمیان انہوں اپنی علمی اور فکری سانسوں کی توانائی کی لو تیز کی ہے ان میں روایت پرست شعراء کے علاوہ جدیدیت کے علمبردار بھی موجود ہیں۔

ان کا ایک شعری مجموعہ "نہادِ نو" عنقریب منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ یہ شعری مجموعہ ان کی بہترین شعری صلاحیتوں کا آئینہ ہی نہیں بلکہ نوجوانی میں ابھرنے والے ست رنگ جذبوں کا عکس بھی ہے۔

○

سلگتی دھوپ میں غم کی مجھے ہی جلنا لکھا تھا — تری تقدیر میں تو بس مہکتی رات آئی ہے
بظاہر راستہ بھر چاند تارے میرے رہبر تھے — حقیقت میں تو میرے ساتھ وہ اک ذات آئی ہے

○

پس نوشت

محمد عبدالرحیم گوہرؔ ویلوری

گوہرؔ کے آبا و اجداد کا تعلق وشارم سے تھا آپ کی ولادت وشارم میں ہوی۔ پیدائش کے بعد وہ ویلور آئے اور مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کی۔ اپنے ہی رشتہ داروں میں شادی کر لی۔ آپ نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم جیّد علماء سے حاصل کی۔ علمِ طب میں بھی کمال پیدا کیا اردو شاعری میں اپنے دَور کے مشہور و معروف شاعر سید ابراہیم کیفؔی ویلوری سے اکتسابِ فن کیا۔ آپ کے کلام میں سیدھے سادے مضامین اور پُر لطف واقعات کی دیدہ زیب تصویریں نمایاں ہیں۔ اکثر اشعار میں دکنی زبان کا عکس سایہ فگن ہے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "غزلیاتِ گوہرؔ" مطبوعہ ۱۳۰۲ھ م 1884ء: مطبع احمدی سے شائع ہوا ہے۔
اس مجموعہ میں انتالیس ۳۹ غزلیں ایک حمد اور ایک مثلث شامل ہیں۔

وعدہ خلاف وصل کا اس بُت نے جب
فُرقت میں اک پہاڑ تھی سر پہ تمام رات

لکھتا ہے سینکڑوں رنگین غزل اے گوہرؔ
تجھ میں جو ہر یہ کہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

وہ بھولے ہیں یہ مجھ کو یاد کرتا ہے شکایت سے
میں بہتر جانتا ہوں دوستوں سے اپنے دشمن کو

آگ لگ جائے گی دامان فلک کو گوہرؔ
شعلۂ آہ کو واللہ نہ تم بھڑکاؤ

نقدِ دل کو کھو کے گوہرؔ اس کا غم کرنا عبث
روز و شب اچھی نہیں یہ آہ و زاری آپ کی

آپ نے 1893ء میں وفات پائی۔

مولوی محمد اعظم گھٹالہ ہوشؔ

آپ بمقام آرکاٹ ۱۲۶۷ھ م 1857ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ بزرگوار مولوی شاہ محمد عزیز الدین گھٹالہ قادری دبیرؔ مشہور و معروف شعراء میں سے تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے اور اعلیٰ تعلیم اپنے دَور کے جیّد علماء سے حاصل کی۔ حصولِ تعلیم کے بعد آپ کا تقرر بحیثیت ڈپٹی کلکٹر اور چند سال بعد میجسٹریٹ آرکاٹ صوبۂ مدراس ہوا۔

آپ کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کا شعری مجموعہ "گلزارِ ہمیشہ بہار" ۱۳۰۱ھ م 1887ء میں عالمِ ظہور میں آیا ہے۔ آپ کے اس مجموعہ پر داغؔ دہلوی نے تاریخ یوں نکالی ہے: ؎

جنابِ ہوشؔ کے دیوان میں وہ مضمون ہیں رنگین — سخنور دیکھ کر جس کو سخن کا باغ کہتے ہیں
کہا ہاتف نے تاریخ میں دو نام ایک مصرع میں — گلِ مقصودِ اعظم + نظمِ ہوشؔ اے داغؔ کہتے ہیں

۱۳۰۱ھ

آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا امیرؔ مینائی نے بھی اعتراف کیا ہے: ؎

مستی میں یہ تاریخ کہی میں نے آج — شیشہ ہے یہ دیوان مئے ہوشؔ رُبا کا

۱ ھ ۱۳

اس دیوان میں ہوشؔ نے بائیس ۲۲ بحور پر غزلیں کہی ہیں اور ہر غزل کی پیشانی پر اوزانِ بحر درج ہیں۔ آپ کا کلام نہایت فصیح، با محاورہ اور لطافتوں سے معمور ہے ہر شعر صفائی، سادگی کے ساتھ ساتھ حُسنِ الفاظ اور حُسنِ معنی کا آئینہ دار ہے۔ ؎

مہِ نو تیرے ابرو سے کرے دعویٰ تو جھوٹا ہے — مثالِ مہِ نخشب دیکھنے کو ماہِ ثانی ہے
سراپا بحرِ عصیاں میں اگرچہ غرق ہوں دن رات — عطا کی جو کرم میں مانگا خدا کی مہربانی ہے
بجز اقبال کے انکار کرتا ہے نہیں کوئی — کلامِ ہوشؔ میں واللہ کیا معجز بیانی ہے

جب رُخِ عالم مرا مدِ نظر ہونے لگا — نُور اسی کا ہر جبیں سے جلوہ گر ہونے لگا
میرے رونے پر ہنسا بتلا کے جب وہ اپنے ذات — آنکھ سے آنسو جو ٹپکا وہ گہر ہونے لگا
اُس کے سینے پر ہوئے ہیں اب کہیں کچھ کچھ نمود — ہوشؔ نخلِ آرزو اب بار آور ہونے لگا

مولوی ابوالبرکات رفیع الدّین عرفیؔ

(المتوفی ۱۹۵۱ء)

آپ ایک قدیم خانوادۂ علماء میں سے تھے۔ جس کا ایک ایک فرد اپنے دَور کا جیّد عالم اور توحید و سنّت کی اشاعت میں ہمہ تن کوشاں رہا ہے۔ اس خاندان کے بزرگ بیجاپور سے نکل کر میسور کے مختلف شہروں اور قصبوں سے ہوتے ہوئے ویلور، بلیخ پور اور پرنام بٹ میں اقامت گزیں ہوئے۔

عرفیؔ اپنے وقت کے مشہور غزل گو شاعر رہے ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کے شعر گوئی میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اردو غزل میں آتشؔ لکھنوی کا سا آہنگ اور زورِ بیان پایا تھا۔ گویا زندگی ہی میں" آتشِ جنوب" کا لقب پایا تھا۔ ؎

انوارگاہِ اہلِ بصیرت ہوا چراغ　　ظلمت زدہ کو راہ ہدایت بنا چراغ
پروانے تھے فدا رُخِ روشن پہ جان کے　　شب بھر انہی کے غم میں یہ جلتا رہا چراغ
ظلمت سے منہ کو منہ نظر آتا نہیں ہے اب　　عرفیؔ خدا کے واسطے کچھ تو جلا چراغ

خطیب عبدالرحمان خطیبؔ

آپ کا تعلق ایک قدیم علمی و دینی خاندان سے تھا۔ آپ کے خاندان کے جیّد علماء نے وانم باڑی (شمالی آرکاٹ) میں قضاوت اور خطابت کے فرائض انجام دیے تھے۔ خطیبؔ بھی منصبِ امامت پر فائز تھے۔ آپ کا رجحان بھی زیادہ تر نعت گوئی کی طرف تھا۔ آپ نے کئی ایک شعری مجموعوں پر قطعاتِ تاریخ نکالی ہیں۔ موصوف کے ان تاریخی قطعات سے آپ کے تبحرِ علمی اور فنّی موشگافیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ گوئی گو مشکل، دماغ سوزی کا عمل ہے۔ لیکن خطیبؔ اس فن کے ماہر اور استاد لگتے ہیں۔ آپ نے مثنوی" گلزارِ شاکرؔ" پر جو قطعۂ تاریخ لکھا ہے وہ حسبِ ذیل ہے: ؎

مثنوی لکھی ہے شاکرؔ نے عجیب　　اس میں ہے سب ذکرِ عشق پُر فتوح
یہ ندا آئی دمِ فکرِ خطیبؔ　　سال لکھ دے" مثنوی قوتِ روح"

۱۳۲۶ھ

"یادگارِ باشاہ" پر بھی طویل تاریخی نظم لکھی جس کے دو شعر یوں ہیں: ؎

کیا مسجع کیا مقفّیٰ ہے عبارت نثر کی　　نظمِ موزوں فارسی اردو کے ہر اِس کے سوا
ہاتفِ غیبی نے سال طبع اس کا اے خطیبؔ　　"یادگارِ بادشاہ" نیک سیرت ہے کہا

۱۳۱۴ھ

پس نوشت

حکیم صفدر حسین شہباز

1871ء میں گڑیاتم (ضلع شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے آپ نے ابتدائی عربی فارسی اور اردو کی تعلیم گڑیاتم میں اور اعلیٰ تعلیم ویلور کے مختلف جیّد اساتذہ سے حاصل کی۔ علمِ طب میں بھی گڑیاتم کے حاذق اطباء سے کمال پیدا کیا۔ طبیعت موسیقی کی طرف مائل ہوی تو جلد اس فن میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ اردو شاعری میں آپ کی سوچوں کی پرواز بہت بلند تھی۔ مشکل سے مشکل زمینوں میں اچھے شعر نکالتے تھے۔ ؎

چشم دل ہے، مردمک دل، دل بھی دل ہے جان بھی — شخص و عکس و آئینہ دل، یار دل، اغیار دل
دل چمن ہے گلستاں دل، دل شجر ہے، دل صبا — بلبلِ شیدا، گل خوش رنگ و بو ہے، خار دل
دل ہے بندہ، دل محمدؐ، دل خدا، قبلہ ہے دل — مسجد و محراب و منبر، گنبد و مینار دل
دل اگر کامل نہ ہوتا، کون یہ کہتا ہے کہ ہاں — مرحبا شہباز ہے تو واقفِ اسرار دل

عبدالرحیم مسرور

الحاج گنڈو حکیم عبدالرحیم مسرور فرزندِ محمد ابراھیم بمقام وانم باڑی 1880ء میں پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ مفید عام میں اور اعلیٰ تعلیم مدرسۂ باقیات صالحات' ویلور سے حاصل کی۔ علمِ طب میں میسور کے مشہور طبیب محمد غوث احمد خان سے استفادہ کیا اور بہت جلد اس فن میں کمال پیدا کرلیا۔ حکیم محمد غوث افسر کو طبابت کے علاوہ اردو شاعری سے بھی خاصہ لگاؤ تھا اور وہ اس فن میں بھی ماہر تھے چوں کہ مسرور کا گھریلو ماحول دینی اور مذہبی تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنی شعری ذوق کی بنیاد نعت گوئی پر رکھی اور حکیم محمد غوث افسر کے آگے باقاعدہ زانوئے ادب تہہ کیا۔ ؎

- بہر سجدہ ہوا محراب حرم ابروے یار — کب تلاوت میں مری مصحفِ رخسار نہیں
- ہے تصوّر میں مصحفِ رُخِ یار — حفظ قرآں سے پیار رکھتا ہوں
- مدینہ کاش کہ میرا مقام ہو جائے — در رسولؐ پہ میرا سلام ہو جائے
- یہی ہے آرزو میری، مرا یہی ارماں — مرا بھی شہؐ کے غلاموں میں نام ہو جائے

مولانا مفتی حبیب اللہ ندوی باقوی

آپ فرزند علاّمہ محمد غلام محی الدین (متوفی 1904ء) بمقام ویلور ۱۳۰۴ھ م 1886ء میں پیدا ہوے۔ آپ نے باقیات صالحات ویلور میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ گئے اور لکھنؤ سے واپس آکر مدرسۂ عربیہ اسلامیہ کرنول میں تدریسی خدمات

پس نوشت

پر معمور ہوے۔ نہ جانے کن حالات کے تحت کرنول چھوڑ کر دوبارہ شمالی آرکاٹ آے اور مدرسۂ منظہر العلوم آمبور میں مدرس مقرّر ہوے۔

آپ ایک فصیح و بلیغ مقرّر ہونے کے باوجود اردو کے بہترین شاعر بھی تھے۔ آپ کی تصانیف میں "گلزارِ ندوی" حصّہ اوّل و دوّم منظر عام پر آچکے تھے۔ اس مجموعے میں آپ کی نمائندہ اخلاقی نظمیں شامل ہیں۔ آپ کو تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ ؎

آئینہ خودی کون آکے صفا سما گیا — عالم بے خودی میں اک شانِ خدا دکھا گیا
دیکھا نہ تھا جو عالم کرشمہ سازِ حُسن کو — عشق سمٹ کے اس کو لا دل میں مرے گیا
آئینۂ سکندری کچھ بھی نہیں ہے برتری — آبِ حیاتِ خضر اک رحمت رب سے پا گیا
کوششِ ناتمام ہے محرمِ راز ہو گا کیا — ندوی رازِ بے نوا اٹھ کے کوئی بلا گیا

آپ نے ۱۳۹۱ھ م ۱۹۷۱ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے فرزند مولانا قدسی باقوی نے تاریخِ وفات نکالی ہے۔ ع از سر ما برفت ظلِ پدر

۱۳۹۱ ھ

عبدالرحیم ماہر

آپ کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی۔ بہرکیف آپ کے آباء و اجداد کیرالا سے تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں وانم باڑی آئے اور یہیں بودوباش اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم، عربی و فارسی کی کتابیں جیّد عالم مولانا عبدالمجید خان سے پڑھیں۔ انگریزی تعلیم کے لیے مدراس کا بھی رُخ کیا۔ بیک وقت آپ کو کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ اردو شاعری میں مولانا شاکر وانم باڑی سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ نے نعت گوئی کو اپنی نجات کا باعث تصوّر کرتے ہوے بہترین نعتیں ادب کو دیں۔ ؎

- رات دن چاہتے ہیں ہم یہ خدا سے ماہر — وہ دن آئے کہ مدینہ ہو ٹھکانہ اپنا
- حشر میں جانتا ہوں میں یہی حالت ہوگی — میں اکیلا اور شہنشاہِ زمانہ ہوں گے

عبدالرحیم ظاہر

آپ وانم باڑی کے مشہور و معروف شعراء سے ہیں۔ وانم باڑی کے بعض معتبر احباب کا بیان ہے کہ آپ مشاعروں کے شاعر تھے۔ مدراس سے نکل کر آپ کی شہرتیں شمالی ہند کی حدوں کو چھو چکی تھیں۔ آپ بڑے زود گو شاعر تھے۔ ایک ہی نشست میں مولانا شاکر وانم باڑی کی طرح کئی غزلیں کا انبار لگا دیتے تھے۔ پیار و محبت کی باتیں بڑی سلیقہ مندی سے پیش

گُر سے واقف تھے ۔ ؎

- داستانِ عشق کی سُن کر مری ہنس کر وہ بولے — بڑھ گیا قیس کے قصّے سے فسانہ ترا
- ہر وقت تری صورت اے یار سامنے ہے — دل میں نہاں ہے جلوہ دیدار سامنے ہے

سید ظہور اللہ شاہ نادرؔ قادری

آپ 1898ء میں ترپاتور (ضلع شمالی آرکاٹ) میں پیدا ہوئے، آج سے سو سال پہلے ترپاتور بھی علم و ادب کی آماجگاہ تھا۔ سقوطِ بیجاپور کے بعد علماء و ادباء کا ایک بڑا کاروان سکون و عافیت کی تلاش میں ترپاتور کی طرف آیا اور یہیں مستقل طور پر اقامت گزیں ہو گیا ۔ نادرؔ کی تعلیم و تربیت انھیں علماء کی زیرِ عاطفت ہوئی۔ آپ کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر دست گاہ حاصل تھی۔ آپ کے تین شعری مجموعے "تجلّیاتِ نادرؔ"، "گلزارِ نادرؔ" اور "آفتابِ عشق" المعروف بہ "نظارۂ حقائق" شائع ہو چکے ہیں۔ ان تینوں مجموعوں میں حمد، نعت، منقبت اور قصائد اور عشقیہ غزلیں جگہ پاتی ہیں۔ آپ کا کلام آپ کے دور کا روایاتی احساس و جذبہ کے مدار میں چکر لگاتا ہے۔ شاعری میں کہیں بھی تصنع اور بناوٹ کی پرچھائیاں نہیں ہیں۔ ہر بات سلیقہ مندی کے ساتھ متانت سنجیدگی، والہانہ عقیدت و محبّت کے دائرے میں کہی گئی ہے۔ بالخصوص نعتوں میں آپ کے پاکیزہ جذبات بڑے معطّر اور منوّر دکھائی دیتے ہیں۔ ؎

ثنا خواں ہوں شہنشاہِ عربؐ، محبوبِ داور کا — مزا بے مثل ملتا ہے مجھے نعتِ پیمبرؐ کا

آپ نے حافظ مولانا مولوی سید عبدالقادر حسنی الحسینی جانشین قطب ویلور دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے بعد شاعری کی دنیا میں بے حد شہرتیں پائیں جس کا اظہار ایک مصرعہ میں یوں کیا ہے : ع

ہوا مشہور نادرؔ ہو کے خادم عبدِ قادر کا

نمونۂ اشعار :۔

ہے خدا کلام بسم اللہ — آیتوں کا امام بسم اللہ
حق سے قرآن جب اترتا تھا — پڑھتے خیر الانام بسم اللہ
اس میں سب فضلِ حق ہے برکت ہے — پڑھو سب صبح و شام بسم اللہ
بھیجتا ہے نبیؐ پہ اے نادر — شوق دل سے سلام بسم اللہ

- ہے ترا یار جدا، تیرا مددگار جدا — تیرا دل دار جدا، عشق کا آزار جدا

ہم نے دیکھا ہے بخدا وصل کے پیمانے نہیں / یا نبیؐ آپؐ کا ہے شربتِ دیدار جُدا
کیوں نہ ہو بحرِ گناہوں سے مرا بیڑا پار / کیا کہوں احمدِ مختارؐ کا ہے پیار جُدا
عالمِ حشر میں اللہ کہے گا نادرؔ / سارے نبیوں میں محمدؐ کی ہے گفتار جُدا

پیغمبرِ خدا پہ ہمارا سلام ہے / دنیا کے پیشوا پہ ہمارا سلام ہے
تحفہ یہ کیوں نہ جائے گا نزدِ حبیبؐ پاک / محبوبِ کبریا پہ ہمارا سلام ہے
نادرؔ بھی سر جھکا کے ادب سے ہے بھیجتا / اُس حق کے دلربا پہ ہمارا سلام ہے

محمد عبدالرحمٰن رفیقؔ وشارمی

آپ وشارم کے قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ کی غزلیں شمالی ہند کے متقدر رسائل میں جگہ پاتی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں ''پیامِ عاشق'' قنوج، ستمبر 1898ء کے شمارے کے ابتدائی صفحات پر آپ کی غزل اعزازی طور پر شائع ہوئی۔ اس غزل کی اشاعت سے صاف ظاہر ہے کہ رفیقؔ کی شہرتوں کے نغمے شمال کی فضاؤں میں گونج رہے تھے۔

آپ نے غزل کی روایات کو زندگی بخشی اور اس کے رنگ و آہنگ کی عظمت کو برقرار رکھنے میں بھی نمایاں رول ادا کیا ہے۔

آمد یہ کس پری کی ہوئی صید گاہ میں / آنکھیں جو عاشقوں نے بچھائی ہیں راہ میں
میری طرح انھیں بھی کسی کی ہے جستجو / بے وجہ گردشیں نہیں یہ مہر و ماہ میں
فرقت میں بھی ہے وصل کی دولت مجھے رفیقؔ / تصویر ان کی پھرتی ہے میری نگاہ میں

محمد تاج الدین تاجؔ

مولانا محمد تاج الدین تاجؔ ترچنا پلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ترچنا پلی میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے باقیات صالحات ویلور کی طرف رجوع ہوئے۔ مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کی سند حاصل کی اور ہائی اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ اردو شاعری میں علامہ ضیاءالدین احمد بلّی کنڈوی کے شاگرد ہوئے۔ آپ کا رنگِ کلام اور پیرایۂ اظہار میں سادگی، صفائی اور شستگی موجود ہے۔ طرزِ بیان قدیم ہونے کے باوجود کشش انگیز ہے۔

مری نوا سے اگر آشیاں کو آگ لگے / گلوں کو آگ لگے، گلستاں کو آگ لگے
اسی طرف سے تو ہوتا ہے بجلیوں کا گزر / نہ جانے کب شجرِ کہکشاں کو آگ لگے
زمیں کو اہلِ خرد لے چلے ہیں سورج تک / بلا سے ان کی جو سارے جہاں کو آگ لگے

بس نوشت

نہ چھیڑ تاجِ بہاروں میں اپنا دیپک راگ
جلے گا خود بھی اگر گلستاں کو آگ لگے

مولانا مولوی علی فطرت

آپ بمقام حیدرآباد ۱۳۴۲ھ م 1924ء میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد کے جیّد علماء سے دینی تعلیم حاصل کی۔ اردو شاعری کے نکات علامہ نجم آفندی سے سیکھے۔ شعری ذوق موصوف کو ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کے والد ماجد میر سرور علی حیدرآباد کے مشہور شعرا سے تھے۔ آپ 1972ء سے مستقل طور پر مدراس میں قیام پذیر تھے۔

آپ کے بیان کے مطابق آپ کا مدراس آنے کا مقصد دینی تعلیم کی خدمت تھا۔ حسینی ٹرسٹ اور انجمنِ حسینی مدراس کے دینی مدرسے میں محلّے کے بچّوں کو دینیات پڑھاتے تھے۔ آپ نے اپنی آخری سانسوں تک درسِ قرآن اور تفسیر قرآن کا سلسلہ اپنے محلّہ کی مسجد میں جاری رکھا۔ آپ کی تحریری اور تقریری کرشموں کا عکس آپ کی مطبوعہ کتابوں اور مذہبی جلسوں سے روشن اور معطّر ہے

ابھی حال ہی میں چھ ماہ پہلے غالباً مارچ 1997ء میں جاں بحق ہوئے۔ آپ کے بچھڑ جانے کا غم ایک عالم کو ہے۔

دینی موضوعات پر آپ کی نو کتابیں منصۂ ظہور پر آ چکی ہیں۔ جن کی فہرست راقم نے اپنی تالیف "ٹمل ناڈو کے صاحبِ تصنیف علماء" میں دی ہے۔

علامہ آمر کلیمی

علامہ الحاج سیّد محمد عمر آمر کلیمی شاہ حسنی الحسینی چشتی قادری کی ولادت ماہ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ مطابق اپریل 1927ء بمقام مدراس ہوی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم خود اپنے ابّا حضور کی سرپرستی میں ہوی مسلم ہائی اسکول مدراس سے ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی پاس کرنے بعد آپ نے مولوی عبدالقدوس نعمانی لکھنوی سے علم منقول و معقول میں درک حاصل کیا۔ حضرت الحاج سید نوری شاہ چشتی و قادری سے علوم ظاہری اور باطنی حاصل کرنے بعد بیعت سے مشرف ہوئے۔

پس نوشت

ہند اور بیرونِ ہند میں آپ کے مریدین کا خاصہ حلقہ موجود ہے۔ زندگی آپ نے اشاعتِ دین میں گزاردی ہے۔ آپ کی نیک نامی کے چرچے نہ صرف مدراس کے وسیع ترین دائرے ہی میں نہیں بلکہ کرناٹک اور آندھرا پردیش میں بھی ہیں آپکے عقیدت مندوں کی ایک بڑی کھیپ بڑے ادب و احترام سے آپ کی بزرگی کے آگے سر جھکاتی ہے۔

آپ کا ایک شعری مجموعہ "محوِ مسجود" 1994ء میں منصۂ ظہور میں آچکا ہے۔ یہ شعری خزانہ گویا آپ کی متبرک شخصیت کا غماز ہے۔ موصوف نے یہ مجموعہ تاج دار اولیاء شہنشاہِ بغداد پیرانِ پیر شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم دستگیر علیہ الرحمۃ کے نام معنون کیا ہے۔ گویا اس مجموعہ کے ہر ورق اور ہر تخلیق پر غوث الاعظم دستگیر سایہ فگن ہیں۔ یہ مبارک مجموعہ حمد و نعت اور عشق و معرفت کی نور آگیں خوشبوؤں سے معمور ہے۔ یہ مجموعہ اس لیے بھی بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ایک طویل نظم "نغمۂ سرمدی" موجود ہے جو اردو کے شعری ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہر منظرِ عالم میں نظر آئے محمدؐ — ہے مظہرِ حق صورت والائے محمدؐ
ہر ذرّہ عالم بنا آئینۂ احمدؐ — ہر سو مجھے ہر آن نظر آئے محمدؐ
کلمے میں محمدؐ ہیں نمازوں میں محمدؐ — اسرارِ محمدؐ کبھی افشا ئے محمدؐ
ظاہر میں محمدؐ ہے تو باطن میں خدا ہے — رل جائے خدا جس کو بھی مل جائے محمدؐ
بولا کہ اب آمر کو ذرا چین نہیں ہے — بس ایک نظر آپؐ کی ہو جائے محمدؐ

محمدؐ فاروق فرحت

محمد فاروق فرحت 4 رجولائی 1931ء کو بمقام وانم باڑی پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول وانم باڑی سے ایس ایس ایل سی پاس کیا اور پھر اپنے آبائی پیشے تجارت کو اپنایا۔ موصوف کے والد عبدالمجید صاحب بھی شاعر تھے گویا انھیں شاعری کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ 1970ء سے 1973ء کے درمیان حضرت دانش فرازی مرحوم کا قیام وانم باڑی میں تھا۔ ان دنوں راقم الحروف استادِ محترم سے استفادہ کرنے کی غرض سے اکثر وہاں حاضری دیتا تھا۔ تو حضرت دانش فرازی کی شعری نشستوں میں فاروق فرحت سے ملنے اور گفت و شنید کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ مجھے فاروق فرحت کی شریف طبیعت، پروقار متانت، سنجیدگی اور شاعرانہ خدا داد صلاحیتوں کو دیکھ کر مدراس کے فرحت کیفی (مصنفِ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" ترائیوں کا مجموعہ) یاد آجاتے تھے۔ واقعی یہ دونوں شاعر ایک دوسرے سے بہت دور دور رہتے ہوئے

پس نوشت

باوجود طبعی اور اخلاقی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کی وفات 1979ء میں واقع ہوئی۔

فاروق فرحت آج کے انسان کی بڑی بہترین تصویریں اپنی شاعری میں پیش کی ہیں۔ ؎

ہے گرم قتل و خون کا بازار ہر طرف　　ہر شخص اپنی اپنی جگہ پارسا لگے

خود اپنے وطن سے بھی فاروق کو شکایت ہے : ؎

میں کس زبان سے اپنا وطن کہوں اسکو　　مرے حقوق اے فرحت جہاں بحال نہیں

پروفیسر سید وحید اشرف

آپ 4 ر فروری 1933ء بمقام کچھوچھہ شریف (اتر پردیش) پیدا ہوئے۔ آپ نے 1962ء میں ایم اے؛ اور 1965ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سندیں حاصل کیں غالباً 1967ء میں آپ مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ عربی، فارسی اور اردو میں آپ کا تقرر فارسی کے لیے ہوا تھا۔ لیکن آپ نے اردو کی خدمت کو بھی اپنا فریضۂ اول تصوّر کیا۔ مندرجۂ ذیل کتابیں منصۂ ظہور پر آچکی ہیں۔

(۱) حیات سید اشرف جہانگیر سمنانی۔ مطبوعہ 1975ء

(۲) مقدمۂ لطائف اشرفی ۔ مطبوعہ 1975ء

(۳) دیوانِ فدا۔ مطبوعہ 1979ء (۴) افسر مودودی۔ مطبوعہ 1983ء

(۵) رباعی (اول) مطبوعہ 1987ء (۶) تصوّف (حصّہ اول) مطبوعہ 1988ء

(۷) رباعی (حصّہ دوم) مطبوعہ 1990ء

راقم کی خدمت میں موصوف نے دو رباعی کے مجموعے بصد خلوص عنایت فرمائے بقیہ کتابیں دیکھنے کی صرف حسرت ہی آج تک رہ گئی ہے۔

صنفِ رباعی پر ڈاکٹر سلام سندیلوی کی کتاب پڑھی۔ معلومات افروز تھی۔ سلام سندیلوی سے بہت پہلے عروضِ سیفی کا اردو ترجمہ حضرت منیر لکھنوی نے یوں پیش کیا ہے۔

"جیسا کہ معلوم ہے اور خواجہ امام حسن قطان نے کہ آئمۂ خراسان سے ہے ان چوبیس اوزان کے (رباعی کے اوزان) منضبط ہونے کے لیے دو شجرے ایجاد کئے ہیں کہ ایک کو 'شجرۂ اخرب' اور دوسرے کو 'شجرۂ اخرم' کہتے ہیں شجرۂ اخرب تو وہ ہے کہ اس کا پہلا رکن مفعولُ ہو اور شجرۂ اخرم وہ کہ جس کا پہلا

رکن مفعولن ہو ۔چناں چہ شجرۂ اخرب بارہ طریقے سے نکلتا ہے اور شجرۂ اخرم بھی بارہ صورتوں سے حاصل ہوتا ہے ۔"

اس طرح کے مختلف بیانات صنفِ رباعی سے متعلق جن اربابِ علم وفن نے دیے اُن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مولوی عبدالماجد دریابادی، مولوی عظمت اللہ خان، تلوک چند محروم، عزیز سیانی، جوش ملیح آبادی، سید حامد حسن قادری، مولوی عبدالحق، عندلیب شادانی ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر سیدہ جعفر اور بالخصوص حمزہ ناوک پوری کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ اور ان تمام حضرات کے بیانات کی روشنی میں صنفِ رباعی کا جائزہ لینا نہایت ضروری سہی لیکن یہاں فی الحال گنجائش نہیں ہے ۔

ڈاکٹر اقبال نے تلوک چند محروم کی رباعیات کے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ

"رباعی کو ترانہ کہتے ہیں اور اس کو بالعموم گانے کے لیے تصنیف کیا جاتا ہے اردو رباعی نے ابھی وہ مقام حاصل نہیں کیا جو فارسی کو حاصل ہے ۔"

ڈاکٹر اقبال کے اس بیان کی تردید یقیناً امجد حیدرآبادی کی رباعیات کے مطالعہ کے بعد ہو جاتی ہے ۔

ڈاکٹر طلحہ برق نے صحیح کہا ہے کہ :

"غزل آبروئے شاعری ہو تو ہو عصمتِ شاعری رباعی ہے ۔"

صنفِ رباعی میں اتنی وسعت ہے کہ وہ غزل کی طرح ہر قسم کے موضوعات اپنے اندر سمیٹ سکتی ہے ۔ چھوٹی چھوٹی بات صاف اور سادہ زبان میں موثر انداز میں پیش کی جا سکتی ہے، اس کے لیے شاعر کو زبان وبیان اور صنفِ رباعی کے بحور پر فن کارانہ دسترس رکھنا ضروری ہے ۔

اگر شاعر کا مزاج رباعی کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو تو شاعر کا رباعی کہنا تضیعِ اوقات کے مترادف ہے ۔

وحید اشرف کی رباعیات کے مطالعہ کے بعد اتنی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ رباعی کا مزاج موصوف کے مزاج میں ڈھل گیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر و بیشتر رباعیات نہ صرف ذہن ودل کو گرماتی ہیں بلکہ اس صنف کی وسعت اور کشادگی کے بیّن ثبوت بھی فراہم کرتی ہیں ۔

وحید اشرف نے اپنی رباعیات میں مناجات، نعت، منقبت، مذہب، اخلاقیات

پس نوشت

سائنس، حیات و کائنات، شراب وحسن وعشق کے موضوعات پر بھرپور روشنی ڈال کر اپنے وسیع معلومات، وقیع مشاہدے کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ ؎

- ہر عیب سے ہے پاک خدایا تری ذات — ہر شئے ہے فنا تیری ثنا ہیں دن رات
  ہیں لغزش وعصیاں وخطا میرے کام — فضل وکرم وعفو وعطا تیری صفات
- دنیا سے نہ پایا غمِ دنیا کے سوا — ہاتھ آیا نہ کچھ حسرتِ عقبیٰ کے سوا
  مجھ سے نہ کرا اعمال طلب ربِّ وحید — کچھ پاس نہیں ہے دلِ شیدا کے سوا
- انسان کے تن میں ہے جیالا بچھو — سب بچھوؤں سے ہے وہ نرالا بچھو
  سب جسم پہ ہیں نیش زن اور وہ دل پر — ڈنک اس کی زباں من کا ہے کالا بچھو
- فن والوں پہ ظاہر ہے رباعی کا فن — یہ صنفِ سخن ہے کہ معانی کا چمن
  لیکن ہے دواوین میں ضمیمے کی طرح — حالاں کہ حقیقت میں ہے یہ مغزِ سخن
- ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو — دنیا کو مگر سرائے فانی سمجھو
  آثار ہر اک فعل کے لازم ہیں وحید — سمجھو اب قدرِ زندگانی سمجھو

سنجر مدراسی

آپ مدراس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدراس کے مشہور اسکول جیٹیس گارڈن اسکول میں ہوئی۔ مولانا راجی صدیقی کے بیان کے مطابق 1920ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ ممتاز مدراسی اثر مجددی کے خاص ساتھیوں میں تھے۔ پتہ نہیں کن حالات کے تحت بمبئی گئے اور ہمیشہ کے لیے وہیں رہ گئے سنا ہے کہ کچھ دنوں بمبئی کی فلم انڈسٹری سے بھی وابستہ رہے۔ غزل پڑھنے کا انداز بڑا نرالا تھا حضرت جگر مرادآبادی کی طرح بڑی شان وشوکت کے ساتھ بڑے دل نواز ترنم میں غزل کے تار چھیڑ کر محفل میں ایک کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔

آپ اپنے کلام میں عام فہم تشبیہوں کو نہایت دل کش انداز میں پیش کرنے کے رموز سے واقف تھے۔ حزن و یاس کے مضامین بھی ان کی شاعری میں کثرت سے موجود ہیں۔ ؎

- غزل: محبت کی جبیں دنیا میں دکھا انقلاب آیا — کسی کی جلوہ گاہ ناز سے دل کامیاب آیا
  جھلک کر رہ گئے ان نرگسیں آنکھوں میں موتی سے — ہماری داستانِ غم میں اک ایسا بھی باب آیا
  گماں اُن کی تبسم ریزیوں پر ہے یہ دنیا کو — فلک سے چودھویں کا چاند شاید ہم رکاب آیا

مزا عرضِ تمنا کام اپنا کر گئی سنجر
نگاہیں جھک گئیں اس بت کے چہرے پر حجاب آیا

پس نوشت

عبدالرحمٰن صبا

آپ فرزندِ عبدالقادر ماہر بمقام ویلور 5 دسمبر 1935ء میں پیدا ہوئے۔ پتہ نہیں کن حالات کے تحت وانم باڑی آئے۔ لیکن 1968ء سے اسلامیہ کالج وانم باڑی میں انگریزی زبان کی تدریسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ کو ذوقِ شاعری ورثہ میں ملا ہے۔ آپ نے اپنے ابتدائی دور میں تاج الدین تاج ترچناپلوی اور علامہ فدوی باقوی سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ان دونوں حضرات سے اپنی غزلوں پر اصلاحیں بھی لی ہیں۔

آپ کی شاعری زندگی کے مختلف گوشوں کی عکاس ہے۔ آپ کی فکر و نظر کی اڑانیں بھی یقیناً بلند تر ہیں۔

اُن کی نظر کو میری نظر چوم کر گئی — حدِ نظر ہے میری سرعرش سے پرے

یوں تو ہر شہر میں اہلِ کمال اور اہلِ بصیرت کا فقدان ہوتا ہے۔ اس شکوہ اگر صبا کرتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں:

جو جان لے مجھ کو وہ نظر ڈھونڈ رہا ہوں — کہنے کو ہزاروں ہیں یہاں اہلِ بصیرت

واقعی صبا کی تلاش و جستجو میں جو وسعتیں ہیں اُس کی قدر دانی سرمایہ دار شہروں میں ناپید ہے۔

صبا نے صنفِ غزل کے ساتھ ساتھ صنفِ نظم میں بھی حیات و زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو مکروہ ہیں اور انسانی معاشرہ میں لعنت کے قابل ہیں۔

مظہر اقبال

نام خطیب محمد اقبال تھا۔ 1939ء میں بمقام وانم باڑی پیدا ہوئے۔ وانم باڑی اسلامیہ کالج سے بی کام؛ پاس کیا اور والد بزرگوار کے ساتھ تجارت میں لگ گئے۔ راقم کو آپ کا کلام 1964ء میں ہفت روزہ "قلم دلیش" اور ہفت روزہ "اتحاد" مدراس میں دیکھنے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ اشعار ہلکے پھلکے سہی لیکن ان میں متانت اور سنجیدگی کا وافر عنصر کارفرما تھا

دشت و صحرا میں ڈھونڈ آیا ہوں — تیرے در کا پتہ نہیں ملتا
جلوے ہر جا خدا کے ملتے ہیں؛ — کس جگہ پر خدا نہیں ملتا
مانگنے کا بھی اک سلیقہ ہے — درِ مولیٰ سے کیا نہیں ملتا

سنا ہے کہ آپ کوئی ایک جاں گسل مرض میں مبتلا تھے اور اسی مرض کے ہاتھوں 1988ء داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

پس نوشت

سیّد شاہ پیر حسینی عارف

آپ کے آباء و اجداد بیجا پور کے مشہور و معروف مشائخین سے تھے۔ موصوف کی تاریخِ پیدائش اور تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ آپ مولانا شاکر وانم باڑی کے ہم عصر تھے شہر مدراس کے کتابچوں اور رسائل میں آپ کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی شاعری کلاسیکی اقدار کی آئینہ دار ہے۔ عشقِ مجازی اور عشق حقیقی کی جلوہ سامانیوں سے معطّر آپ کے اشعار عشق کی اونچی سرحدوں کو چھوتے ہیں۔ ؎

اب ہمارے عشق کا ساماں پکّا ہو گیا　　زلف و عارض کا بتوں کے دل کا سودا ہو گیا
دیدۂ بینش میں جب وہ جلوہ آرا ہو گیا　　ہر در و دیوار سے اک نور پیدا ہو گیا

عبداللہ باشاہ رازؔ

آپ ۱۹42ء میں وانم باڑی میں پیدا ہوئے حضرت دانشؔ فرازی کی محفلوں میں ہمیشہ شریک ہوتے تھے۔ انہی محفلوں میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور موصوف کی زبانی یہ جان کر خوشی ہوی کہ آپ مولوی نثارؔ نگری کے شاگرد خاص ہیں۔ آپ حضرت دانشؔ فرازی کی قائم کردہ "انجمن" فروغِ ادب" کے سرگرم کارکن تھے۔ حضرت موصوف کی صحبتوں میں ان کی شاعری کو ایک نئی کروٹ بدلنا تھا، لیکن بقولِ حضرت دانشؔ فرازی:

"ان کی شاعری میں تغزل اور ترنّم کا حسین امتزاج ملتا ہے۔" ؎

جینے کی تم جو رازؔ دعا مانگنے لگے　　اس دورِ کشمکش میں کیا مانگنے لگے
یہ سادگی ہماری بھی کتنی عجیب ہے　　اک بے وفا سے دادِ وفا مانگنے لگے

آپ ۱984ء میں وفات پائی۔

سیّد کمال باشاہ کمالؔ راہی سیلمی

آپ ۱943ء میں سیلم میں پیدا ہوے۔ نہ جانے کن حالات کے تحت مدراس آے اور یہیں سے ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی اور ٹیچرس ٹریننگ کورس میں کامیاب ہوے آپ کے آباء و اجداد کا سلسلۂ نسب بیجاپور کے سادات علماء و فضلاء سے تھا۔ اس لیے بچپن ہی سے آپ کے خون میں علمی و ادبی ذوق کی بے کراں لہریں موج زن تھیں۔ اردو شاعری کی دل آویز اور دل کش بہاروں کے جلوے بھی انہی یقیناً ورثہ میں ملے تھے۔ پتہ نہیں آپ کی شاعری کا ذخیرہ کس کے پاس موجود ہے۔ راقم نے آج سے بیس پچیس سال پہلے وانم باڑی کی خاص نشستوں میں شعر پڑھتے دیکھا ہے۔ آپ کے صرف دو شعر ذہن کے پردے پر آج بھی منقش ہیں۔ ؎

شوق سے دیجیے تو لے لوں گا — کثرتِ درد کی ضرورت ہے
دورِ فصلِ بہار ہو کہ خزاں — مسکرانا گلوں کی فطرت ہے

نعیمہ پرویز

آپ تبسّم رشید کی بیگم ہیں۔ تبسّم رشید وانم باڑی کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ حالاں کہ تبسّم نے علمی وادبی گھرانے میں جنم لیا تھا۔ خود ان کے والد اور نانا شعر گوئی کی طرف مائل تھے۔ لیکن آپ نے جتنی توجّہ تجارت کی طرف دی اتنی توجّہ اور وقت اردو شاعری کو نہیں دیا۔ ان کی بیگم نعیمہ پرویز ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئیں اور ان کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف اپنی وارداتِ قلبی کا اظہار کیا ہے بلکہ اپنے اردگرد مہکتے مسکراتے اور سسکتے ہوئے لمحوں اور رونما حالات کی ترجمانی بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔ ؎

- تمہاری بزم میں اس دن سے آنا چھوڑ دیا — تمہاری بات میں جس دن سے بے رُخی دیکھی
- کہہ دو تو اٹھ ہی جائیں گے محفل سے ہم ابھی — کب تک تمہاری نظروں میں کھٹکیں گے خار سے

ایک جگہ پرویز اپنی ذہنی چوٹ اور اذیت ناک درد کا اظہار یوں کیا ہے: ؎

کرم میرے صیاد کا مجھ پہ دیکھو — کہ پر نوچ ڈالے ہیں آزاد کر کے

اپنی شاعری کو انہوں نے اپنے دل کی دھڑکن بھی تصوّر کیا ہے : ؎

جیتے جی کیسے چھوڑ دوں ناصح — شاعری میرے دل کی دھڑکن ہے

نورآفاق

نورآفاق بمقام وانم باڑی ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ راقم نے آپ کو اکثر دیلور، وانم باڑی اور عمر آباد کے مشاعروں میں غزل سناتے دیکھا ہے۔ آپ کی غزلیں ہلکی پھلکی سہی لیکن ترنم میں کشش آفرینی ضرور تھی۔ سنا ہے کہ بیک وقت کئی استادوں سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا ابوالبیان حمّاد اور طرفہ قریشی بھی آپ کے اساتذہ سے ہیں۔ آپ کی شاعری روایاتی اقدار کی حامل ہے۔

آج کے جدید دور کے آدمی کی تصویر آپ نے یوں کھینچی ہے : ؎

آدمی آدمی کا قاتل ہے — موت آساں، حیات مشکل ہے

پھر آپ کو اپنے دوستوں سے بھی شکایت ہے : ؎

سامنے آتے ہیں چپ چاپ نکل جاتے ہیں — اب تو موسم کی طرح دوست بدل جاتے ہیں

نورؔ میں بلا کا حوصلہ اور گردِ دل شکن ہمتیں ہیں جن کے سہارے وہ زندگی بسر کرنا جانتے

پس نوشت

مشغلہ ہے مرا طوفاں سے کھیلا کرنا　　　　راس آئے تمہیں ساحل کی تمنا کرنا

زندگی اور کائنات کی بعض سچائیاں بھی آپ کے کلام میں موجود ہیں جن کے جائزے سے کے لیے فی الحال قلم اجازت نہیں دے رہا ہے۔

سید جمیل الدین جمیلؔ قادری

سید جمیل الدین جمیلؔ قادری حضرت راحیؔ صدیقی مرحوم کے خاص الخاص معتقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا راحیؔ کی صحبتوں میں جمیلؔ قادری کو شاعری کو جلا ملی ہے اور مولانا ہی کی وساطت سے آپ مدراس کے ادبی حلقوں میں جانے پہچانے جانے لگے۔ جس کا اعتراف آپ نے اپنے مجموعۂ کلام ”جوہر سیف“ مطبوعہ 1995ء میں کیا ہے اور آپ نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ آپ کا شعری ذوق ٹمل ناڈو کے اکابرینِ ادب کا مرہونِ منت ہے۔

آپ نے مختلف شعری ہیئتوں کو برتا ہے۔ آپ نے نعتیں بھی بہت زیادہ کہی ہیں۔ نعتوں میں آپ کی ذات و احساسات کی عطر بیزی کے ساتھ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اپنی والہانہ عقیدت و ارادت کی جلوہ سامانیاں نقش گیر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہِ امم صلے اللہ علیہ وسلم کی بے مثال سیرت کا روشن، منور اور گہرا نقش آپ کے دل و دماغ پر ثبت ہوگیا ہے۔ ؎[1]

فدا جس پہ ربّ العلا ہوگیا　　　　وہ حُسنِ یقیں مصطفٰے ہوگیا

تصور میں یوں نقشِ لا ہوگیا　　　　الٰہ ذات کا آئینہ ہوگیا

غمِ زندگی کی نہیں تیرگی　　　　درود اپنے گھر کا دیا ہوگیا

جمیلؔ اس ارادت کا فیضان ہے

دم ھاھو آشنا ہوگیا

---

[1] نعت شریف: طرحی مشاعروں کے انتخابِ کلام کا گلدستہ: زیرِ اہتمام: ٹمل ناڈو اردو لٹریری اسوسیئشن مدراس: ص: 14۔ مطبوعہ 1986ء

نواب بیگم امتہ الحی بشیر النساء حیا

آپ دخترِ خان بہادر مولانا مولوی نواب تجمل حسین خان ایمآن گوپاموی اور نواب سر غلام محمد علی خان پرنس آف آرکاٹ کی بیگم صاحبہ تھیں ۔ آپ مدراس میں پیدا ہوئیں ۔ ایسے خوش نصیبی کہتے ہیں کہ حیا کو بچپن سے علمی و ادبی ماحول ملا اور اسی خوش گوار ماحول میں ان کا جذبۂ شاعری پروان چڑھا ۔ انہوں نے حضرت ایمان کے سایۂ عاطفت میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم مکمل کی۔

• شعر و شاعری کا ذوق چوں کہ انھیں ورثہ میں ملا تھا اس لیے کلام بہت صاف ، سادہ اور اغلاط سے پاک ہے ۔ طبیعت کا رجحان اکثر نعت گوئی کی طرف مائل تھا ۔ نواب اثیمہ آرکاٹی اور عاجزہ ترچناپلوی کے بعد پاکیزہ شعری روایات کو آگے بڑھانے میں حیا کا نام بہت نمایاں ہے ۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ "خم خانۂ محامد" (مطبوعہ 1970ء) منظرِ عام پر آکر خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے

اس نعتیہ مجموعہ پر تقریظ لکھتے ہوئے مولانا مولوی پروفیسر سید عبدالوہاب بخاری رقم طراز ہیں :

"شاعری ان کی خاندانی میراث ہے خصوصًا ان کا یہ نعتیہ کلام حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عقیدت اور ان کے تبحرِ علمی کی بہت بڑی دلیل ہے ۔" سے

• نعت
کر رحم مجھ حزیں پر تو ہے رحیم یا رب — اے خالقِ توانا ، رزّاق ، حلیم ، یا رب
تو رب العالمیں ہے ، ذوالقوۃ المتیں ہے — ہے نیک و بد پہ تیرا لطفِ عمیم یا رب
یثرب کی سرزمیں پر لگوا دے میرا بستر — در پہ نبیؐ کے مجھ کو کر دے مقیم یا رب
بے آنکھ کے تو دیکھے ، بے کان کے تو سن لے — بے لفظ و بے زباں کے تو ہے کلیم یا رب
در سے ترے حیا کو دردِ دلی عطا ہو — وہاب نام تیرا ، تو ہے کریم یا رب

• نعت
مجھ کو رسولؐ پاک ہی کا دھیان ہے فقط — دل میں انھیں کی دید کا ارمان ہے فقط
لب پر ہو شکر ، دل میں رہے فکرِ مصطفےٰ — عشقِ محمدی کی یہ پہچان ہے فقط
حکمِ رسولؐ جو ہے ، وہ ہے حکمِ ذوالجلال — طاعت نبیؐ کی ، طاعتِ رحمان ہے فقط
اے شاہِ حسن آپ کی گفتار و دید کا — آنکھوں کو شوق ، کانوں کو ارمان ہے فقط

بے کس حیا کو لیجیے دامن میں یا نبیؐ
اعمالِ بد سے اپنے پشیمان ہے فقط

آپ کی وفات ۱۳۸۰ھ م 1961ء میں ہوئی۔

پس نوشت

محمد حسین جمیل (المتوفی ۱۹۹۶ء)

آپ ۱۴ / جون ۱۹۱۲ء میں بمقام قاضی محلّہ مدورای میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آبا و اجداد ملک کافور کی شاہی فوج کے ہم راہ آئے ہوئے علماءِ دین سے تھے۔ آپ کے ابّا حضور حضرت محمد ابراہیم ذابح فطرتاً صوفی مزاج آدمی تھے۔ مدورای میں آپ کے عقیدت مندوں کی کثیر تعداد تھی۔ محمد حسین جمیل نے ابتدائی تعلیم مقامی اسکول سے اور انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے۔ کی اعلیٰ تعلیم امریکن کالج مدورای سے حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء میں بی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد قلیل مدت کے لیے مدورای ہی کالج میں بحیثیت لکچرار اردو زبان وادب کی خدمات انجام دیں۔ پھر یہاں سے مستعفی ہو کر سکریٹیریٹ کی ملازمت اختیار کرلی۔

حضرت جمیل کا رجحان نثر ونظم دونوں کی طرف مائل رہا ہے۔ آپ نے ان دونوں اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی کرنیں بکھیری ہیں۔ نثر نگاری میں اردو ڈرامہ سے ان کا خاص لگاؤ تھا۔ آپ نے کئی ڈرامے لکھے اور ان میں کچھ ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے۔ موصوف کے دو مختصر ڈرامے ''غریب ماں'' اور ''پرچھائیاں'' ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آچکے ہیں اور ایک ڈرامہ کا مجموعہ ''اسیر شہزادی'' ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، مدراس کے زیرِ اہتمام اشاعت کے لیے تیار ہے۔ اردو شاعری میں آپ کا ایک مجموعہ ''نوائے جمیل'' ۱۹۹۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں موصوف کی غزلیں، نظمیں اور قطعات موجود ہیں۔ حضرت جمیل کی تمام تر شعری تخلیقات روایاتی اقدار کی آئینہ دار ہیں۔ جو کچھ آپ نے محسوس کیا اُسے من وعن شعری جامہ پہنا دیا۔ کہیں بھی تصنع اور غلو سے کام نہیں لیا ہے۔ ؎

• غزل

نگہِ یار ہے بہار پسند — کیوں نہ دل آئے داغ دار پسند
میری آشفتہ حالیوں کی نہ پوچھ — دل ہے پہلو میں انتشار پسند
دیکھتے ہی رہے جو راہ تری — ہو گئی چشمِ انتظار پسند
بے مروّت نظر میں وحشت ہے — ہم کو ہے چشمِ اشکبار پسند
پھر چمن سے نکل گیا ہے جمیل — ہے وہ دیوانہ خار زار پسند

• غزل

چشمِ تر، آہ نارسا اپنی — اک محبت ہے سو بلا اپنی
تیری جانب نظر جو اٹھتی ہے — بندگی ہے یہی، دعا اپنی
یوں تو میری بھی ہے زبان مگر — ہے خموشی ہی التجا اپنی
ہو چکا خون آرزو کا جمیل — رنگ کیا لائے پھر وفا اپنی

پس نوشت

برترؔ مدراسی (ایم اے، مناف)

آپ بمقام ویلور 1924ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ ماجد ایم۔اے رؤف اردو اور عربی زبان کے ماہرین سے تھے۔ شعر وشاعری سے بھی خاصہ لگاؤ تھا۔ حضرت برترؔ کو اردو شعروادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔

1930ء میں اپنے والدین کے ہم راہ مدراس آئے تھے اور یہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ آپ نے پروفیسر حیدر علی خان حیدؔر کے توسط سے منشی منظور صدیقی کی محفلوں میں نہ صرف شرکت کی بلکہ حضرت منظور صدیقی کی شاگردی بھی اختیار کی۔ آپ بالکل خاموش اور خدا پرست آدمی ہیں۔ زندگی میں کسی کی برائی چاہی ہے اور نہ برائی کی ہے آپ کی جامع الکمال صفات شخصیت کا بھرپور عکس آپ کی شاعری میں موجود ہے۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے "آبِ گوہر" 1991ء اور "آبِ زم زم" 1993ء منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

نمونۂ کلام

● قطعہ

بشر کیا، ملک کیا، شجر کیا، حجر کیا — خدا بھی ہے مدحت سرائے محمدؐ
اگر وہ نہ چاہیں تو بخشش نہ ہوگی — رضائے خدا ہے رضائے محمدؐ

● غزل

کٹنے کو عمر کٹ گئی پوچھو نہ کیا ملا — اپنی خبر نہ مجھ کو نہ اپنا پتا ملا!
شعلہ ہو یا حباب ہو یا گلِ چمن — کوئی نہ اس جہاں میں ہمیں دیرپا ملا
اچھا سمجھ رہا ہوں ہر اک آدمی کو میں — حالاں کہ جو ملا وہ بُرے سے بُرا ملا
جس کو وفا کا پاس ہو جس میں خلوص ہو — ایسا نہ کوئی آدمی اس دَور کا ملا

دنیا میں اپنی اپنی پڑی ہے ہر ایک کو
برترؔ نہ کوئی بندۂ بے مدّعا ملا

شریف رومانی

آپ 1932ء مدراس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کارپوریشن اسکول پیپاک میں ہوئی۔ بعد میں مدرسۂ اعظم مدراس میں ایس ایس۔ ایل سی کے زینوں پر قدم رکھا تھا کہ کچھ ایسے نامساعد حالات پیدا ہوئے جس کے پیشِ نظر تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ آپ جس دَور میں مدرسۂ اعظم میں تعلیم پا رہے تھے وہ دَور واقعی اردو زبان وادب کا شاندار اور مبارک دَور تھا۔ اس وقت حضرت عبدالعلی، حضرت حمزہ حسین، حضرت رؤف خان، حضرت عبدالصمد، حضرت عبدالغفور ویلوری حضرت جنیدی، حضرت محی الدین احمد، حضرت محمد محی الدین اور حضرت شیخ محی الدین رفعت کے علاوہ

حضرت عبدالغفور رازؔ ترچناپلوی بحیثیتِ شاعر بے حد مقبول اور ممتاز تھے۔ حضرت رازؔ سے شریفؔ رومانی نے اردو شاعری کے نہ صرف رموز سیکھے بلکہ آپ کو شاعری کے مزاج سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کا موقع بھی نصیب ہوا۔ آپ نے اردو شاعری کے تمام تر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے کلام میں ست رنگ جذبات کی چھوٹ اور سسکتے ہوئے احساس کی دھیمی آنچ ہے۔ آپ کے ہاں فکری آب وتاب تو نہیں ہے مگر جذبہ و اظہار میں گنگا جمنی کیفیت ضرور ہے۔ آپ نے کئی ایک ڈرامے بھی لکھے ہیں جن میں "بھوک"، "بے وفا" کئی بار اسٹیج ہو چکے ہیں۔

؎ جس روز سے وجود کا احساس مر گیا — حیوانیت کی حد سے بھی انساں گزر گیا
کرنے چلا تھا سارے جہاں کو جو زیرِ دام — افسوس وہ بھی لوٹ کے مایوس گھر گیا
بغض وحسد کی آگ میں جلتا تھا جو سدا — ہم نے سنا ہے موت سے پہلے وہ مر گیا
آخر شریفؔ گردشِ دوراں کی آگ میں — اتنا تپا کہ بن کے وہ کندن نکھر گیا

● قطعہ وہ جو دیتے ہیں آبرو لے کر! — بھیک ایسوں کی کب گوارا ہے
دینے والے جہاں سے لیتے ہیں — میں نے دامن وہیں پسارا ہے

خطیب رفعت اللہ رفعتؔ

آپ بمقام آمبور (ضلع شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے۔ بی۔ ایس سی؛ میں امتیازی درجہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنے آبائی پیشہ تجارت کی طرف مائل ہو گئے۔ اردو زبان وادب سے بچپن ہی سے خاصہ لگاؤ رہا ہے۔ اردو غزل سے آپ کا عشق برسوں کمرے کی چار دیواری تک محدود رہا۔ ابھی حال ہی میں آپ نے اپنی غزل کی دلہن کو رسائل اور مشاعروں کی دنیا تک لے آنے کی جرأت کی ہے۔ ماہ نامہ "پیش رفت"، "خاتونِ مشرق" دہلی میں چند غزلیں شائع ہو چکی ہیں۔

آپ کو مولانا مولوی ابوالبیان حمادؔ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ موصوف کی سرپرستی میں آپ کی غزل کا عشق یقیناً رنگ لایا ہے۔ آپ کے سوچوں کے زاویے پرانے اور صالح روایات کے پابند ہیں۔ انسانی زندگی کے نشیب وفراز میں پیش آنے والے واقعات اور حادثات کی عکاسی آپ نے سیدھے سادے انداز میں کی ہے۔ ؎

مجھے ذکرِ یار لے کر ابھی جائے گا کہاں تک — کہ پہنچ گیا ہوں آخر سرِ منزلِ زباں تک
مجھے دے دل وہ اپنا مری جاں مانتے ہیں — پھر اسی کے ساتھ قدغن کہ نہ کھولیے زباں تک
وہ جو گھٹ کے رہ گیا ہے مرے دل میں دردِ رفعتؔ — مری آرزو ہے پہنچے کبھی میرے مہرباں تک

ظہیر آفاق ولادت 1939ء

برسوں پہلے آپ پریم ظہیر ناز کے نام سے مدراس کے ادبی ماحول میں بے حد مشہور تھے۔ آپ نے جس میدان میں بھی قدم رکھا وہاں ہنگامہ برپا کیا۔ اور اپنا ایک الگ مقام پیدا کیا۔ اردو ڈراموں کی دنیا میں کافی مقبولیت پیدا کی۔ افسانے بھی لکھے اور سنا ہے کہ شعروشاعری کے دربار میں شمولیت کی تو نظمیں زیادہ پیمانے پر تخلیق کیں۔ لیکن راقم کو آج تک موصوف کی کوئی تخلیق دیکھنے یا پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ شاید راقم کی بدقسمتی ہے۔

محمد سعد الدین فرحت صمدانی

فرزندِ حضرت مولانا جبرت القادری۔ فرحت صمدانی بمقام مدراس 1944ء میں پیدا ہوئے گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس سے بی۔اے، اردو کرنے کے بعد اکاؤنٹنسی کے امتحانات پاس کیے۔ حضرت قبلہ محبوب پاشا اور خود اپنے والدِ ماجد کے زیرِ سایہ اُن کا علمی و ادبی ذوق پروان چڑھا۔ انہوں نظم و نثر دونوں اصناف میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے مضامین سالنامہ 'ضیا' اور مقامی رسائل میں جگہ پا چکے ہیں۔ اندازِ کلام نہایت سادہ، فارسی کی مشکل تراکیب، بعید از فہم تشبیہات اور استعارات سے پاک ہے: ؎

زندگی ہوتی ہے دشوار یہ معلوم نہ تھا — موت بھی اب نہیں غم خوار یہ معلوم نہ تھا

ہم نے تیرے لیے جینے کی تمنا کی تھی — اب تو مرنا بھی ہے دشوار یہ معلوم نہ تھا

تیرِ نشتر کی طرح دل میں اتر جائیں گے — فرحتِ خستہ کے اشعار یہ معلوم نہ تھا

اشفاق الرحمٰن مظہر ولادت 1949ء

نوجوان شعراء کی کھیپ میں نووارد ہیں۔ کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے برسوں سے اس دشت میں آوارہ گردی کی ہے۔ 'صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں' کے مصداق آپ مدتوں سے شاعری کی چلمن سے چوری چوری دوسروں کا بغور نظارہ کرتے رہے ہیں۔ آپ نے کبھی کھل کر میدان میں کودنے کی جرأت نہیں کی۔ جناب ملک العزیز کی صحبتوں کا کرشمہ سمجھیے کہ آج کل کبھی کبھار آپ مشاعرہ گاہوں میں نظر آجاتے ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ اشاعت کے لیے تیار ہے۔ اس پر شاید حضرت کاوش بدری مقدمہ لکھنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

آپ اردو شاعری کی کلاسیکی قدروں کا جہاں احترام کرتے ہیں وہیں جدید حسی تقاضوں کو بھی پسند کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری کا انداز پرانا سہی لیکن دل کش اور دل فریب ہے۔

پس نوشت

ڈاکٹر سیّد سجّاد حسین

سجّاد فرزند مولوی سید حمزہ حسین بمقام مدراس 1956ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ ماجد عربی اور فارسی اور اردو زبان کے ماہر تھے۔ کئی ایک اہم ترین تاریخی دستاویز کے مؤلف بھی ہیں۔ موصوف کے زیرِ نگرانی سجاد حسین کی تعلیم و تربیت یقیناً بڑی شان دار ہوئی۔ انھیں کا فیضان ہے کہ آج وہ مدراس یونیورسٹی میں بحیثیت اردو ریڈر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سجّاد کی اڑانیں درس و تدریس تک محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے نثر و نظم کی دونوں عبادت گاہوں میں جذبہ و فکر کی نمازیں ادا کی ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ "آثار و افکار" (مطبوعہ 1993ء) منصۂ شہود پر آ کر اکابرینِ ادب سے داد حاصل کر چکا ہے۔ انھوں نے راقم کی بتیس سال پہلے لکھی ہوئی رومانی نظموں کو بھی ایک تفصیلی مقدمہ کے ساتھ ترتیب دے کر (1993ء میں) شائع کیا ہے۔ ان کا ایک اردو ترجمہ "ملیالم ادب کی تاریخ" ساہتیہ اکاڈمی دہلی سے 1995ء میں شائع ہوا ہے۔

انھوں نے اردو شاعری کے ایوان میں چہل قدمی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا لہجہ نہ جدید ہے نہ قدیم۔ لیکن اظہار میں ایک کشش آفرینی ضرور ہے۔ ؎

اے شوقِ جبیں لے چل کعبہ ہو بت خانہ ۔۔۔ یہ بھی درِ جانا نہ وہ بھی درِ جانانہ
باقی نہ رہے کوئی اندازِ حجابانہ ۔۔۔ نظروں میں سما جا یوں اے جلوۂ جانانہ
منزل بھی نگاہوں کو وہ دیکھ نظر آئی ۔۔۔ دو چار قدم آگے بڑھ ہمّتِ مردانہ
شکوہ نہ ہو جلنے کا اے سوختۂ الفت ۔۔۔ چپ چاپ ہی جل جانا تو صورتِ پروانہ
دیوانے جو دنیا کے ہیں اُنکو مبارک ہو ۔۔۔ مطلب مجھے کیا ان سے ہوں آپ کا دیوانہ

سیّد سجّاد بخاری ولادت 1951ء

آپ مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم گورنمنٹ مدرسۂ اعظم اور مدراس یونیورسٹی میں ہوئی۔ اردو میں ایم۔اے؛ ایم فل؛ اور ٹمل زبان و ادب میں ایم۔اے؛ میں امتیازی درجہ حاصل کیا۔ آج کل جتنی بھی ہندی سیریل ٹمل زبان میں ترجمہ ہو رہے ہیں، ان کے بے نام و نشان مترجم آپ ہی ہیں۔ ویسے بھی ہر اچھا فن کار ہر دور میں بے موت مارا گیا ہے۔ وقت بھی کتنا بے رحم ہے کہ اچھے تخلیق کاروں کا خون سستے داموں خرید کر اپنا نام لکھ لیتا ہے۔ انھیں بدقسمت فن کاروں میں سجّاد بخاری بھی ایک ہے۔ سجّاد نہ صرف ٹمل زبان و ادب کا اچھا فن کار ہے بلکہ ان میں اردو زبان و ادب کو بھی نت نئے تخلیقی جواہر پارے دینے کی بھرپور

صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن مدراس کے نا قدردان ماحول میں وہی لوگ زندہ اور تابندہ رہتے ہیں جو اردو کے تاجر ہیں۔

راقم نے سجاد کی صحبتوں میں دیکھا ہے کہ سجاد اگر شعر کہنے بیٹھ جاتے ہیں تو لمحوں میں ایک ہی بحر میں سینکڑوں اشعار کہہ ڈالتے ہیں۔ مجھ کو ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی سگریٹ کی نوک سے اشعار ٹپکتے ہیں۔ واقعی آپ کی قادرالکلامی کا کوئی جواب نہیں۔ ہلکے پھلکے سیدھے سادے شعر کہنے میں آپ کو بہت زیادہ لطف آتا ہے۔ شاعری میں کرتب بازی کے آپ مطلق قائل نہیں ہیں۔ عموماً اردو شاعری میں جذبے کی رٹ جو لوگ لگائے بیٹھے ہیں اُن لوگوں کی دلی تسکین ومسرت کے لیے سجّاد کی شاعری یقیناً ایک انمول خزانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کے ہاں فکر نہیں ہے بلکہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کی فکر برآسانی سمجھ میں آجانے والی فکر ہے۔ اس طرح کا فکری اثاثہ شاعر کو برسوں کی ریاضت کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سجّاد وہ خوش نصیب شاعر ہیں جن کو یہ لازوال دولت نصیب ہے۔

1993ء میں سجّاد نے آزاد غزل پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر مدراس یونیورسٹی سے ایم فل کی سند حاصل کی ہے۔

نمونۂ اشعار

ے

اور باتیں بہت ہیں کہنے کی
تم کو فرصت کہاں ہے رہنے کی

ضبطِ غم اس قدر نہیں اچھا
دو اجازت ندی کو بہنے کی

ان کی فطرت ہے قہر برسانا
ہم کو عادت عتاب سہنے کی

سوچیے بھی اور کیا ہے آدمی
آپ اپنا مرحلہ ہے آدمی

منتشر شیرازۂ انسانیت
بھیڑ میں تنہا کھڑا ہے آدمی

پار کرنا ہے تو کچھ مشکل نہیں!
آدمی کا فاصلہ ہے آدمی

ہر اُجالے کا اندھیرا ہے یہی
ہر اندھیرے کا دیا ہے آدمی

آدمی پر ختم ہے ہر راستہ
راستوں کا راستہ ہے آدمی

کیا بخاری کا کبھی ہوتا کوئی
کب یہاں کس کا ہوا ہے آدمی

نعیم المشرقی

آپ بمقام ویلور 1920ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق قومی، سیاسی تحریکوں سے گہرا تعلق رہا آپ خاکسار تحریک کے سرگرم کارکن رہے۔ سیاسی جلسوں میں آپ کی تقریروں کی تشعلگی عوام کے دلوں کو گرما دیتی تھی۔ کئی بار میونسپل انتخابات میں بھی حصّہ لیا اور ناکام رہے۔

1962ء میں ایک ہفت روزہ "سفیر ہند" کا اجرا کیا۔ چھ ماہ تک پابندی سے نکلتا رہا۔ اور اس کے بعد بند ہو گیا۔ آپ کو شعر و ادب سے بھی خاصہ لگاؤ تھا۔ منشی انصرالدین بیخود کی شاگردی اختیار کی۔

آپ نے 1981ء میں وفات پائی۔

شعر

جانے کیا کوئی حسینوں کے ہیں زیور کتنے
برق لب پر تو نگاہوں میں ہیں خنجر کتنے

ہم فقط محوِ تماشا ہی رہے شام و سحر
ہر نظر ان کی بدلتی رہی منظر کتنے

رشکِ صد ماہ نہ ہوں گے یہ نظارے کیونکر
داغ دل کے ہیں نعیم آج منوّر کتنے

قادر ظہیر

آپ برادر بزرگ مدراسی بمقام مدراس 1926ء میں پیدا ہوئے۔ مدراس یونیورسٹی سے بی اے (انجنیئرنگ) کی سند حاصل کی۔ آپ کے آباء و اجداد دینی اور علمی خزائین کے مالک تھے آپ کو علمی دولت ورثہ میں ملی تھی۔ حیرت اس بات کی ہے کہ آج تک آپ کے علمی جوہر کسی پر افشا نہیں ہوئے ہیں حالانکہ آپ کی زنبیل میں دو تین شعری دیوان کا اثاثہ موجود ہے۔ لیکن آپ آج تک اس کی اشاعت کی طرف مائل نہیں ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں، کیوں؟

آپ کی تنقیدی نظر بڑی تیز اور گہری ہے۔ آپ کا کلام نہایت صاف اور عام فہم ہے آپ کی غزلیات کا سرمایہ غیر مانوس اور ثقیل عربی فارسی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ دور از کار تشبیہوں اور استعارات سے مبرّا ہے۔

شعر

پارسائی چھوڑ دی، جنّت کی حسرت چھوڑ دی
دے شرابِ ناب ساقی ہم نے توبہ توڑ دی

ایک چلّو ہی سہی لیکن نگاہوں سے پلا
تیری آنکھوں کی قسم رندوں نے مینا پھوڑ دی

تُند طوفانِ حوادث کشتیٔ دل غوطہ زن
اک نظر تیری پڑی سیلاب نے رو موڑ دی

حلقۂ زنجیر ٹوٹا، چھوٹ سکتے تھے ظہیر
دل نے یہ مانا نہ مانا ہر کڑی پھر جوڑ دی!

عبداللطیف نازی

آپ بمقام مدراس 1930ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم مدرسۂ محمدی مدراس کے جید عالم و فاضل مولانا مولوی ابوبکر نظمی سے حاصل کی۔ بچپن ہی سے آپ نظم و نثر دونوں اصناف کی طرف مائل رہے۔ اپنی اردو غزل کی مشاطگی کے لیے سرشار کسمنڈوی کی شاگردی اختیار کی۔

آپ کا کلام عیوب سے پاک ہے۔ اردو کی روایاتِ قدیمہ سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ آپ کے کلام میں مشکل الفاظ، پیچیدہ ترکیبیں اور تشبیہیں بالکل نہیں ہیں ہر بات صاف صاف نہایت دلکش انداز میں کہہ دینے کے عادی ہیں۔ بھرپور علمی استعداد ہونے کے باوجود آپ نے خود کو ہمیشہ چار دیواری میں قید رکھا۔ ؎

چمن میں یہ کیسی خوشی کھیلتی ہے ۔۔۔ بہار آئی ہے ہر کلی کھیلتی ہے
فضائیں سہانی سہانی ہیں آؤ ۔۔۔ کہ گلشن میں اب چاندنی کھیلتی ہے
شبِ ہجر اس دل کی دنیا میں نازی ۔۔۔ بڑے شوق سے بے کسی کھیلتی ہے

عبدالوہاب نازش

وہاب نازش بمقام مدراس 1949ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں مدرسۂ اعظم مدراس سے یس.یس.یل.سی اور میسور یونیورسٹی سے یم۔ اے، امتیازی درجہ میں کامیابی حاصل کی اور ان کا شعری ذوق مدراس کے "حلقۂ اربابِ علم و فن" (جن میں حضرت کاوش بدری، حضرت راز امتیاز، حضرت انور ربانی، جناب علیم صبا نویدی، جناب صلاح الدین برق کے نام قابلِ ذکر ہیں۔) کے درمیان بڑی تیزی سے پروان چڑھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ادبی حلقوں میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ گیا۔ شاید زندگی کی بے پناہ مصروفیات نے انھیں بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کچھ سالوں سے ادبی سرگرمیوں سے دور رہ رہے ہیں۔ ان کی سوچوں کا جھکاؤ زیادہ تر آزاد نظم کی طرف ہے۔ غزل گوئی میں بھی انھوں نے اپنے تجربوں کا رس نچوڑا ہے: ؎

ہر اک تجربہ یوں انوکھا لگے ہے ۔۔۔ سمندر کا پانی بھی میٹھا لگے ہے
چمکتا ہے گرہوں پہ مہتاب جب بھی ۔۔۔ پری وش کوئی مسکراتا لگے ہے
فیض گستر ہے کتنا مرا تذکرہ ۔۔۔ شبِ تار بھی اک سویرا لگے ہے

سنائی تھی نازش نے روداد اپنی
کہ ہر شخص کی کوئی بپتا لگے ہے

محمد امان اللہ امانؔ

آپ بمقام مدراس 1949ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میونسپل ہائی اسکول اور بی اے مدراس کے مشہور و معروف پریسیڈنسی کالج سے پاس کیا۔ انگریزی زبان وادب میں ایم اے کی سند بھی حاصل کی۔ آپ میں بہت اچھا تنقیدی شعور موجود ہے۔ راقم کو آپ کی چند غزلیں سننے کے بعد اتنا یقین ضرور ہوا کہ امانؔ غزل گوئی کے میدان کے بہت پرانے کھلاڑی ہیں۔ لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعرانہ شخصیت کو ہمیشہ صیغۂ راز میں رکھا۔ ؎

میرے افسردہ دل کے داغ عریاں کرکے چھوڑوں گا
زمین و آسماں کو آج نالاں کرکے چھوڑوں گا

غزل گوئی میرا پیشہ نہیں لیکن امانؔ پھر بھی
خس و خاشاکِ گلشن کو غزلخواں کرکے چھوڑوں گا

ملک العزیز

ملک العزیز فرزند مولانا کاتب محمد یوسف مرحوم بمقام وانم باڑی 1951ء میں پیدا ہوئے۔ نامہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اردو غزل کسی کی نظر التفات کی محتاج نہیں ہے۔ لیکن موصوف نے تفریحی لذتوں کی خاطر کبھی کبھار ایوانِ غزل میں داخل ہونے کی جرأت کی ہے اور دھیمے سروں میں کچھ گنگنا کر غزل پر کرم فرمایا ہے اور نت نئے رجحانات کے پھول بکھیرے ہیں : ؎

سب معانی خاک بن کر بے کراں اڑ جائیں گے
کھوکھلے الفاظ کا اک سلسلہ رہ جائے گا

اعجاز حسین

ڈاکٹر اعجاز حسین فرزند حضرت کمالؔ مدراسی، مدراس 19ء میں پیدا ہوئے۔ مدراس یونیورسٹی سے یم بی بی یس کی سند حاصل کی۔ حضرت کمالؔ کی محبتوں، شفقتوں اور شعرا کی صحبتوں میں ان کا شعری جذبہ پروان چڑھا ابھی نوجوان ہیں بہت ساری امیدیں ان سے وابستہ ہیں۔ وہ دن دُور نہیں کہ ان کی مشقِ سخن ضرور رنگ لائے گی اور انھیں حضرت کمالؔ مدراسی سے بھی دو قدم آگے لے جائیگی۔

سید اسماعیل شاہدؔ

اسماعیل شاہدؔ فرزند سید نبی مرحوم بمقام مدراس 1963ء میں پیدا ہوئے۔ مدرسۂ اعظم مدراس سے پلس ٹو پاس کیا ہے 1985ء کے آس پاس ٹمل ناڈو کی شعری دنیا میں چند نوجوانوں کی کھیپ اُبھری جس میں شاہدؔ مدراسی کا نام اس لیے بھی نمایاں ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کا دامن بڑی سنجیدگی اور متانت سے تھاما ہے اور انہوں نے اپنی شعر گوئی میں صالح روایات اور جدید رجحانات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے ذوق کی پرورش و پرداخت کی ہے : ؎

ایک پتھر ہوں تراشو تو نکھر جاؤں گا
تم جو چھو لو تو یقیناً میں سنور جاؤں گا

موج در موج تری سانسوں کی خوشبو بن کر
میں ترے دل کے سمندر میں اتر جاؤں گا

آپ ٹمل ناڈو کے مشہور و معروف صحافی ہے۔

سید سلطان محی الدین بہمنی (ولادت ، وفات 1966ء)

روزنامہ "ہمدرد" اور ماہ نامہ "امام" میں صحافتی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ موصوف کے اکثر و بیشتر مضامین لاہور کے رسائل کی زینت بنتے رہے۔ مذہبیات پر آپ کی تحریریں بڑی معلومات افروز ہوتی تھیں۔ آپ علم و فضل اور کمالاتِ شاعری میں بہت اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے۔ معاصر شعراء سے آپ کے تعلقات نہایت شگفتہ تھے۔ مزاج میں بلا کی خودداری تھی۔ کسی کی خوشامد کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اپنے معاصرین سے علمی و ادبی نوک جھونک اور تیر و نشتر کے تحت حالاتِ حاضرہ پر لکھے ہوئے آپ کے تبصرے "جانے دیجیے ہم کو کیا.....!" کے عنوان کے تحت آپ کی خاص پہچان بن چکے ہیں۔ اگر آپ کی علمی بصیرت، صحافتی استعداد اور تنقیدی اُپج کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو ایک اہم تاریخی دستاویز سامنے آسکتی ہے

وکیل محمود شریف (ولادت 1928ء)

آپ نے سیلم جیسی سنگلاخ زمین میں اردو کی نشوونما اور اس نشوونما کے لیے جو ماحول اہم ہے اُسے سازگار کرنے کا جو اہم رول ادا کیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا کفرانِ نعمت کے مترادف ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مدراس میں ہوئی اور مدراس یونیورسٹی ہی سے ایم اے؛ اور ایم ایل؛ کے امتحانات میں امتیازی درجہ حاصل کیا۔ اردو زبان و ادب سے آپ کا والہانہ عشق کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے سیلم کے ماحول میں اردو کے عظیم الشان جلسوں اور مشاعروں کا انعقاد کیا۔ موصوف سے راقم کی حالیہ ملاقات میں یہ راز افشا ہوا کہ موصوف نے بڑی لگن اور خاص انہماک سے مولانا محمد یوسف کوکن کی تالیف "عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک" کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ راقم کی نظر سے یہ مسودہ گزر چکا ہے۔ اس کی اشاعت کا معاملہ درپیش ہے۔ یہ کتاب اگر چھپ گئی تو دنیا موصوف کی اردو دانی کی معترف ہو جائے گی۔

ڈاکٹر ص۔ نذیر محمد ([illegible])

شہر مدراس کے دینی لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ ایک عرصہ تک انجمن ترقی اردو (ہند) کے سرپرست رہے۔ مرکزی [illegible] کمیٹی کی سرپرستی کے علاوہ اسلامی بیت المال مدراس کے موسس اور سرپرست بھی ہیں۔ اردو زبان و ادب سے آپ کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ انگریزی زبان پر بھی آپ کو عبور رہا ہے۔ شعر و شاعری سے آپ کا لگاؤ کم سہی لیکن اپنے معاصرین شعراء کے قدردان ضرور رہیں۔ دینی آدمی ہونے کے ناطے آپ اپنے اطراف دین اور مذہب کی لکیر کھینچ کر بیٹھے رہنے کو عافیت گردانتے ہیں۔ اقبال نے جس سچے

مسلمان کی تصویریں اپنی تخلیقات میں پیش کی ہیں موصوف کو ایسے ہی مسلمانوں کی تلاش روز و شب رہتی ہے اور آپ دین کے توسط سے اقبال کا پیغام ہی برادرانِ اسلام تک پہنچانے میں ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔ آپ کی تقریریں علمی اعتبار سے بھی بڑی پُر مغز اور بصیرت افروز ہوتی ہیں۔ آپ کی خدمات دین و ادب کا احاطہ کرتی ہیں اور ان کا سلسلہ اور فیض جاری ہے۔

ریاض نلّوری (ولادت ء)

ریاض نلّوری کا آبائی وطن نلّور (آندھرا پردیش) ہے آپ بچپن ہی میں حصول تعلیم کی غرض سے مدراس آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں سکونت پذیر ہوگئے۔ آپ کو شہر مدراس کے جیّد علماء، حاذق حکما اور نامور ادبا و شعراء کی نہ صرف صحبتیں ملیں بلکہ ان احباب کے بچّوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی موصوف کے سر رہی۔ راقم کو بھی آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ اردو شعر و ادب سے آپ کا لگاؤ رہی ہے۔ آپ نے شاعری سے زیادہ اردو نثر کی طرف توجّہ دی ہے۔ آپ کی نثری تحریروں کا اسلوب مہدی افادی کی یاد کو تازہ کردیتا ہے۔ آپ نے 1960ء سے 1965ء کے درمیان مدراس کے مشاہیر ادب پر جو خاکے لکھے وہ اردو ادب میں ایک نئے رُخ کا پیش خیمہ تھے۔ کاش یہ خاکے کتابی صورت میں منظرِ عام پر آجاتے۔

شریف برکاتی (ولادت 1930ء)

ٹمل ناڈو میں دینی مضامین لکھنے والوں کی کھیپ میں جہاں جیّد علماء کی ایک لمبی فہرست ہے، وہیں ڈاکٹر ص۔ نذیر محمد، غنی مدراسی اور شریف برکاتی کے مضامین بھی اِدھر اُدھر مدراس کے ادبی جرائد میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ راقم کی تلاش و جستجو کے دوران حضرت شریف برکاتی کے دینی مضامین "صداقت" وانمباڑی "آشیاں کے تنکے" وانم باڑی اور "جدید دلچسپ" مدراس میں نظر سے گزرے ہیں۔ موصوف کا ایک مضمون "اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ" (مطبوعہ ماہ نامہ صداقت' 1981ء) بڑا معلوماتی اور ان مٹ حقیقتوں کا مظہر ہے۔ ماہ نامہ "آشیاں کے تنکے" میں خندۂ گل کے تحت سے آپ کے مزاحیہ لطیفے پڑھنے کو مل جاتے ہیں لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ آج تک موصوف نے اپنے آپ کو ادیب کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ ٹمل ناڈو کے علمی و ادبی ماحول میں کاتب کی حیثیت سے آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

حاجی عبیداللہ (ولادت ۱۳۴۸ھ / 1929ء)

آپ اہلِ نائط سے ہیں۔ آپ کے خاندان کے افراد نے علم و ادب کی دنیا میں بڑے ان مٹ نشان اور روشن نقوش چھوڑے ہیں۔ آپ بڑے حلیم الطبع، خوش مزاج اور خاموش کام کرنے والوں میں سے ہیں۔ آپ کی تحریریں نہایت سادہ اور عام فہم ہوتی ہیں۔ خانوادۂ اہلِ نائط کے علماء و ادباء سے متعلق آپ کے مضامین جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے آپ کی تحقیقاتِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کتب خانہ مدرسۂ محمدی کی

قاضی صلاح الدین محمد الویلی (ولادت 1942ء)

آپ اہلِ نائطہ سے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب ٹمل ناڈو کے عظیم شاعر، ادیب اور اردو ادب کے اوّلین نقاد مولانا مولوی محمد باقر آگاہ ویلوری سے ملتا ہے۔ موصوف ٹمل ناڈو کے چیف قاضی اور عربی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں۔ فی الحال آپ مدرسۂ محمدی (قائم کردہ ۱۳۰۹ھ) کا وہ روشن چراغ ہیں جس کی روشنی سے اہلِ مدراس پُر نور ہیں۔ دینی، علمی دونوں میدانوں میں آپ کا فیض جاری ہے۔

سید فضل اللہ (ولادت 1933ء)

آپ ساداتِ کرام سے ہیں۔ اردو سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خوش فکر، خوش رفتار و خوش گفتار، مخلص و بامروت گویا سادات کی تمام صفات آپ کی ذات میں مجتمع ہیں۔ آج جب کہ ٹمل ناڈو میں اردو زبان و ادب کی فضا صرف ناساز گار ہی نہیں بلکہ مہلک اور مذموم ہوتی جارہی ہے۔ ان حالات میں بھی اردو کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ موصوف نے اپنے گردوں شکن حوصلوں کے ساتھ روزنامہ "مسلمان" کی اشاعت کو برابر جاری رکھا ہے۔ اردو صحافت اور ادب دونوں کی سرپرستی میں آپ کے کارہائے نمایاں ناقابلِ فراموش ہیں۔

سید شاہ عثمان پاشا قادری (ولادت 1956ء)

آپ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد سے بی کام اور مدراس سے ایم اے پاس کیا۔ آج کل شمالی آرکاٹ کے مشہور و ممتاز دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان، ویلور کے ناظم اور سرپرستِ اعلیٰ ہیں۔ انسان دوست، مہمان نواز، عالم و فاضل اور اردو زبان و ادب کے بہی خواہ ہیں۔ "اقطابِ ویلور کی اردو خدمات" پر آپ کا ایک کتابچہ مطبوعہ 1994ء اور "مولانا مولوی بشیر الحق قریشی فن اور شخصیت کا جائزہ" (مطبوعہ 1996ء) کتابی صورت میں ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز کی زیرِ اہتمام شائع ہو چکے ہیں۔

عبد الصمد (ولادت: ء)

آپ اہلِ نائطہ سے ہیں۔ مدراس میں پیدا ہوئے۔ بیس پچیس سال پہلے مدراس پریسیڈنسی کالج سے بی اے کیا۔ کالج کے دور میں آپ کا اوڑھنا بچھونا اردو تھا۔ اسی کالج سے ایک سالنامہ "ضیا" شائع ہوتا تھا جس کے ادارتی فرائض بھی آپ نے انجام دیے تھے۔ آج کل بھی اردو کے لیے بہت کچھ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں لیکن اردو داں طبقہ سے دور رہ کر یہ نہیں وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں۔

حیات افتخار (ولادت)

آپ سراپا متانت اور سنجیدگی کا پیکر ہیں۔ اردو میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا اور اپنی تخلیقات کو خاموشی سے کتابی صورت دے کر شمالی ہند کے مشہور و معروف اداروں سے شائع کرا دینا آپ کو خوب آتا ہے۔ آپ کی کتابیں "تاریخ ٹمل ادب" (ترجمہ) اور "کرشن چندر کے ناولوں میں ترقی پسندی" ساہتیہ اکاڈمی دلی اور نسیم بکڈپو لکھنؤ سے چھپ چکی ہیں۔ ماہنامہ "سہیل"

کی نگرانی پر مامور ہیں۔ کتب خانے سے استفادہ کرنے والوں کی آپ حتی المقدور مدد فرماتے ہیں۔ راقم کو بھی آپ کے توسط سے کتب خانے سے استفادہ کرنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ آپ کی تالیفات میں "مفتی قاضی حبیب اللہ" مطبوعہ ۱۹۹۱ء "حضرت سید شاہ برہان الدین حسینی" تاج پورہ آرکاٹ (مطبوعہ ۱۹۹ء) بہت مشہور ہیں۔

محمد علی حسین (ولادت 1930ء)

آپ صدر 'اردو کلب' مدراس ہیں۔ آپ ایک زمانہ مدراس کے انجمن ترقی اردو، اور ساؤتھ انڈیا اردو اکاڈمی مدراس کے سرگرم کارکن رہے۔ بہت سارے نوجوان فن کاروں کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی۔ اردو کے مسائل کو ہمیشہ عوام اور سرکار کے آگے رکھنے میں پیش پیش رہے۔ اردو شعراء اور ادباء کے ہمنوا اور دوست ہیں۔ اردو کے تعلق سے آپ کے مضامین مدراس کے جرائد اور رسالناموں میں چھپ چکے ہیں۔ فی الحال روزنامہ "مسلمان" سے منسلک ہیں۔ نامہ نگار کی حیثیت سے آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

محمد روح اللہ (ولادت:)

آپ دسویں جماعت (1958ء) میں راقم کے کلاس فیلو رہے ہیں ـــــ پھر اچانک ۱۱ نومبر ۱۹۷۵ء کی دوپہر حضرت راز امتیاز کی معیت میں شمس بلڈنگ (یہ عمارت مدراس کے مشہور جریدہ 'شمس الاخبار' کی یادگار ہے) میں موصوف سے ملاقات ہوئی اس زمانہ میں آپ سہ روزہ "رفیق ملت" مدراس کی ادارت میں شریک تھے اور نامہ نگار کی حیثیت سے بہت نام پیدا کیا۔ اپنی نظامت سے مقامی مشاعروں کو سنبھالنے کا گر جانتے ہیں۔ اس حیثیت سے کافی مقبول ہیں۔

لقاء رضوی (ولادت)

آپ راقم کے ہم نوالہ، ہم پیالہ یار ہیں۔ ؏ ؎
یادِ ماضی عذاب ہے یارب ۔ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا
کے مصداق واقعی کالج کا وہ دور بھی کتنا سہانا اور رنگین دور تھا اس دور میں ہم لوگ (حسن فیاض، فضل جاوید، عباس علی ضیاء، میر مومن علی، جواد علی اور دیانت علی) نے اردو ادب میں کافی ہنگامے بپا کئے تھے۔ 'بزم علم وادب' کے جلسے مشاعرے اور اس بزم کا مجلہ "گلِ نو" آج بھی ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ لقاء رضوی فطرتاً نظم کے شاعر ہیں۔ آپ کا کلام صوری اور معنوی حسن سے مزین ہے آپ کی نظموں کی آواز اور آہنگ میں جو ارتعاش ہے وہ ہمارے دلوں کی رفتار کو تیز بھی کر دیتا ہے اور دھیما بھی۔

شبیب احمد کاف (ولادت 1955ء) (وفات 1991ء)

آپ ٹمل ناڈو کی سرزمین سے ابھر کر ہند و پاک کے بہترین رسائل میں نمایاں طور پر جگہ پانے والے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے افسانوں کے کردار خود آپ کے اپنے ماحول اور روزمرہ زندگی کے مدار میں چکر لگاتے ہیں بعض وقت ایسا لگتا ہے کہ ان کا ہر افسانہ دینی اور مذہبی دائروں میں پرورش پاکر زندگی کے اس موڑ پر قدم رکھتا ہے جہاں سے لامتناہی آرزوؤں اور مسلسل ناکامیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اپنی بات کو سلیقہ سے پیش کرنا بھی ایک فن ہے اس فن میں شبیب احمد کاف بہت کامیاب ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ ۱۹۹۶ء میں چھپ گیا ہے۔

گیا۔ "کتاب نما" دہلی اور "پونم" حیدر آباد اور آشیاں کے تنکے" وانم باڑی میں بھی آپ کی تخلیقات جگہ پا چکی ہیں۔
آپ کی تحریروں میں منٹو کے ناول پر پیش کیا ہوا نفسیاتی تجزیہ یقیناً آپ کی فکری جہت اور ژرف بینی کا آئینہ دار ہے

احمد ندیم (ولادت 1956ء)

وانم باڑی میں پیدا ہوئے۔ مدراس یونیورسٹی سے ایم اے؛ اور ایم فل؛ پاس کرنے کے بعد جمال محمد کالج، ترچی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ پروفیسر حسرت سہروردی کے بعد ترچناپلی میں اردو کی چمک دمک اور مہک کو برقرار رکھنے میں بہت کوشاں نظر آتے ہیں۔ آپ کی کتاب "پریم چند کے ناولوں میں طبقاتی کشمکش" 1983ء میں منظر عام پر آچکی ہے۔ آپ سے اور بھی بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ اور یقین ہے کہ ترچناپلی کے ادبی علمی خزائن جو پوشیدہ ہیں انھیں نمایاں کرنے کی سعی کریں گے

رضاالحق آمری (ولادت 1960ء)

آپ کا شمار مدراس کے شعلہ بیان مقرروں میں ہوتا ہے۔ میلاد کے جلسوں اور ولادتِ غوثِ پاک کی محفلوں میں آپ کی علم پرور اور بصیرت افروز تقاریر کی خوشبو سے اکثر مساجد کے در و دیوار مہکتے رہتے ہیں۔ آپ نے اپنے ابا حضور علامہ الحاج سید شاہ محمد عمر آمر کلیمی چشتی القادری کی طرح نعت گوئی میں اپنی نورانی عقیدتوں اور پاکیزہ جذبوں کا نقش چھوڑا ہے۔ آپ کے والد ماجد نے جنوبی ہند میں سلسلۂ چشتیہ اور قادریہ کی روشنی پھیلانے کے لیے رشد و ہدایت اور درس و تدریس کا ایسا نادر نمونہ پیش کیا کہ جس سے ہزاروں لوگ آپ کی شمعِ معرفت کے پروانے (مرید) ہوگئے۔ رضاالحق کی ذہنی پرورش اور پرداخت موصوفِ محترم ہی کی زیرنگرانی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کی علمی قابلیت، زبان و بیان کی شیرینی و حلاوت کے ساتھ ساتھ مشفقانہ گفتگو کا سلیقہ، عالمانہ بردباری اور عارفانہ شان رضاالحق کے حصہ میں آگئی ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری واقعی قابلِ صد تحسین ہے۔ ؎

یادِ رسول تیرے تصدق کہ آج تک — کیا ذکر غیر مجھ کو نہ اپنا پتہ ملا
چار سُو ان کے جلوے تھے بکھرے ہوئے — ذرّہ ذرّہ مجھے آزماتا رہا
کرم اُن کا ہے روشناسِ خلائق — حقیقت محمدؐ کی واللہ اعلم

قاضی حبیب احمد (ولادت: 19ء)

آپ بمقام آمبور (ضلع شمالی آرکاٹ) پیدا ہوئے مظہر العلوم ہائی اسکول سے کامیابی کے بعد مدراس یونی ورسٹی سے ایم اے؛ اور ایم فل؛ پاس کیا۔ چند سال آپ روزنامہ 'مسلمان' سے وابستہ رہے آپ کے اداریے بڑے جاندار اور وقیع ہوتے تھے۔ آپ نے اپنے والد ماجد (جو شمالی آرکاٹ کے حکمائے حاذق میں سے تھے) کی سرپرستی میں فنِ طبابت میں کمال پیدا کیا۔ آپ کے مضامین روزنامہ 'مسلمان' اور اسلامیہ کالج کا سالنامہ "مشعل" وانم باڑی میں شائع ہوچکے ہیں۔ فی الحال آپ اسلامیہ کالج وانم باڑی میں اردو زبان و ادب کے لکچرار ہیں۔

تخلیق سے تشکیل تک

• نام	سید علیم الدین حسینی
• قلمی نام	علیم صبا نویدی
• تاریخ پیدائش	28 فروری 1942ء
• مقامِ پیدائش	امور (والاجاہ روڈ) شمالی آرکاٹ
• تعلیم	بی۔اے، (علیگ)
• والدیت	جناب سید غوث پاشا حسینی مرحوم
نسب	حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ
• والدہ ماجدہ	سیدہ شرف النساء عرف پیرانی ما
سلاسلِ طریق	چشتیہ، شطاریہ، قادریہ اور نقشبندیہ
• بیعتِ احقر	حضرت مولانا مولوی اسمٰعیل رفیعی خواجہ قدسی شاہ
• اکتسابِ فیض	مولانا راجی صدیقی مرحوم ، حضرت دانش فرازی مرحوم
• اصنافِ ادب	غزل، آزاد غزل، نثری غزل، پابند نظمیں، ٹیپ بند نظمیں نعتیہ سانیٹ، ہائیکو، حمد و نعت، افسانہ نگاری، انشائیے تحقیق و تنقید
• اعزازات، انعامات	اُتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، 1975، 1980، 1986، 1994ء
	بہار اردو اکیڈمی، بہار 1979ء
	مغربی بنگال اردو اکیڈمی، کلکتہ 1980ء
	غالب اکیڈمی، بنگلور 1992ء
	آل انڈیا میر اکیڈمی، لکھنؤ
	★ امتیازِ میر 1993ء
	★ نوائے میر 1997ء

حمد

تُو ہر ایک سمت ہے جلوہ گر، تری شان جلّ جلالہٗ ● تُو نفس نفس تُو نظر نظر، تری شان جلّ جلالہٗ
جو جہانِ غیب و شہود ہیں، ترے آگے سر بہ سجود ہیں
ترے ذکر میں ہے ہر اک شجر، تری شان جلّ جلالہٗ
تُو ہر ایک دل کا مجیب ہے، تو ہر اک نظر کا حبیب ہے
تجھے پھر بھی ڈھونڈے ہے ہر بشر، تری شان جلّ جلالہٗ
ترے ہاتھ موت و حیات ہے، ترے بس میں قید و نجات ہے
تجھے ذرّے ذرّے کی ہے خبر، تری شان جلّ جلالہٗ
تجھے بھول جاؤں میں کس طرح تجھے یاد رکھوں میں کس طرح
ہے لہو میں جب کہ ترا سفر، تری شان جلّ جلالہٗ
تری رحمتوں سے بھری ہوئی، تری برکتوں سے لدی ہوئی
مری منزلیں مری رہ گزر، تری شان جلّ جلالہٗ
ذرا دیکھ شہرِ سخن میں اب، تری لکھ کے حمد و ثنا عجب
یہ نویدیؔ فن کا ہے تاجور، تری شان جلّ جلالہٗ

نعتیں

اسرارِ دو جہاں کا مقدر رسولِ پاکؐ ● رعنائیِ حیات کا مظہر رسولِ پاکؐ
سانسوں کے ذکر کا ذرا جوہر بھی دیکھنا
باہر رسولِ پاکؐ ہیں اندر رسولِ پاکؐ
سجدہ کناں ہے اپنی ہر اک آرزو جہاں
اس معبدِ حیات کا منبر رسولِ پاکؐ
آیاتِ روشنی کے مبارک قدم کا فیض
ہم آپؐ کے ہیں آپؐ کا گھر گھر رسولِ پاکؐ
میں ہوں صباؔ سفیرِ سخن اور ہیں مری
سیرِ جہانِ نو کا سمندر رسولِ پاکؐ

سایہ افگن چار سو ہے روئے انوارِ نبیؐ ● ذرّہ ذرّہ سرفراز بوئے انوارِ نبیؐ
میری آنکھوں کی شعاعوں کا سفر ہے ناتمام
کون لے جائے گا مجھ کو سوئے انوارِ نبیؐ
خاک نورانی، زمین و آسماں عنبر فشاں
ہر کلی ہر پھول میں خوشبوئے انوارِ نبیؐ
دھڑکنوں میں دوڑتی پھرتی لہو کی بوند کو
ہر نفس ہے جستجوئے کوئے انوارِ نبیؐ
خامۂ فکرِ صباؔ پر شاہِ دیںؐ کا ہے کرم
اور دل میں موج زن ہے جوئے انوارِ نبیؐ

بہ فیضِ شاہِ مدینہؐ ہوا سفر روشن ● دِل و دماغ معطر ہوئے نظر روشن
حضورؐ آپ کے سایہ میں آ کے بھید کھلا
ہے محوِ سجدہ تمنا بھی سر بسر روشن
دِلوں کے آئینہ خانے میں کون اُترا ہے
کہ آرزو کے ہیں دیوار اور در روشن
طوافِ نورِ مدینہ کی بات کیا نکلی
قدم قدم سے ہوی خواہشِ سفر روشن
شہِ اُممؐ کی نوازش ہے، شاہِ دیںؐ کا کرم
صباؔ نویدی کی ہے عمرِ مختصر روشن

ساتوں عالم ہیں شہنشاہِ عربؐ کا صدقہ ● صاحبِ کون و مکاں، اُمّی لقب کا صدقہ
پاؤں پھیلائے ہوئے وحشی سیاہی تھی یہاں
نُور ہی نُور ہوا، نُوری نسب کا صدقہ

غزلیں

نہ روشنی نہ اندھیرا نہ دود ہونا تھا ● مجھے بھی تیری طرح لاوجود ہونا تھا
گھٹن کی دھوپ کشاکش کی آنچ میں بھی لئے — دیارِ ضبط میں محوِ سجود ہونا تھا
لبِ نگاہ کا کچھ ذائقہ بدلنے کو — سرِ فلک بھی کوئی کھیل کود ہونا تھا
بہ فیضِ فکر اسدؔ پھیلتا گیا ہے صبا — وگرنہ اس کو بھی نذرِ جمود ہونا تھا

رُتوں کی آگ میں عنبر فشاں ہوئے ہم لوگ ● گلوں کی چھاؤں میں جل کر جواں ہوئے ہم لوگ
تمہاری یاد کے شعلوں کی آبرو کے لیے — سُلگ کے بجھ گئے ایسے دھواں ہوئے ہم لوگ
لرزتی بوند کا جس دن سے ہم پہ راز کھلا — سمندروں کی طرح بیکراں ہوئے ہم لوگ
تمہارے چہرے کے پیچھے تھے اور بھی چہرے — تمام عمر کہاں راز داں ہوئے ہم لوگ
شعورِ غم نے سکھائے ہیں گفتگو کے رموز — شعورِ فکر سے معجز بیاں ہوئے ہم لوگ

سرحد سے کائنات کی نکلا ہوا تھا میں ● سورج کو اپنے ہاتھ سے تھاما ہوا تھا میں
تاریخ میری ذات سے آگے نہ بڑھ سکی — کچھ اس طرح سے صدیوں پہ بکھرا ہوا تھا میں
سوچوں کی چاند رات میں لفظوں کے درمیاں — اوراق کی ہتھیلی پہ پیدا ہوا تھا میں
چادر کسی نے دی نہیں مجھ کو خلوص کی — برسات میں دکھوں کی نہایا ہوا تھا میں

مرے مزاج کی تہہ میں اُتر گیا ہے کوئی ● میں مطمئن ہوں کہ مجھ کو بھی چاہتا ہے کوئی
ہمارے جسم کا سورج نہ اور کیوں ڈھلے — ہماری چھاؤں کو چھو کر گزر گیا ہے کوئی
شبِ فراق پہ خوابوں کے کیوں لگے پہرے — کہ بند آنکھوں کے رستے وہ آ رہا ہے کوئی
ہر ایک سمت سے اٹھتا ہے گرد کا طوفاں — کوئی بتائے کہ آئینہ کب بنا ہے کوئی
ہیں کتنے سادہ و معصوم اپنے شہر کے لوگ — جو پوچھتے ہیں کہ اس شہر میں صبا ہے کوئی

بعد مدت کے کھلا جوہرِ نایاب مرا ● جو اندھیرے میں تھا روشن ہوا وہ باب مرا
میں زمیں والوں کی آنکھوں میں بھرا ہوں لیکن — آسماں والوں نے دیکھا ہے کوئی خواب مرا
کتنے دریاؤں پہ تھا کالی گھٹا کا جلوس — اک ایک بوند کا پیاسا رہا تالاب مرا
مطمئن ہو گئے احباب مرے خوش ہے زمیں — اک نئی سمت جو بیڑا ہوا غرقاب مرا
عطر افشانئ قربت سے تھی معمور فضا — جذبۂ قطرۂ خوں کب ہوا سیراب مرا

میٹھی زباں سے کڑوی دعا دے رہے ہیں لوگ ● بن موسموں کے پھل کا مزا دے رہے ہیں لوگ
مجرم کا جرم کیا ہے سمجھ ہی نہ آسکا! — لیکن لہولہان سزا دے رہے ہیں لوگ

۱۰

مضطرب زیست کا ہر خواب ادھورا نکلا ● بستر شعلہ پہ سیماب ادھورا نکلا
جائزہ لینے کو نکلے ہیں جرائم خود ہی — دور تک خون کا تالاب ادھورا نکلا
سرخیاں جس کی شہادت کے لیے روشن تھیں — مستند جو تھا وہی باب ادھورا نکلا
بیچ دریاؤں میں خاموش بھنور روتے ہیں — شہر در شہر جو سیلاب ادھورا نکلا
معتبر فکر کا سورج تھا نویدِ روشن — آج پھر چرخ پہ مہتاب ادھورا نکلا

خشک آنکھوں سے لہو پھوٹ کے رونا اک دن ● ورنہ لے ڈوبے گا مجھ کو مرا ہونا اک دن
کیا پتہ تھا تری جلتی ہوئی سانسوں کی قطار — مری سانسوں پہ ہی ڈالے گی بچھونا اک دن
میں کبھی ذہن کے زینوں سے اُتر آؤں گا — لا کے رکھ دے مرے ہاتھوں پہ کھلونا اک دن
روز بن برسے گزر جائیں گے بادل کب تک — اپنے اشکوں سے صبا ان کو بھگونا اک دن

صدف کو گوہرِ نایاب لکھنا ● غلط ہے زندگی کو خواب لکھنا
مری ہستی سمٹ جائے تو اک دن — نہ ہونے کے مرے اسباب لکھنا
کوئی پوچھے تو طغیانی سے پہلے — امنگیں ہو گئیں غرقاب لکھنا
نئے لوگوں کی چاہت مطلبی ہے — پرانی چاہتوں کا باب لکھنا
تمہاری چاہتوں کا پاس رکھ کر — ہماری موت کے اسباب لکھنا

جلتا ماضی مرے احساس کے اندر نہ اُتار ● ایک قطرہ ہوں میں تو مجھ میں سمندر نہ اُتار
میں مہکتی ہوئی ہر رات کا قاتل ہوں مگر — میری آنکھوں میں مرے قتل کا منظر نہ اُتار
میرے اظہار کے قطرے کے گہر ہونے تک — میرے گھر مجھ سا کوئی اور پیمبر نہ اُتار

قسمتیں بے نور، جیون راسیاں خاموش تھیں ● اونگھتے چولہے تھے گھر کے، تھالیاں خاموش تھیں
چاہ کے سرسبز پتوں پر مرادوں کے حروف — ذہن لکھتا جا رہا تھا انگلیاں خاموش تھیں
میرے اندر ایک فکری آسماں کو دیکھ کر — مجھ پہ گرنے والی کتنی بجلیاں خاموش تھیں

نفرتیں سب دھل گئیں تو دل کا میلا پن گیا ● صاف آئینہ ہوا، داغوں کا گہرا پن گیا
کل تلک سپنوں کی شاخیں تھیں خزاں دیدہ کہ آج — تیرے آتے ہی ہر اک ٹہنی کا سیناپن گیا
چاہتوں کے سبز پتے ٹہنیوں سے کیا گرے — موسموں کے ساتھ تیرے گھر کا اُجلا پن گیا

کچھ لوگ اپنا نام و نسب بولنے نہ پائے ● خاموش کس لیے ہیں سبب بولنے نہ پائے
گھر جل رہا تھا، گھر کے لبوں پر دھواں سا تھا — کس کس پہ کیا ہوا تھا غضب بولنے نہ پائے
لکھوا دیے ہیں اوروں نے دیوار و در پہ نام — اک ہم ہیں اپنا نام و نسب بولنے نہ پائے

کتابیات

نمبر	کتاب / تالیف کا نام	سنِ اشاعت	مصنف / مولف کا نام
1	خمخانۂ جاوید (جلد اول، دوم، سوم)		لالہ سری رام
2	تاریخِ ادب اردو		رام بابو سکسینہ
3	قاضی بدرالدولہ	1848ء	گلزار ہدایت
4	تذکرۂ گلزار اعظم (فارسی)	1855ء	نواب غوث خاں اعظم
5	صبحِ وطن		نواب غوث خاں اعظم
6	دکن میں اردو	1344ھ	مولوی نصیرالدین ہاشمی
7	تاریخِ زبان اردو		مولوی نصیرالدین ہاشمی
8	اردوئے قدیم		ڈاکٹر سید شمس اللہ قادری
9	تاریخِ جنوبی ہند	1947ء	محمود خاں محمود بنگلوری
10	مدراس میں اردو		نصیرالدین ہاشمی
11	خانوادۂ قاضی بدرالدولہ	1963ء	مولانا محمد یوسف کوکن
12	کرناٹک میں عربی اور فارسی	1974ء	مولانا محمد یوسف کوکن
13	مولانا باقر آگاہ		مولانا محمد یوسف کوکن
14	اصل الاصول	1959ء	مولانا محمد یوسف کوکن
15	تذکرۂ اولیاء دکن		محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکہ پوری
16	شعر الہند (جلد اول، دوم)		عبدالسلام ندوی
17	محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن (جلد اول، دوم)		محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکہ پوری
18	ریاستِ میسور میں اردو کی نشو و نما	1962ء	ڈاکٹر حبیب النساء بیگم ولی اللہ
19	تذکرہ سخن وران بلند فکر (جلد اول، دوم)		محمد منور خاں گوہر مدراس
20	شعرائے نظہر نگر		سید نظہر قلندر حسرت سہروردی
21	اردو شہ پارے		ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

نمبر	کتاب / تالیف کا نام	سنِ اشاعت	مصنف / مولف کا نام
22	تاریخ زبانِ اردو (جلد اول، دوم، سوم)		ڈاکٹر جمیل جالبی
23	حیدر آباد میں اردو صحافت	1974ء	طیب انصاری
24	تذکرۂ اشاراتِ بینش	1973ء	سید مرتضیٰ بینش
25	فورٹ سینٹ جارج کالج	1979ء	ڈاکٹر افضل الدین اقبال
26	جنوبی ہند میں اردو صحافت 1857ء سے پیشتر	1981ء	ڈاکٹر افضل الدین اقبال
27	ٹمل ناڈو میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء / 1747ء سے 1960ء تک	غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم لٹ	سید نظہر قلندر حسرت سہروردی
28	مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما	1979ء	ڈاکٹر افضل الدین اقبال
29	مدراس میں اردو صحافت	غیر مطبوعہ	ڈاکٹر عابد صفی
30	مدراس میں اردو نثر کی نشو و نما	—//—	ڈاکٹر عابد صفی
31	مخزنِ اعظم		مولف خطیب محمد اعظم سفیر بلنیجپوری
32	انور نامہ		محمد حسین محوی صدیقی
33	نوبہارِ عشق		مولانا محمد یوسف کوکن
34	دیوانِ مغموم		اسمٰعیل سیٹھ مغموم
35	کلیاتِ مغموم	1930ء	اسمٰعیل سیٹھ مغموم
36	ارمغانِ کلکتہ	1337ھ	اسمٰعیل سیٹھ مغموم
37	نغمۂ آرزو	1309ھ	محمد عبدالشکور باشاہ بہادر شاکر مدراسی
38	گوہر آب دار	1323ھ	محمد منور خاں گوہر مدراسی
39	گلزارِ فہیم	1920ء	کاکا عبدالعزیز فہیم آمبوری
40	دیوانِ ضَو		عبدالقدوس ضو
41	حرزِ جاں		نواب عبدالرؤف خاں پرتو
42	دیوانِ مسکیں	1924ء	سید شاہ عبدالغفار مسکیں

نمبر	کتاب رتالیف کا نام	سنِ اشاعت	مصنف رمولف کا نام
43	گلشنِ سیرت	1950ء	مولانا ضیاء الدین امانی پلیکنڈوی
44	دیوانِ باشاہ	1891ء	خطیب قادر باشاہ وانمباڑی
45	گلزارِ باشاہ	1323ھ	خطیب قادر باشاہ وانمباڑی
46	مدح پیغمبر اللہ	1934ء	خطیب قادر باشاہ وانمباڑی
47	قصائدِ ایمان	1372ھ	مولانا تجمل حسین ایماں گوپاموی
48	مرقومِ نظمی	1386ھ	مولانا ابوبکر نظمی
49	عارفین		پروفیسر سید عباس
50	حیاتِ قلندری	1973ء	حبیب اللہ شاہ
51	انتخابِ کلام محمود	1979ء	نواب محمد محمود
52	گنجینۂ محمود	1984ء	نواب محمد محمود
53	نوائے محمود	1986ء	نواب محمد محمود
54	شبستان	1968ء	مینر رشیدی
55	رنگ برنگ	1959ء	مرکزِ ادب ، مدراس
56	گیسوئے شب	1962ء	نورس خیامی
57	برگِ نوخیز	1962ء	عزیز تمنائی
58	رگِ سنگ	1959ء	دانش فرازی
59	آیاتِ فطرت	1964ء	دانش فرازی
60	نالۂ فراّت	1967ء	دانش فرازی
61	محسنِ اعظم	1974ء	دانش فرازی
62	خدنگِ جستہ	1981ء	دانش فرازی
63	شررِ دعا تجلی	1964ء	کاوش بدری
64	مثنویِ قبلہ نما	1965ء	کاوش بدری

425

نمبر	کتاب / تالیف کا نام	سنِ اشاعت	مصنف / مولف کا نام
65.	کاویم	1977ء	کاوش بدری
66.	قطب مدراس	1983ء	کاوش بدری
67.	بوئے گل نالۂ دل	1973ء	حسرت سہروردی
68.	پتہ پتہ بوٹا بوٹا	1973ء	فرحت کیفی
69.	منظر فرات		مولانا نثار نگری
70.	رحمتِ عالم	1974ء	فرید مدراسی
71.	ریاضِ عقیدت	1984ء	عبدالعزیز عادل مدراسی
72.	منزل نما	1965ء	سہیل راشد
73.	فردوسِ خیال	1968ء	عباس علی عباس
74.	حاصلِ عمر	1976ء	حیدر علی خاں حیدر
75.	حاصلِ ایمان	1986ء	حیدر علی خاں حیدر
76.	تضیف		مولانا راہی فدائی
77.	آنسوؤں کے سجدے	1978ء	ظہیر جعفری
78.	ذکرِ حبیب	1982ء	حافظ باقوی رائچوٹی
79.	لمحوں کا کرب	1975ء	سراج زیبائی
80.	متاعِ محبوب	1982ء	محبوب پاشاہ محبوب
81.	برف سی اجلی (افسانوی مجموعہ)		علی اکبر آمبوری
82.	روشنی کے بھنور (افسانوی مجموعہ)	1967ء	علیم صبا نویدی، حسن فیاض، فضل جاوید
83.	سازِ فرنگ (تراجم کا انتخاب)		حسن الدین احمد
84.	اعجاز کمال	1988ء	کمال مدراسی
85.	تاج کمال	1989ء	کمال مدراسی
86.	اعجاز عشق		شاطر مدراسی

نمبر	جریدے کا نام	سنِ اشاعت	مدیر/مرتب	مقامِ اشاعت
1 -	جلوۂ یار (ماہنامہ)	فروری 1910ء		میرٹھ
2 -	رسائل شفق (ماہنامہ)			مدراس
3 -	مصحف (ماہنامہ)	1935ء	علامہ شاکر نائطی	عمرآباد
4 -	معیارِ ادب (ماہنامہ)	1952ء	محوی صدیقی لکھنوی	میل وشارم
5 -	الارشاد (ماہنامہ)	1952ء		میل وشارم
6 -	منزل (ماہنامہ)		کاوش بدری	مدراس
7 -	پاکیزہ (ماہنامہ)	جون، جولائی 1960ء		مدراس
8 -	ساون (ماہنامہ)	فروری 1968ء	راز امتیاز	مدراس
9 -	درمان (ماہنامہ)	1972ء	سید ضیاء اللہ	بنگلور
10 -	پیکر (ماہنامہ)	1973ء	اعظم راہی	حیدرآباد
11 -	شاہین (ماہنامہ)	مارچ 1978ء		
12 -	شب خون (ماہنامہ)	مارچ 1985	شمس الرحمان فاروقی	الہ آباد
13 -	سلسبیل (ماہنامہ)	1986ء	مولانا اشرف سعودی	بنگلور
14 -	آشیاں کے تنکے (ماہنامہ)	1981ء	محمد یعقوب	وانمباڑی
15 -	اقبال (ماہنامہ)	1948ء	کمال مدراسی	
16 -	آج کل (جامع الاخبار و قلمِ تخلیل)	جون 1937ء		مدراس
17 -	سرکار (ہفت روزہ)	1960ء		مدراس
18 -	نجمہ (ہفت روزہ)	1960ء	سید ہمایون	مدراس
19 -	فلم ریش (ہفت روزہ)		محمد یعقوب	مدراس
20 -	ہمسفر (ہفت روزہ)	1976ء	دانش فرازی	مدراس
21 -	ادبی رپورٹ (ہفت روزہ)	1980ء	راز امتیاز	مدراس
22 -	اتحاد (ہفت روزہ)	1981ء	سید نذیر احمد	مدراس

مقامِ اشاعت	مدیر / مرتب	سنِ اشاعت	جریدے کا نام	نمبر
مدراس	اے جے جلال الدین	1954ء 55,56	فانوسِ خیال (سال نامہ)	23.
ویلور	مولانا راہی فدائی	1984ء 85,86	صفیر (سال نامہ)	24.
ویلور	مولانا بشیر قریشی		اللطیف (سال نامہ)	25.
مدورے	مرتب۔ عبدالغفار شاکر فوقی	1970ء	سونیر وقف بورڈ کالج	26.
مدراس	نورس خیامی	1974ء	روپ رنگ (سونیر)	27.
عمرآباد	مرتب۔ ابوالبیان حماد	1977ء	صحیفہ (سونیر)	28.
مدراس	ڈاکٹر عبدالحق	اپریل 1941ء	رسالۂ اردو	29.
وانمباڑی	اکبر زاہد	1973ء	حنا اردو ڈائجسٹ۔	30.
مدراس	عبدالجبار، ڈاکٹر عبدالحق		سفینہ (سہ ماہی)	31.
مدراس	مرتب۔ پروفیسر سید عباس	1968ء	آئینہ ایام (سونیر)	32.
مدراس	علیم صبا نویدی، لقا رضوی	1967ء	گل نو	33.
وانمباڑی	جلال عرفان (غیر مطبوعہ)	1985ء	وانمباڑی کے چند مشاہیر ادب	34.
ویلوری	مرتب۔ مولانا ظہیر احمد راہی فدائی باقوی۔	1980ء	باقیات ایک جہاں	35.